پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی (۱۹۶۴ء تا ۲۰۰۰ء)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

صائمہ نیاز

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا او مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو ئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی (۱۹۶۴ء تا ۲۰۰۰ء)

پیش کار: صائمہ نیاز رجسٹریشن نمبر: PD/URD/AS15/ID/1

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر فوزیہ اسلم ----------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ----------

ڈین فیکلٹی آف لینگو ئجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر ----------

ریکٹر

تاریخ ----------

اقرار نامہ

میں، صائمہ نیاز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

صائمہ نیاز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
ABSTRACT	vii
اظہار تشکر	viii
باب اول: تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	
(الف) تمہید	1
i. موضوع کا تعارف	1
ii. بیان مسئلہ	1
iii. مقاصد تحقیق	2
iv. تحقیقی سوالات	2
v. نظری دائرہ کار	2
vi. تحقیقی طریقہ کار	3
vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	3
viii. تحدید	3
ix. پس منظری مطالعہ	3
x. تحقیق کی اہمیت	4
ب۔ عورت کیا ہے؟	4
ج۔ سماج سے کیا مراد ہے؟	12
1۔ سماج اور زمین	14
2۔ سماج اور مذہب	16

د۔ سماج اور عورت کا رشتہ 17
ر۔ عورت اور ادب کے مابین تعلق 25
ح۔ عورت اور اُن کے عمومی مسائل 27
حوالہ جات 42

باب دوئم: پی ٹی وی طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے بنیادی حقوق کی عکاسی

الف۔ مسئلہ غربت 47
ب۔ اظہار رائے کا مسئلہ 51
ج۔ تعلیم کا فقدان 56
د۔ مسئلہ جہیز 62
و۔ عورتوں سے امتیازی سلوک 66
ہ۔ صحت کا مسئلہ 73
حوالہ جات 81

باب سوم: پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کی گھریلو حیثیت

الف۔ پسند کی شادی 83
ب متفرق خانہ داری مسائل 92
ج۔ دوسری شادی 101
د۔ عورتوں کی کم تر حیثیت 103
و۔ خاندانی دشمنی 108
ہ۔ بیوگی اور طلاق کے بعد شادی کا مسئلہ 109
ی۔ عورت کا بانجھ پن 110
حوالہ جات 114

باب چہارم: پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کی معاشی حیثیت

الف۔ میل سنٹر پرابلم/ مرد مرکزی مسئلہ 115
ب۔ مسئلہ شکل وشباہت 123
ج۔ وراثت کا مسئلہ 124
د۔ ملازمت سے منسلک مسائل 127
و۔ جاگیر درانہ نظام کا مسئلہ 130
ہ۔ جسمانی استحصال 134
حوالہ جات 152

باب پنجم: ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ 153
ب۔ نتائج 172
ج۔ سفارشات 176
د۔ کتابیات 177

TITLE: REFLECTION OF THE SOCIAL PROBLEMS OF WOMEN IN THE LONG URDU DRAMAS OF PTV.

ABSTRACT:

The study entitled "Reflection of the social problems of women in the long Urdu dramas of PTV" aims at focusing of the serious social problems of Pakistani women. This is an evaluative critical analysis of those Pakistani long Urdu dramas which have pointed out the problems of Pakistani women. This study cover the analysis of those selected Urdu dramas of PTV only which have been on air in past. This investigation is an actual review of the given selected dreams for studying the elements of harsh attitude of families and society towards the innocent women. The procedure of this study cover live dramas, libraries, internet, published and published script etc. Although, this society cannot exist without women, yet their social status is very low and she is victim to very critical imbalance in her rights. This study reveals what reflection has been realized in the Long Urdu Dramas of PTV. The main purpose of this study is to scratch the mentioned role of women and their difficult lives. It presumes that women is often victimized in domestic violence where her rights are mostly denied in our Pakistan society. Urdu Literature has been in rising sologans for the liberty of women from the peters of injustice and cruelty. Beside victimization and violence and violence, her sexual abuses and harassment areat peak in this cruel society .This research_ based study hypothesizes that women have been not given their right place in our society and it investigates about such elements in PTV dramas. This study is equally beneficial for the awareness of women, families and societies. This study is important for writers and viewers to focus on the family and social rights of women in Pakistan. This research is an evaluative attempt to guide the masses regarding the cruelty a woman faces in Pakistan society .The organization of this study is of five chapter's research format. Chapter one consist of introduction to research and its basics, chapter two of, reflection of the social problems of women in the long Urdu dramas of PTV, chapter three of inside, home status of Women in the Long dramas of PTV, chapter four of, the Financial status of Women in the Long Urdu dramas of PTV and chapter five of, the overall Evaluation, Results and Recommendations. This research study recommends equal laws and rights of women as a safeguarded by the constitution of Pakistan.

اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کے خصوصی کرم کے طفیل راقمہ نے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی'' مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔اسکالر سب سے پہلے اُس معبود حقیقی کے حضور شکر ادا کرتی ہے جس نے معلم انسانیت کے صدقے اس دقیق عنوان پر مقالہ سپرد قلم کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مجسمہ شفقت و محبت اور قابل احترام نگران پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی قلبی طور پر ممنون ہوں کہ اگر آپ کا دست شفقت نہ ہوتا تو یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچتا۔آپ کی والہانہ حوصلہ افزائی اور رفاقت نے مقالہ کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔آپ نے انگلی پکڑ کر اس راہ میں منزل تک پہنچایا۔میرے قابل قدر اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز،ڈاکٹر رخشندہ مراد،ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نعیم مظہر،اور ڈاکٹر عابد سیّال کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ جنہوں نے میری علمی،ادبی اور اخلاقی رہنمائی کی۔آپ جیسی علمی و ادبی شخصیات میرے لیے کسی سائبان سے کم نہیں تھی۔ڈاکٹر میر عالم سید یقیناً شکریہ کے مستحق ہے جنہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھی میری اس کاوش میں قدم بہ قدم رہنمائی فرمائی۔شعبہ اردو سے تعلق رکھنے والے ''چار درویش''ڈاکٹر عبدالودود قریشی(ستارہ امتیاز)،ڈاکٹر وحید اللہ (مرحوم) ڈاکٹر مشتاق عادل،اور پھر ڈاکٹر سید بادشاہ ملک غیر کا شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے اس تحقیقی مقالے کو پورا کرنے کے تمام مراحل میں بھرپور معاونت کی۔اپنے ہم جماعتوں محمد اجمل خان، ذوالفقار حسین شاہ، عبدالشکور رافع، عفت فاطمہ اور عائشہ خان کی شکر گزار ہوں جن کے ساتھ کیے گئے علمی بحث و مباحث میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ میں اپنے شریک سفر سیّد وقار الحسن شاہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے پیار، حوصلہ افزائی اور تعاون نے مقالہ کی تکمیل میں آسانیاں پیدا کی۔ مرحومہ بہن اور دوست بخسالہ،ایک ایسی ہستی جن کے خوابوں کو عملی جامہ پہنا کر سرخروئی نصیب ہوئی۔اپنے پیارے بھائیوں عبدالصمد اور امیر حمزہ کے صبر و خلوص کو سلام پیش کرتی ہوں جن کے تعاون اور ساتھ سے میں روزانہ خیبر پختون خواہ سے پنجاب تک کا سفر بخوشی طے کر کے نمل یونیورسٹی کلاس لینے آتی۔بھائی احمد علی کا شکریہ جن کا دست شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہا۔میری ساری بہنوں، مریم، سہیلہ، سیما، رانی، صبا اور شاندانہ کا شکریہ جنہوں نے اس کام میں میری ہر طرح سے مدد کی۔انسانی شخصیت کی تعمیر میں ہمیشہ ہی سے والدین اور اساتذہ کا اہم کردار رہا ہے۔ والدین جسمانی اور اساتذہ روحانی ترقی میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ والدین کی تربیت اور دعاؤں سے پہاڑ جیسے مشکلات کو سر کیا۔ خدا ان عظیم ہستیوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

مقتدرہ قومی زبان اردو کے امتیاز صاحب اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سینئر آفیسر ڈاکٹر صفدر رشید کا شکریہ ادا نہ کرنا کم ظرفی ہو گی۔ جنہوں نے اسلام آباد سے مجھے نایاب کتابیں بھیجی۔ نمل میں تعینات ایڈمن آفیسر امجد علی, شعبہ اردو سے منسلک تمام ملازمین اور کلرک صاحبان کے لیے دعا گو ہوں کہ انھوں نے ہر آن اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ اللہ یزال سب کو شاد و آباد رکھے۔

صائمہ نیاز

پی ایچ۔ڈی سکالر

نمل، اسلام آباد

باب اوّل:

تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

(الف) تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف:

یہ حقیقت ہے کہ عورت کے بغیر زندگی اور انسانیت کی بقا ممکن نہیں۔ اگرچہ زبانی لحاظ سے ہر کوئی عورت کے بارے میں اچھے الفاظ اور خیالات کا مظاہرہ کرتا ہے مگر عملی طور پر عورت کی عزت اور حیثیت کے لیے کوئی ٹھوس اور تعمیری اقدامات نہیں اٹھاتا۔ زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ عورتوں پر ہر جگہ ظلم کیا جارہا ہے اور عورتوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ چونکہ پاکستان ٹیلی وژن ایک فعال قومی ادارہ ہے۔ اس لیے طالبہ نے تحقیق کے لیے ڈراموں کے حوالے سے عورتوں کے سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے، ان میں عورتوں کے بارے میں ان تمام بنیادی اور ضمنی اسباب و محرکات کو جانچا جائے گا جن کی وجہ سے عورتوں کا استحصال جاری ہے۔ اور اُن تمام چھوٹے بڑے سماجی مسائل پر تحقیق مطلوب ہے کہ جن سے عورتوں کی حیثیت دگرگو اور اُلٹ پلٹ ظاہر کیا جارہا ہے۔ آیا اُن سماجی مسائل کا کوئی علاج ہے؟ یہ مسائل کیوں ہیں؟ ان کی وجہ سے عورتوں کا مقام کیا ہے؟ اُن کے اثرات کس طرح عورت کی زندگی اور معاشرتی حیات کو پامال کررہی ہیں؟ آخر ان کا ذمہ دار کون ہے؟ یہاں پر روایت، رواج اور دوسری چیزوں اور بنیادی باتوں کا تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

ادب اور فن ہماری معاشرتی روایات اور ثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ادبی متون کا سماجی مطالعہ ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈراما ادب کی ایک قدیم صنف ہے۔ ابتدائی عہد سے آج تک یہ صنف اپنے عہد کی ترجمانی کرتی آرہی ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی حقیقتوں کی آئینہ داری کا یہ وصف ٹیلی وژن ڈرامے کی مقبولیت کی صورت میں اور نمایاں ہوا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اسکالر نے ادب کی ایک شاخ یعنی ڈراما کا انتخاب کیا ہے اور ڈرامے کے ذریعے پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کا مطالعہ کرنے کی کوشش مقصود ہے۔

ڈراموں میں مختلف علاقوں، طبقات اور مذاہب سے تعلق رکھنے والی پاکستانی خواتین کا جائزہ زیر نظر ہے کہ ان کو کس قسم کی سماجی مسائل کا سامنا در پیش ہے۔ انفرادی اور اجتماعی اعمال، اقدامات، حاصلات، نتائج اور سفارشات پر ان کے

اثرات کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے نیز یہ بھی دیکھنا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن میں عورتوں کے ان سماجی مسائل کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ سے کس طرح سے معاشرے میں تبدیل لائی جاسکتی ہے۔ ساتھ اُن مسائل پر قابو پانے کے لیے مختلف تجاویز ظاہر ہوں تاکہ اُن کا قلع قمع کرنا ممکن ہو جائے۔ عورت کو ان کی آزادی نصیب ہو اور وہ معاشرے میں عزت واحترام کی زندگی گزارے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

زیر نظر تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر ہیں۔

۱۔ پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی نوعیت کا جائزہ لینا۔

۲۔ پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں پیش کیے جانے والے عورتوں کے سماجی مسائل کو کہانی کے تناظر میں سمجھنا اور تنقیدی جائزہ لینا۔

۳۔ پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے مسائل کی پیشکش کا تنقیدی جائزہ لینا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ سماجی مسائل سے کیا مراد ہے۔ عورتوں کے سماجی مسائل کی مختلف صورتیں کون کون سی ہیں، نیز فکشن میں ان کا اظہار کس انداز سے ہوا ہے؟

۲۔ پی ٹی وی طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے کن سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے؟

۳۔ پی ٹی وی طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائلکو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

یہ سچ ہے کہ عورت کے بغیر صحیح زندگی، مثبت سکون، اعلیٰ مقام، تعمیر آدمیت اور مساوات انسانیت ممکن نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی عورت معاشرتی نظام اور مرکزی مقام پر ہوتے ہوئے بھی روز ابتری کی شکار ہے۔ چونکہ عورت کی حیثیت آج ملفوظات و کاغذات تک محدود ہے اور ان کے مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی نہیں ہے اس لیے بحیثیت ایک اسکالر یہ سوچا گیا کہ پاکستان ٹیلی وژن وہ بنیادی عوامی زریعہ موجود ہے کہ جن کے حوالے سے کافی ڈرامائی مواد موجود ہیں جن میں عورتوں کے سماجی مسائل اور مشکلات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نظری دائرہ کار کے حوالے سے آغاز سے لے کر تا حال ڈراما اور فن ڈراما نگاری سے متعلق مواد کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ چونکہ عورتوں کے سماجی مسائل کا موضوع بہت وسیع ہے اور ان کا رشتہ فرد تا معاشرہ مختلف صورتوں اور حوالوں سے ہے اس

لیے تمام نظریاتی، مسلکی، سیاسی، مذہبی، سماجی، انفرادی اور اجتماعی وجوہات کا پتہ لگانا بھی انتہائی ضروری ہے جن کے ہونے سے پاکستان ٹیلی وژن کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کو پیش کرنے کا آغاز ہوا۔ مختلف ادوار میں متفرق صورتوں میں یہ سماجی مسائل ظاہر ہوئے اور آج فلاں فلاں تبدیلیوں کے تحت ان صورتوں میں موجود ہیں، ساتھ ان سماجی مسائل کے پیش کرنے سے مختلف لوگوں اور گروہوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور آئندہ ان سماجی مسائل کا ٹی وی ڈراموں میں پیش کرنا، کن معنوں و نتائج کے حوالے سے سود مند ثابت ہوگا۔ ان سب کا جائزہ لینا بہت اہم ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی کے ضمن میں زیادہ تر انٹرنیٹ مواد، ویب سائٹس اور سی ڈیز کو زیر مطالعہ رکھا گیا ہے۔ ساتھ ان تمام کتب کا مشاہدہ بھی کیا ہے جن میں متعلقہ مواد موجود ہیں۔ مواد کی فراہمی، موضوع پر تحقیق کی تکمیل اور نتائج کو بر وقت حاصل کرنے کے لیے مختلف مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، اس لیے مصلحت اور ضرورت کے تحت مختلف طریق ہائے تحقیق کو اختیار کیا گیا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اردو میں ڈراما گاری کی کئی جہات پر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ بہت سے ناقدین اور محققین نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی کے مطالعہ پر تادم تحریر پی ایچ ڈی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا ہے، البتہ کتب، رسالے، مقالے اور مضامین ضرور موجود ہیں جن میں اس موضوع سے متعلق متفرق مواد پایا جاتا ہے، مجوزہ موضوع پر تحقیقی کام میں آسانی لانے کے لیے ڈراما اور فن ڈراما نگاری اور عورتوں کے سماجی مسائل کے متعلق تخلیقات و تحقیقات کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔

viii۔ تحدید:

مجوزہ موضوع کے تحت پاکستان ٹیلی وژن (1964ء تا 2000ء) کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کا مطالعہ مقصود ہے۔ ان مخصوص ڈراموں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جن میں خاص کر عورتوں کے سماجی مسائل سے متعلق مواد موجود ہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

کسی بھی تنقیدی اور تخلیقی کام کے لیے پس منظری مطالعے کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے ان تمام عام و خاص کتب و مضامین کا مطالعہ کیا گیا ہے جن میں متعلقہ مواد موجود تھا۔ ساتھ ان رسالوں اور

جریدوں کو بھی دیکھا گیا ہے جن کے سہارے تحقیقی کام آسان ہو۔ مختلف جائزاتی مطالعہ، متفرق تخلیقی خاکے اور مقالے بھی اس سلسلے میں کار آمد ثابت ہوئے۔ایم فل اور پی ایچ ڈی مقالوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے نیز ان تمام اسکالرز اور ٹیچرز سے بھی رابطہ کیا گیا ہے جو اس موضوع پر دسترس رکھتے ہیں۔ پس منظری مطالعے کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف مباحثوں، سیمینارز، ویب سائٹس، انٹرنیٹ مواد، لُغات، اور انسائیکلوں پیڈیا سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

X۔ تحقیق کی اہمیت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کائنات میں جہاں اور چیزوں اور کرداروں کی اپنی ایک حیثیت ہے، وہاں اعلیٰ اور آفاقی حیثیت عورت کو حاصل ہے۔ اگر معاشرے میں عورت کا ہونا ممکن نہ ہو تو وہاں حیوانیت کا غلغلہ بلند ہو گا اور انسانیت نام کی رہ جائے گی۔ اب اگر یہ عورت ذاتی، انفرادی، گھریلو اور سماجی طور پر فعال اور مستحکم ہو گی تو چار سو کوئی حیوانیت اور مکروہیت نہیں ہو گی بلکہ ہر طرف امن، سکون، آزادی اور خاص کر انسانیت کی حکمرانی ہو گی۔ مگر بد قسمتی سے عورت اس قدر مسائل میں گرفتار ہے کہ اُن کی وجہ سے یہی عورت وہ کردار ادا نہیں کر سکتی جن کی بدولت عورت خود بھی خوشی سے سرشار رہے اور ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی احسن طریقے سے نبھائیں، سو پیش کردہ موضوع پر تحقیق کی بہت ضرورت ہے تاکہ اُن تمام سماجی مسائل کا اندازہ لگایا جا سکے جن کی وجہ سے عورت کی زندگی روز بروز ختم ہو رہی ہے۔ ان مسائل کا کھوج لگانا، اور حل ڈھونڈنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت کو اُن کا جائز حق دستیاب ہو گا اور چار سو میں موجود عورت کو احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور جس قدر عورت کے ساتھ ظلم کا رویہ اور انا کا طرز عمل روا رکھا جاتا ہے یہی عورت ان سے نجات حاصل کر سکے گی اور تمام معاشرے میں عورت سے متعلق سماجی مسائل نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ب۔ عورت کیا ہے؟

اہل علم کے تصورات، عالموں کی وضاحت، اہل نظر کی مہارت اور شاعروں کے دیوان عورت کی وضاحت کرتے ہیں کہ عورت کیا ہے۔

انسانی زندگی میں عورت تضادات کا شکار رہی ہے۔ عورت دنیا کا سب سے اہم اور قدیم اختلافی موضوع رہا ہے۔ عورت اور مرد کی زندگی میں ایک اہم تضاد عورت کی حیثیت اور اس کے حقوق کے تعین کا ہے۔

مرد اور عورت کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھایا گیا اور دونوں آدمؑ و حوّا بی بی کی اولاد ہے۔ دونوں نے ایک ہی رحم مادر میں معینہ مدت میں پرورش پائی۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی انداز سے ہوئی اور دونوں کی پرورش میں فطرت نے یکسوئی بھری مگر تاریخ انسانیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں نے انسانی حیثیت میں عورت کے حقوق کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔

مردوں نے ایک طرف عورت کو کم زور، بزدل، جلد باز، حقیر و زلیل، نجس و ناپاک، شیطان صفت اور مصیبت کی جڑ کہا تو دوسری طرف عورت کے وجود کو تصویر کائنات کے سارے رنگوں سے پیوستہ کیا۔

غلام اکبر ملک لکھتے ہیں۔

> ''بساط زیست سے اگر عورت کا وجود اٹھالیا جائے تو رنگ و بو سے یہ حسین دنیا معمورہ خاک بن کر رہ جائے گی۔''(۱)

انسانی زندگی کی بقا اور تسلسل عورت کے وجود سے ہے۔ بنی آدم کی افزائش اور حوّا کی پیدائش دنیا کی رنگینی و حسینی کا باعث بنی۔ شاعروں نے ہمیشہ عورت کی خوبصورتی و نزاکت کے قصیدے لکھے اس کو پانے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کو قربان کر دیا۔ مصوروں کی تخلیقات اور نت نئے ایجادات عورت کے وجود کی مرہون منت ہے ادریس آزاد لکھتے ہیں۔

> ''اس کی کنکھتی ہوئی آواز بڑے بڑے سورماؤں کو اپنے سحر میں جکڑ کر سر کٹانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اور اس کی زلفیں دھر کے معماروں کے مقدر پر سیاہ رات کی طرح چھا جاتی ہیں۔''(۲)

تاریخ انسانی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل آشکارہ ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ مردوں نے جرائم کو جنم دیا۔ عورت کا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہے۔ نیز یہ کردار بھی مردوں کی ترغیب، اور جبر و اشتعال کے باعث ممکن ہوا۔

ایم عبدالرحمٰن خان لکھتے ہیں:

> ''عورت مرد کی طرح بداعمال و بدکردار نہیں ہوتی، قتل و غارت، زناء و اغوا، ظلم و ستم، غصب و سلب، شر و فساد، دجل و فریب، عدوان و مصیبت، چوری و رشوتا اور کفر و نفاق غرضیکہ ہر نوع کے گناہ میں مرد کا عورت سے زیادہ حصہ ہے۔''(۳)

پروفیسر وارث میر لکھتے ہیں۔

''عورت کے بغیر مرد ادھورا، معاشرہ نا مکمل اور کائنات بے رنگ و بو و بے نور
ہے۔ عورت فضائے عالم کی وہ دلکش قوس قزح ہے جس کے ایک ایک رنگسے زندگی کے
سوسو، سوتے پھوٹتے ہیں، جس کی سانس کا اگر کائنات کے سینے میں چلتی ہیں۔''(۴)

مرد نے ہمیشہ اپنے زور بازو سے دنیا میں ظلم و جبر قائم کیا۔ جہاں کمزور و نادار انسانوں کو دیکھا وہاں وہاں خون کی ندیاں بہادی۔ فصلات کو اُجاڑ کر زمین میں بھوک وافلاس کی فصلیں اُگائی مگر یہی مرد جب کسی حسین دوشیزہ کے زلفوں کا دیوانہ ہوا تو اپنے آپ تک کو قربان کر دیا۔ مولانا سید جلاالدین انصر عمری کے مطابق:

''اگر مرد کو جبر و ظلم کی قوت حاصل ہے تو عورت کے پاس حسن و دلربائی کا افیون
ہے۔ جس سے وہ سنگ دل وار بے رحم انسانوں کو موم بنا سکتی ہے۔''(۵)

مردوں کو جبا اپنی خامیوں، کوتاہیوں کا احساس ہونے لگا تو اس نے اپنی ساری توانائیاں عورت کو نیچا دکھانے میں صرف کرنا شروع کر دیں۔ مرد نے عورت کو ہمیشہ اپنا دشمن و حریف جانا۔ چنانچہ قسم قسم کے سوالات اُٹھانے شروع کیے کہ کیا مرد و عورت جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہے؟

کیا عورت جسمانی تقاضوں میں فطری مجبوریوں کے باعث مردوں سے برابری کا دعٰوی کرنے میں حق بجانب ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات مردوں نے حریفانہ نقطہ نظر سے ڈھونڈنے کی کوشش کی اور عورت کو ہمیشہ کم تر ثابت کرنے کی سعی کی۔ مرد کی نگاہ میں عورت کا مقام انسان سے زیادہ ایک کھلونے کی تھی۔ عورت کی نسوانیت ہی مرد کے پیش نظر تھی۔ علم الابدان کے ماہرین نے عورت کو ناقص العقل اور جذباتی قرار دیا۔ حالانکہ وہ ان کی یکسانیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی اس بات سے منکر تھے کہ مرد و عورت آپس میں برابر ہیں۔ مختلف اعضاء جسم جیسے دل، کھوپڑی، ہڈیاں اور قد وغیرہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی چونکہ چھوٹی اور ہلکی ہوتی ہے اس لیے انہوں نے اس بات کو ایشو بنا کر عورتوں کو مردوں سے کم تر جانا۔

''عورت کے خون کی مقدار مرد سے کم ہوتی ہے اور اس کیترکیب میں نمکین اجزاءاور
اسی طرح ہیمو گلوبن کم ہوتا ہے۔اسکے علاوہ سرخ خون کے اجزاء عورت میں زیادہ
ہوتے ہیں۔اور مرد میں سفید خون کے اجزاء کی کثرت ہوتی ہے۔''(۶)

ایک جیسی شکل و صورت اور ترکیب و ترتیب کے حاصل مرد و عورت اپنے افعال و بناوٹ میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف قرار دیے گئے ہیں۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اگر تذکیر و تانیث کے حوالے سے ان کو یعنی لڑکا لڑکی

کو سن بلوغت سے پہلے ایک جیسا لباس پہنا یا جائے تو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ فرق اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب لڑکی سن بلوغت میں داخل ہوتی ہے۔ پروفیسر وارث میر لکھتے ہیں۔

''کیا عورت کے کانوں کی ساخت مرد کے کانوں سے مختلف ہے؟ کیا عورت کی آنکھوں کا مصرف مرد کی آنکھوں سے مختلف ہے۔ اگر قدرت کا کوئی ایسا منشا ہوتا کہ عورت اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کا صرف محدود استعمال کر سکتی ہے تو قدرت عورت کی ان صلاحیتوں کو خود ہی کوئی مختلف ساخت دے دیتی۔''(۷)

عورت مخالف عناصر نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں عورت کی حیثیت کو گھٹا کر پیش کریں۔ عورت نے ہمیشہ مشکل حالات کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ چاہے آفات ارضی و سماوی ہو یا زمانے کی سختیاں، ہر حال میں عورت نے سختی سے مقابلہ کیا۔ حمل اور وضع حمل عورت کی زندگی میں ایک اہم اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور عورت تقریباً سال تک مختلف اضطراب اور پریشانیوں میں مبتلا رہتی ہے۔ مولانا مودودی لکھتے ہے۔

''اُس زمانے میں عورت کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتی جو حمل کے ماسوا دوسرے ایاّم میں سنبھال سکتی ہیں۔ جو حالات اس زمانے ہیں عورت پہ گزرتے ہیں وہ اگر مرد پر گزرے یا غیر زمانہ حمل ہیں خود عورت پر گزریں تو قطعی بیما ری کا حکم لگا دیا جائے۔ اسزمانے میں مہینے میں اس کا نظام عصبی مختل رہتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے تمام عناصر روحی ایکسلسل بد نظمی کی حالت میں ہوتے ہیں۔''(۸)

نظریات مرد مرکز (Androcentric) عورتوں کی کم تر حیثیت کی وجہ و بنیاد حیاتیات و فطرت کو تصور کرتے ہیں۔ عورت کی کم تر حیثیت زمانہ قدیم ہی سے چلی آرہی ہے۔ فریدہ وحدی آفندی لکھتی ہے۔

''دنیا کی قدیم تاریخ کی ورق گری کرو تم کو زمانہ معلومہ کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں ملے گا جس میں عورت مرد کی سطح مطیع و منقانہ رہی ہو۔ دنیا میں ہمیشہ مرد کی حکمرانی رہی ہے اور کبھی عورت نے مرد پر غلبہ نہیں پایا۔''(۹)

عورت شہری ریاستوں کے قائم ہونے سے قبل آزاد و خود مختار انسان کی حیثیت رکھتی تھی۔ عورت کو جب زندگی میں موقع ملا اس نے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ جان سٹورٹ مل کے مطابق۔

''تاریخ میں بادشاہوں کے مقابلے میں فرماں رواں خواتین کیتعداد کم ہے۔ لیکن اس کم
تعداد میں بھی انھوں نے حکومتکر کے اپنی قابلیت واضح کر دی، ہر چند کہ ان کو مشکل
وقت میں تخت پر بیٹھناپڑا۔''(۱۰)

مصر کی ملکہ ''حطشی پسط'' نے اپنے سوتیلے بھائی سے شادی کی دونوں نے مل کر تقریبا''انیس سال اقتدار سنبھالا نااہل شوہر کی حیثیت ایک نمائشی اور کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔احکامات ملکہ مصر کے ہوتے، شکایات و مقدمات وہ سماعت کرتی ہر قسم کے فیصلے وہ خود نافذ کرتی۔ سلطنت کے تمام اُمور وہ خود سرانجام دیتی۔ غرض عورت کی صلاحیتوں اور جسمانی قویٰ میں بمقابلہ مرد اللہ تعالیٰ نے کوئی کمی نہیں رکھی۔ مگر مردوں نے ہمیشہ عورت کو اپنے ظلم و جبر اور تعصب کا نشانہ بنایا مردوں نے خود عورتوں کے حقوق و فرائض کے دائرے بڑے تعصبانہ انداز فکر سے متعین کر دیئے۔ ساجد علی لکھتے ہے۔

''عورتوں اور مردوں کے جداگانہ دائرہ کار کا تصور فطرت کے کسی قانون پر مبنی نہیں بلکہ
معاشرتی رسم و رواج اور عادات کا نتیجہ ہے۔''(۱۱)

مرد اور عورت ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے اگر ان میں کوئی بھی اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ فطرت منشا کے خلاف ہے کہ مرد کو ہی اہم، برتر و عقل کل سمجھا جائے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہے۔

''مرد اپنی الجھنوں کو عورت کی اعانت کے بغیر سلجھا نہیں سکتا کیوں کہ روپے کے چاہے
دو رُخ ہو، روپیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ یہ جب بھی Deraluate ہوتا ہے تو اس کے
دونوں رُخ ایک وقت میں بے حیثیت ہو جاتے ہیں۔''(۱۲)

اگر ہم عورت کو صرف اکتساب لذت کا زریعہ، مرد کے جذبہ شہوانیت کی تسکین اور بچے پیدا کرنے والی ایک مشین سمجھ لے تو معاشرے میں ہر سُو بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ عورت قوموں کی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ان کے وجود و حیثیت سے انکار بے جا اور نامناسب و غیر منصفانہ ہو گا۔ مولانا محمد شفیع لکھتے ہے۔

''دنیا میں دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عمود کا درجہ رکھتی
ہیں۔ایک عورت دوسرید ولت، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ دیکھا جائے تو یہی دونوں
چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہے۔اور غور
کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی
تعمیر و ترقی اور اس کیرونق کا ذریعہ ہیں۔ لیکن جب کہیں ان کو اصلی مقام اور موقف سے

ادھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی چیزیں دنیامیں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔''(۱۳)

عورت پر اگر علم کے دروازے اور ترقی کے راستے بند کر دے تو معاشرے پر جمود طاری ہو جائے گا۔ رسول حمزہ لکھتے ہیں۔

''لڑکی کا نام ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں ستاروں جیسیچمک اور پھولوں جیسی مہک ہو لیکن مرد کے نام ہیں تلوار کی جھنکار یا کتابوں کے علم ودانش کا اظہار ہوتا ہے۔''(۱۴)

گویا عورت کی حیثیت بناوٹ، سجاوٹ اور لگاوٹ کے سوا مردوں کے نزدیک اور کچھ نہیں۔اس کا وجود صرف اور صرف مردوں کا دل بہلانے اور خوش کرنے کے لیے ہے جب کہ مرد ہی علم ودانش کا صحیح حقدار ہے۔ مرد کی ذہنیت کو ساجد علی نے کچھ یوں بیان کیا ہیں۔

''ان (مردوں) کے نزدیکعورت کی تخلیق کا واحد مقصد مرد کی جنسی خواہشات کی تسکین کرنا ہے۔ چناں چہ عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے آپ کو بنانے سنوارنے پر مرکوز رکھے تاکہ مرد کے لیے زیادہسے زیاد ہجاذب نظر ہو،اسے لبھا اور رجھا سکے ۔مرد کے لیے ضروریہے کہ وہ عورت کے لیے آرائش و زیبائش کا سامان فراہم کرے جنسی لذت پر بھی مرد کا ہی حق تسلیم کیا گیا ہے۔اس کے لیے مرد آزاد ہے کہ وہ جتنی عورتوں سے چاہے تمتع کر سکتا ہے۔ایک زوجگی کو خلاف فطرت کہا گیا،یعنی مرد ایسا جانور ہے جو ہر چراگاں میں چرنے کے لیے آزاد ہے۔''(۱۵)

مرد نے عورت کو ہمیشہ کم سے کم تر جانا اُسے حقیر و نجس مخلوق قرار دیا،اُسے محض عیاشی کا سامان سمجھا اولاد پیدا کرنے والی مشین اور گھر کے کام کاج کے لیے ایک خدمت گار کی حیثیت سے زیادہ درجہ نہ دینے پر اکتفا کیا۔۔ عورتوں کو نیچا دکھانے میں صرف عام مردوں نے اپنا کردار ادا نہیں کیا بلکہ تاریخ کے اعلیٰ عاقل اور دانش مند لوگوں نے اس پر اپنی توانائیاں صرف کیں۔افلاطون جس کا نام ایک بہت بڑے فلسفی کے طور پر جانا جاتا ہے اس طرح لکھتا ہیں۔

''انسان شروع میں دو جنسی تھا۔۔۔یعنی مذکر اور مونثایک ہی جسم میں اکھٹے تھے۔اس کی چار ٹانگیں ،دو چہرے اور چار بازو تھے ۔اس نے اپنے خالق ''زیوس'' کے خلاف بغاو تکر دی ۔سزا کے طور پر انہیں آدھا آدھا کر دیا گیا جن میں ہر ایک کے پاس دو ٹانگیں ایک چہرہ اور دو بازو آگئے۔ان میں سے ایکمرد اور ایک عورت تھی۔تب سے یہ دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں تاکہ اپنی تکمیل کر سکے۔''(۱۶)

یہ سچ ہے کہ عورت و مرد ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش رکھتے ہیں لیکن اس سارے بیان سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ اس وحشی انسان میں عورت ہی کم زور و حقیر ہے۔اور مضبوط اور توانا جسم مرد کے حصہ میں آیا۔

ارسطو جیسے عظیم فلسفی بھی عورت کو تعصبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کے مطابق عورت جسمانی اور حیاتیاتی بلکہ ہر لحاظ سے مرد سے کم تر ہے۔مردوں کے حکم کی بجاآوری عورت کے فرض اولین میں شامل ہے۔ارسطو نے مرد و عورت کو حاکم و محکوم کا درجہ دیا ہیں۔عورت کم تر اور مرد بر تر حیثیت رکھتا ہے۔ارسطو نے فطرتاً عورت کو حاسد، جھگڑالو، شرم و حیا سے اور عزت نفس سے عاری کہا۔عورت کو دروغ گو، دھوکے باز، اور خود غرض کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حیاتیاتی سطح پر بھی عورت کا جسم ناقص قرار دیا۔ارسطو کا خیال تھا کہ بچوں کے پیدائش میں بھی عورت کا بہت کم حصہ ہوتا ہے۔ان نظریات نے ارسطو کے بعد آنے والے عورت کے بارے میں منفی سوچ کو پروان چڑھایا ''ترتولیان''جو مسیحیت کے ابتدائی دور کا امام ہے عورت کے بارے میں کہتا ہے۔

''عورت شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔۔۔۔۔وہ مرد کو غارت کرنے والی ہے۔''

رومی شاعر ورجل کے بقول۔

''عورت ہمیشہ ناپائیدار ہوتی ہے۔''

رومی مصنف ''جیوونل'' کے خیال میں۔

''عورت سے بڑھ کر کوئی بھی کینہ پرور نہیں''

سکاٹس مذہبی اصلاح پسند ''جان ماکس'' کے الفاظ میں۔

''عورت کی حکمرانی فطرت کو سخت ناپسند ہے یہ خدا کے لیے توہین آمیز ہے حتیٰ کہ کامل مساوات کے نظام خیر سے انحراف۔''

ویلیم شکسپیئر کا کہنا ہے۔

''اے کمزوری تیرا نام عورت ہے۔''

''سیموئیل ہٹلر'' کے خاص الفاظ۔

''عورتوں کی روحیں اس قدر چھوٹی ہیں کہ بعض لوگ یقین رکھتے ہیں کہ عورتوں میں روح ہی نہیں ہوتی۔''

''ویلیم کنگریو'' کے الفاظ۔

''جہنم میں عورت کیحقارت جیسا غصہ نہیں۔''

''الیگزینڈر پوپ'' کے مطابق۔

''عورت کسی کردار کا حامل نہیں ہوتی۔۔۔۔کچھ مرد کاروبار کے لیے اور کچھ تفریح کے
لیے ہوتے ہیں لیکن عورت محض جنسیت کے لیے ہوتی ہے۔''

''سیموئیل جانسن'' کی زبان میں۔

''ایک عورت کی اصلاح کسی کتے کا اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلنے کے برابر ہے۔''

برطانوی ناول نویس ''ویلیم میکس پیسنس تھیکرے'' کا کہنا ہے کہ،

''کچھ اپنی کمینگیاں ہیں جو مرد کے لیے بھی انتہائی پست اور گھٹیا ہیں لیکن ایک دل
فریب عورت تنہا ان کے ارتکاب کا حوصلہ رکھتی ہیں۔''

ایک برطانوی ناول نویس ''جارج میری ڈیتھ'' کے الفاظ ہیں کہ،

''مجھے توقع ہے کہ عورت وہ آخری شے ہوگی جسے مرد مہذب بنائے گا۔''

مشہور جرمن فلسفی ''فریڈرک'' کے نقول،

''عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں دیویاں یا پائیدان''(۱۷)

انسان کی خوشبو کی متلاشی، عظیم مفکرین بھی عورت کو انسان سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ان مفکرین اور زمانے کے نبض شناس مصنفین نے عورت کو مرد کی نگاہ سے دیکھا۔اپنی سوچ اور طرز فکر سے عورت کو انسانیت کے درجے سے نیچے گرادیا۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں۔

''مرد کے تعصبات اور اس کے ساختہ قانون نے عورت کو ایک معاشرے میں پسماندہ
شہری کی حیثیت دی ہے۔ کہیں وہ جائیداد کی شکل میں غلام تھی، کہیں معاشرے میں
گلدان کیطرح نمائشی چیز تھی، کچھ نے انہیں جنسی لذت کا سمبل بنا رکھا تھا۔''(۱۸)

عورت کے بارے میں مرد مرکز مفروضے ،مردوں کے جارحانہ ، حریفانہ اور ظالمانہ رویے کی غمازی کرتے ہیں۔''عورت اور فطرت'' کے عنوان سے سوزن گریفن نے مفروضے کے عنوان سے ایک مضمون لکھا،اس مضمون میں اُس نے عورتوں کے بارے میں بنائے گئے مفروضوں کو پیش کیا ہے۔اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے بارے میں اس قسم کے تعصبانہ رویّے قائم رکھنے سے ان کی حالت کیوں کر بہتر ہوسکتی تھی۔ کشور ناہید لکھتی ہیں۔

''عورت کا نام ہی ایسا ہے جس سے جّرم کی بُو آتی ہے۔ عورت، شیطان کی چیلی کے طور
پر کام کرتی ہے۔اور مرد کو پھانسنے کے لیے جسم کا دانہ ڈالتی ہے۔ عورت زیادہ نفسانی
خواہشات رکھتی ہے اس لیے عورت کا وجود عیاشی کے لیے ہے۔گناہ کا جنم عورت کے
جسم میں ہوتا ہے، گناہ اس میں بسیرا کرتا ہے ،عورت کو اپنے اوپر قدرت نہیں

ہوتی۔اس لیے ہزاروں میں کوئی ایک عورت ایسی ہوتی ہے جو عظمت وعفت کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو۔عورت نہیں بلکہ مرد خدا کا خلیفہ ہے۔آدم روح ہے جبکہ حّوا گوشت پوست۔عورت کی عقل ناقص ہے۔اس کے دماغ کی بناوٹ کمزور ہے۔ چوں کہ ہر مہینے ماہواری سے گزرتی ہے۔اس لیے اس کے دماغ کو جانے والی خون کی روانی کم ہو جاتی ہے۔جو عورت غور وفکر کرتی ہے وہ اپنے تخلیق کرنے والے اعضاء سے دماغ کی طرف خون کی روانی منتقل کر کے اس مقدس ازلی توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔جو اسے کائنات کے عمیق ترین قوانین سے باندھے رکھتا ہے۔عورت کے ارتقاء میں اس کا پاؤں چھوٹا رہ جانا اس بات کینشانی ہے کہ اس کا ارتقاء بعد میں ہوا، کیوں کہ چھوٹا پاؤں ''شریف جانور کے شایان شان'' نہیں ہوتا۔اگر عورت کو مرد کے قابو میں نہ رکھنا ہوتا تو اسے کمزور نہ بنایا ہوتا۔''(۱۹)

انسانی ضرورتوں کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع تر ہوتا گیا۔زیر کاشت زمین میں اضافے کے لیے کافی حد تک کوششیں کی گئیں۔جسمانی طور پر چونکہ مرد زیادہ طاقت ور تھا اس لیے حالات کی تبدیلی میں اس کے کردار کو اہمیت دی جانے لگی۔ حتیٰ کہ مردوں نے بچوں کی پیدائش میں اپنے کردار کو اہم قرار دے دیا۔بقائے نسل میں تخم ریزی کے سوا مرد کا کوئی کردار نہیں۔شروع سے بچہ بننے کا سارا عمل عورت کی ذات تک محدود ہے۔عورت کے کردار کو اس کے باوجود بھی مرد نے اس سلسلے میں غیر اہم قرار دے کر اس کا درجہ گھٹانا شروع کر دیا اور اس طرح رفتہ رفتہ پدر سری نظام تبدیل ہونے لگا۔سلسلہ نسب جو ماں سے شروع ہوتا تھا آہستہ آہستہ باپ کی طرف پلٹ گیا۔

ج۔ سماج سے کیا مراد ہے؟

سماج یا معاشرہ کے لفظی معنی آپس میں مل جل کر زندگانی کرنا،اوقات بسر کرنا اور کسی کے ہمراہ عیش کرنا ہے۔لفظی مفہوم میں یہ لفظ جتنا سادہ ہے اتنا ہی اصلاحی معنوں میں پیچیدہ اور مشکل ہے۔یہ اس وقت کی بات ہے جب اصطلاحات کی پیچیدگیوں میں انسان نہیں پڑا تھا۔آج معاشریات ایک وسیع علم ہی نہیں بلکہ جتنے بھی عمرانی علوم ہے اُن سب کا سرچشمہ ہے۔

دوسری سماجی علوم کی طرح معاشرہ کی بھی کوئی ایسی تعریف مشکل ہے جس پر تمام ماہرین عمرانیات کا اتفاق ہو۔وسیع تر مفہوم میں معاشرہ یا سماج انسانوں کے بنائے ہوئے ایک ایسے گروہ پر محیط ہے جو کافی حد تک اچھی اور منظم زندگی گزارتے ہوں۔معاشرے کا متبادل لفظ ''سوسائٹی'' ایسوسی ایشن(Association)۔اپنے محدود مفہوم میں یہ

لفظ بعض مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے کسی تنظیم کے لیے شعوری طور پر استعمال ہوتا ہے۔ وسیع مفہوم میں اس کے پیش نظر زندگی کیلا تعداد ضرورتوں کا پورا کرنا ہے۔

ارسطو کا یہ جملہ کہ :

''انسان مدنی اطبع ہے۔ کسی حد تک مدنی اطبع تو سب حیوان ہیں بلکہ بعض مثلاً چیونٹی اور شہد کی مکھّی وغیرہ تو انسان سے بھی زیاد ہمنظم انداز میں اپنی مجلسی جبلت کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر حیوانات کی یہ جبلت ''جامد'' ہے جب کہ انسانکی یہ جبلت ارتقاء پذیر ہے۔''(۲۰)

زندگی کی جو صورت آج ہمیں نظر آتی ہے وہ معاشرتی عمل کے مسلسل نتیجہ ارتقاء ہے۔ معاشرت پسندی صرف انسان کی مجلسی جبلت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ جبلت صرف اس کا داخلی سبب ہے۔ اس کے اسباب خارجی بھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں کمزور ہے۔ بنیادی طور پر قدرتی دفاع سے محروم ہے۔ انسان کی فطری خواہشوں میں جہاں معاشرت پسندی شامل ہے وہی یہ معاشرت پسندی اس کی ذاتی بھی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام انسانوں کے فطری تقاضے اور مجبوریاں ایک جیسی ہے تو پھر ساری دنیا کے انسان ایک معاشرتی وحدت میں جڑے ہوئے کیوں نہیں؟ اس کے اسباب میں معاشرے کے تشکیلی عناصر شامل ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور تقسیم معاشرہ کا باعث بنتے ہیں۔ ماہرین عمرانیات کی رائے معاشرے کے تشکیلی عناصر کے بارے میں مختلف ہے۔ مگر ماہرین عمرانیات کی اکثریت بلحاظ تعداد دو عناصر پر متفق ہے

(1) علاقہ

(2) نسل

ذیل کی تعریف اس ضمن میں اہم ہیں۔

''Any number of people associated together geographically, Racially or otherwise with collective interests.''(۲۱)

مندرجہ بالا تعریف میں معاشرے یا سماج کی بنیاد زمین اور نسل کو قرار دیا گیا ہے اس ضمن میں دوسرے تکنیکی عناصر کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

"A relatively independent or self-sufficient population characterized by inter nal organization territoriality cultural distinctiveness and sexual recruitments."(۲۲)

ان دونوں تعریفوں کی رو سے زمین اور ثقافت معاشرے کے تشکیلی عناصر کا کردار ادا کرتے ہیں۔مارکس کے نزدیک:

''معاشرہ کی حقیقی بنیاد اور اس کا حقیقی سرچشمہ افراد کے درمیان معاشی رشتوں میں پوشیدہ ہے۔''(۲۳)

زمین، نسل اور ثقافت کے ساتھ ساتھ معاشی رشتوں کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ برصغیر میں باقی عناصر مثلاً جغرافیہ، خاندان، نسل، ہم جنسی کا احساس، خوف، پیشہ ورانہ رشتہ، زبان، سیاست و قانون کے علاوہ عناصر زمین اور مذہب نے اہم کردار ادا کیا۔

1۔ سماج اور زمین:

زمین انسانی ظاہری و باطنی دونوں عوامل پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔انسان مزاج کی تشکیل میں زمین کی جغرافیائی ہیت، ساخت اس کے پہاڑ، میدان اور موسم سب اہمیت کے حامل ہیں۔ معاشرے کا مزاج انہی افراد کے مشترکہ مزاج سے بنتا ہے۔انسان کی رنگت، قد و قامت، جسامت اور صحت خارجی سطح پر زمین اور آب و ہوا سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ان ہی وجوہات کی بنا پر جب کوئی مورخ یا ماہر عمرانیات کسی قوم، ملک یا معاشرے پر قلم اٹھاتا ہے تو پہلے اس سماج کی جغرافیائی ہیت کی تفصیل ضرور لکھتا ہے۔یورپ کے مقابلے میں ہندوستان کی زمین کی جغرافیائی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ جب ہم ہندوستان کی زمینی ہیت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے ایک طرف ناقابل عبور پہاڑ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف وسیع رقبے پر پھیلا ہوا سمندر جو اسے تین اطراف سے گھیرے ہوئے ہے، نظر آتا ہے۔یہ فطری تقسیم اسے باقی دنیا کے ممالک سے علیحدہ کر دیتی ہے۔زمین کی اہمیت کسی معاشرے کی تشکیل میں اپنا اہم کردار ادا کرتا ہے، مندرجہ ذیل تین نقطہ ہائے کا جائزہ لیتے ہیں۔

(1)۔ جدید مفکرین یورپ کا نقطہ نظر

(2)۔ ہندومت کا نقطہ نظر

(3)۔ نقطہ نظر اسلام

مفکرین مغرب کسی بھی معاشرے کی تشکیلی عناصر میں زمین کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔مارکس اور اس مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے دوسرے دانش ور بھی مفادات معاش کے ساتھ ساتھ زمین کی قدر و اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے۔ مغربی مفکرین جن کا تعلق خاص طور سے ہندومت سے ہے، کے ہاں زمین کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ مغربی مفکرین کی آراء میں کسی قسم کی جذباتیت کو دخل نہیں بلکہ یہ انسانیت اور عمرانیت کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔ ''دھرم'' کا لفظ ہندومت میں مذہب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا مفہوم مذہب یا عقیدے سے زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

''ہندومت کے نزدیک کائنات بھی ایک دھرم ہے۔''(۲۴)

وہ تمام مظاہر قدرت جو اسے پر اسرار نظر آتے ہیں جو اس کے دل و دماغ کو خوفزدہ کرتے ہیں۔ہندومت اسے خُدا کا درجہ دیتا ہے وہ سورج، آگ، سانپ، سمندر وغیرہ کو اپنا دیوتا مانتا ہے اور زمین کو ''خُدا'' (دیوی) کے ساتھ ''ماں'' کا درجہ دیتا ہے۔اس لیے بھی زیادہ مقدس ہے کہ اس کے دامن میں اسے عافیت نصیب ہوتی ہے۔وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ پیار و محبت کرتا ہے۔اور اُسے ''ماتا'' پکارتا ہے کیونکہ ماں کی گود ہی سب سے زیادہ مقدس و محبت کی جگہ ہے اس لیے وہ زمین کے لیے ''ماتا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔جواہر لال نہرو لکھتے ہیں۔

''جب میں کسی جلسے میں پہنچتا ہوں تو میرا استقبال اس نعرے سے کیا جاتا ''بھارت ماتا کی جے ہو'' میں اچانک ان سے پوچھ بیٹھتا کہ اس نعرے کے کیا معنی ہیں؟ یہ بھارت ماتا کون ہے؟ جس کی وہ فتح چاہتے ہیں۔میرے سوال پر انہیں ہنسی بھی آتی اور تعجب بھی ہوتا۔ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا اور ایک دوسرے کی طرف اور میری طرف دیکھ کر رہ جاتے میں اپنے سوال پر اصرار کرتا۔آخر کوئی مضبوط جاٹ جو پرانے وقتوں سے زمین سے وابستہ ہے جواب دیتا ہے کہ اس کا مطلب دھرتی سے ہے۔''(۲۵)

ہندومت میں سمندر پار جانا گناہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ ''دھرتی ماں'' کی آخری حد سمندر ہے۔اس سے آگے جانا اپنی ماتا کو چھوڑ جانے کے مترادف ہے۔ہندو دھرم میں زمین کو زیادہ اہمیت دینے کی ایک وجہ مذہب بھی ہے۔مذہب سے تعصب کی بنا پر مغربی مفکرین زمین کو اہم حیثیت کا حامل سمجھتے ہیں۔مطلب ایک ہی چیز سے نفرت و محبت کا ردعمل ایک ہی ہے۔ حقیقی طور پر یہ دونوں تصور انتہا پسندانہ ہیں۔زمین کی اہمیت جاننے کے لیے اسلامی معاشرے میں اسلام کے تصور کائنات پر نظر ڈالنا ضروری ہے کیوں کہ کائنات کا ایک مظہر زمین ہے قرآن پاک میں ہے۔

''وخلق کل شی فقدرہ، تقدیرا'' (الفرقان۔2)

''ان فے خلق السموات والارض واختلاف الیل والنھار لایت لاولل الالباب۔
(آل عمران۔210)۔''(۲۶)

اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ سارا عام ہست وبود جو انسان کے گردونواح میں پھیلا ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے یہ کوئی اتفاقی ہنگامہ یا صور تحال نہیں۔ یہ ایک ایسا نظامِ ہستی ہے جس سے تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تمام کارفرماں قوتیں اس کے تابع وفرمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کائنات میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ انسان کے علم کو فرشتوں کی تسبیح وتقدیس پر فوقیت دی۔ بحکم خُدا فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا۔

''الم تران اللہ یسجد لھ من فی السموات ومن فی الارض''(الحج۔21)

''الم تروان اللہ سخر لکم مافی السموات ومافی الارض''(لقمان20)۔(۲۷)

ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان کے نزدیک کائنات کے کسی مظہر (زمین سمیت) کوئی بنیادی حیثیت نہیں۔ انسان کو جس مقصد کے لیے اس کائنات میں بھیجا گیا وہ زمین پر خلافت ہے۔ اس پر اب یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو پوری دنیا میں پھیل جانے کا حکم دیا ہو اس کی نظر میں زمین کے کسی ٹکڑے کی کوئی علیحدہ و مستقل اہمیت نہیں ہو سکتی۔ مذہب کی بنیاد پر اس کا تعلق دوسرے انسانوں سے ہے نہ کہ زمین کی بنا پر۔ زمین کے ساتھ تعلق سے اسلام منکر بھی نہیں مگر اس سے وابستہ تقدس اور پرستش کا قائل بھی نہیں۔ جس گوشہ زمین پر اسلام نازل ہوا وہ سماج جہالت اور برائیوں کا عملی نمونہ تھا۔ اس سماج میں اسلام جیسے مذہب نے عقائد، عبادات اور معاملات میں انقلاب برپا کر دیا۔ رسولِ خُدا کو دین اسلام کے پھیلانے میں طرحطرح کے ظلم وستم سہنے پڑے۔ مگر اس عظیم ہستی حضرت محمد (ﷺ) نے ہر چیز کو اپنی اُمت کی خاطر برداشت کیا۔

2۔ سماج اور مذہب:

مذہب کی اہمیت سے انکار مغربی دانشوروں نے ایک خاص پسِ منظر میں کیا۔ یہ وہ دور ہے جب ریاست اور معاشرے کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اپنے مخصوص تعصبات کی بنا پر ان دانشوروں نے یہ راستہ اپنانے کی کوشش کی۔ ربانیت اور سماج دونوں میں اگر ہم کہے کہ کوئی تعلق نہیں تو یہ آنکھیں چرانے والی بات ہو گی۔ یہ بات برحق ہے کہ مذہب سماج کی ایک زبردست قوت ہے۔ اس قوت کا اظہار تاریخ کے صفحات میں کئی بار کیا گیا۔ ماضی میں مذہب کے نام پر کئی جنگیں ہوئیں۔ جغرافیائی طور پر آج بھی دنیا مذہب کے نام پر منقسم ہے۔ جواہر لال نہرو کہتے ہیں۔

''مذہب انسانی فطرت کی ایک شدید ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ساری دنیا میں لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کا کام کسی نہ کسی مذہبی عقیدے کے بغیر نہیں چل سکتا۔''(۲۸)

یورپ اور ایشیا مسیحیت کے غلبے سے قبل مختلف علاقائی اور سیاسی وفاداریوں میں تقسیم تھے۔عیسائیت کا غلبہ ہوا تو باقی ماندہ عناصر پسِ منظر میں چلے گئے۔رشید ملک لکھتے ہے۔

''فرد کی سیاسی وفاداریاں مذہبی وفاداریوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔یوں مسیحی دنیا میں ہولی رومن ایمپائر قائم ہو چکی تھی جس نے اس وقت کی معلوم دنیا کو ایکبرادری میں تبدیل کر دیا تھا۔اور جس کے اتحاد کی علامت کلیسا کے اسقف اعظم کی ذات تھی۔اس برادری کی پہچان مذہب سے تھی اور اس میں سیاسی وفاداریوں کا تعین، قوم، نسل یا علاقے کی بجائے مذہب سے ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چنانچہ مشرق بعید کو چھوڑ کر اذمنہ وسطیٰ میں دو تہذیبیں یعنی مسیحی اور اسلام تسلیم کی جاتی تھی۔''(۲۹)

مذہب ہی معاشرے کی سب سے اہم اور بڑی قوت ہے۔اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے کی ارتقاءپذیر نوعیت کے باعث کسی بھی سماج کی تشکیلی عناصر میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

بقول اقبال:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہے ہم وطن کے سارا جہاں ہمارا

دنیا کا سب سے بڑا دوسرا مذہب ہندومت ہے۔جو دین اسلام کی طرح ایک مکمل ضابطہ حیات نہیں لیکن اس کی جامعیت تمام افراد کی زندگی کے ہر عمل میں دخل اندازی کرتا ہے انتشار بھی ہندومت کی ایک خصوصیت ہے۔ہندومت اسلام کے منظم مذہب کے مقابلے میں ایک بکھرا ہوا مذہب ہے۔اس کے پیشوا معاشرے کی ہر ضرورت کو مذہب میں داخل کر دیتے ہیں۔مذہب کے سارے اختیارات ان ہی پیشواؤں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔وہ جب چاہے اپنی مفاد کی خاطر اس میں ردوبدل کر دیتے ہیں۔

د۔ سماج اور عورت کا رشتہ:

عورت کا سماجی صورتحال کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک محکوم حیثیت سے عورت اپنی زندگی بسر کر رہی ہے۔اس معاشرے میں مرد ہی عورت کی زندگی پر بچپن سے بڑھاپے تک کے تمام

فیصلوں پر حاوی ہوتا ہے۔ صحت کی سہولتوں کا انتخاب، تعلیم، نوکری، شادی حتیٰ کہ زندگی کے تمام شعبوں میں آخری فیصلہ مرد کا ہی ہوتا ہے۔ پاکستانی عورت کی زندگی میں مرد ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ مردوں کے اس بنائے گئے معاشرے میں لڑکیوں سے بچپن ہی سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ان کو لڑکوں سے کم کھانا اور دیگر سہولتیں دیجاتی ہیں۔ زیادہ تر لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں اسکول نہیں بھیجا جاتا۔ ان کو چھوٹی عمر ہی سے گھرداری سکھانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں آبادی کے بڑے حصے کے خراب معاشی حالات کے باعث لڑکیوں سے ناپسندیدگی عام ہے۔ بچپن ہی سے لڑکیوں کو ایک بوجھ ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ عورت چونکہ والدین اور خاندان کا سہارا نہیں بن سکتی اس لیے عورت کی ثانوی حیثیت متعین کر دی جاتی ہے۔

آبادی میں شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی عورتیں ایک بڑے کنبے کی ذمہ داری اُٹھاتی ہیں۔ اوسطاً سات یا آٹھ بچے ایک شادی شدہ عورت پیدا کرتی ہے۔ اپنے شوہر یا سسرال کی مخالفت کے ڈر سے زیادہ تر دیہاتی عورتیں فیملی پلاننگ کے طریقوں سے گریز کرتی ہیں۔ بچوں کی دیکھ بال، جانوروں کی نگہداشت، گھر کی صفائی، دھلائی، کھانا پکانا اور دیگر کام عورتوں کیذمہداری ہوتی ہے۔ عورتوں کے ان کاموں کے علاوہ دیہی معاشرے میں عورتیں کھیتوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام بھی کرتی ہیں۔ ان سب کے باوجود عورت کو کوئی مستحکم سماجی حیثیت حاصل نہیں۔ اس معاشرے میں عورت صحت و تعلیم کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ سرکاری کوششوں سے پرائمری تعلیم عام تو کر دی گئی ہے اور لوگ بچیوں کو پرائمری اسکولوں میں داخل بھی کروا دیتے ہیں مگر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موسم میں لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجا جاتا۔ بلکہ ان سے کھیتوں میں کام کروایا جاتا ہے۔ دور دراز سے آنے والی اُستانیاں کبھی کبھار ہی اسکول آتی ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر تعلیمی تسلسل قائم نہیں رہتا۔

صدیوں پرانے پرانے کلچر سے پاکستانی عورت آج بھی پیوستہ ہے۔ عورت کی تعلیم اور آزادی کو اس کلچر میں ناپسند کیا جاتا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں خواتین ہر شعبے میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ مگر جن علاقوں میں زیادہ آبادی رہائش پذیر ہے، وہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو چونکہ کمانا نہیں ہوتا اس لیے انھیں ایسے مضامینکی تعلیم دیجاتیہے جو گھریلو کامکاج اور امورِ خانہداریسے متعلقھوں۔ انہیں زیادہتعلیمدینے کیضرور تبھیمحسوسنہیں کرتے۔ معاشی جبر کے ساتھ عورت سماجی ناانصافیوں کا بھی شکار رہے۔ کیونکہ یورپ میں صدیوں عورتوں کی محکومیت قائم رہی۔ مذہبی طور پر شادی کو مسیحیت میں مقدس مان کر صرف ایک بیوی رکھنے کی پابندی عائد کی گئی۔ اس وجہ سے عورتوں کی سماجی حیثیت میں بہتری آئی لیکن یہی عیسائی مذہب کا پرچار کرنے والے عورتوں کے سراسر خلاف بھی تھے۔ عورتوں کا وراثت میں قانوناً کوئی حصّہ نہیں تھا۔ عدالت میں جانا ان کے لیے کسی گناہ سے کم نہ تھا۔ خاوند کے تشدد کے خلاف قانونی تحفظ

کہیں بھی حاصل نہ تھا۔اعلیٰ خاندان کی عورتوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں آزادی سے مشاغل اپنائے۔ مجلسی آداب کو انھوں نے خاص وخوب نکھارا۔نسوانی تزئین وآرائش،لباس،زیور،خوشبو سبھی کچھ ان کی دسترس میں تھیں۔یورپ میں آج بھی وہی مجلسی آداب وطور طریقے رائج ہیں۔جو اس زمانے میں تھے۔یہ طریقے انھوں نے جلسے جلوس نکال کر نہیں بلکہ اپنی ذہانت اور نفاست کے ایماء پر حاصل کیے۔اس اخلاقی پستی کے دور میں دھوکہ،جواء،رشوت اور دوسری برائیاں روزبہ روز بڑھتی گئی مگر کوئی فرق نہ آیا۔افتخار شیر وانی لکھتے ہیں۔

> ''سولہویں صدی عیسوی تمام دنیامیں غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا زمانہ تھا۔انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ اوّل اور شیکسپیئر اور ہندوستان میں اکبر اعظم،ترکی میں سلیمان اعظم بادشاہوں ،سیاستدانوں ،ادیبوں کی ایک مرغوب کرنے والی فہرست سامنے آتی ہے لیکن تضاد دیکھیے کہانگلستانمیںملکہایلزبتھ کی ہوش مندی اور صلاحیت کا ہر شخص قائل تھا لیکن عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت تک نہ تھی۔آکسفورڈ اور کیمبرج میں نئے کالجقائمہوئے۔ملکہایلزبتھآکسفورڈاور کیمبرج گئیں اور استادوں اور طلبہ سے خطاب کیا،لیکن کوئی کالج یاسکول لڑکیوں کے لیے قائم نہ ہوا۔'' (۳۰)

یہ وہ دور تھاجب سائنسی مزاج اور معقولیت کا غلبہ تھا مگر اس میں بھی عورت کی محکومیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔یہ وہزمانہ تھاجب شوخ وچنچل،خوش باش اور خوش لباس عورتوں سے ملکہ ایلزبتھ کادربار ہر وقت بھرا ہوا ہوتا تھا۔یہ تمام عورتیں جو دربار میں رہتی تھی بڑے لوگوں،امراء اور روساء کی بیٹیاں تھیں۔ان درباری عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں اپنے خاوند کی خدمت اور امورِ خانہ داری میں مصروف تھیں۔اس زمانے میں فرانس جو تہذیب وتمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا،میں بھی عام عورت کی حیثیت انگلستان کی عورت جیسی ہی تھی۔ سپین میں اس وقت بادشاہت عروج پر تھی۔گھر کی چار دیواری میں شریف عورتیں بند رہتیں۔مرد کے ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھانا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ڈولی میں سوار ہو کر یہ عورتیں باہر جاتیں۔ان ممالک کے مقابلے میں ہالینڈ کی حالت اس وقت کچھ مختلف تھی۔ تعلیم کا معیار بلند،موسیقی اور پھولوں سے عشق،صاف ستھرا ماحول اور تحریر وتقریر کی کھلی آزادی تھی۔

افتخار شیر وانی کہتے ہے۔

> ''مشہور فلسفی ڈیسکارٹس (Descartes)کا بیان تھاکہ دنیا کا کوئیدوسرا ملک آزادی اور محفوظ شہری ماحولؐ جرائم کی کمی اور آداب کی شائستگی میں ہالینڈ کا مقابلہ

نہیں کر سکتا۔ اس ماحول میں عورتیں آزاد تھیں، تعلیم میں مصروف تھیں اور ہنر
مند بیویاں اور مائیں تھیں۔''(۳۱)

اسی زمانے میں مشرقی ہندوستان میں عورتیں گھروں میں قید رکھی جاتی۔ عورت کی خوشی کا زیادہتر انحصار ان کے باپ یا خاوند کی عنایت پر تھا۔ مذہبی رواداری کے معاملے میں ترک اور مغل یورپ کے مقابلے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھتے تھے۔ اس دور میں عام عورت کی نسبت خاص عورت کو ہر قسم کی بنیادی سہولتیں اور مراعات حاصل تھیں۔ ہند میں انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کے مقابلے میں شہزادیوں اور بیگمات کا مرتبہ بلند و بالا تھا۔ خاندانی وجاہت کے تقاضوں کے مطابق لڑکیوں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جاتا۔ عورت کی عزت و احترام میں بادشاہِ وقت تک شامل تھے۔ تاریخ ایسے حالات وواقعات سے بھری پڑی ہے جب خانہ جنگی یا خانگی اختلافات کی مصالحت اور سیاسی مشکلات میں بادشاہوں نے عورتوں سے صلاح و مشورہ کیا۔ مغلیہ دور میں عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ قرآن پاک کی تعلیم سے ہی شروع ہوتا کیونکہ زیادہتر عورتوں کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ شہزادیوں کو فنون سپہ گری، تیراندازی اور نیزہ بازی میں ماہر بنایا جاتا تھا۔

سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں ہندوستان کے برعکس عورتوں کے حقوق سے روگردانی کی گئی۔ اس معاشرے کا یہ اصول تھا کہ معاشرے میں جتنا بڑا مقام ہوگا۔ آداب و اطوار میں نفاست اور اخلاقی بے راہ روی عام ہوگی۔ اٹھارویں صدی میں یورپ میں تہذیب چمک رہی تھی لیکن اخلاقی پستی میں لوگ مبتلا تھے۔ رشوت، بدعنوانی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے تھے۔ 1789ء میں انقلاب فرانس آیا تو آزادی اور مساوات کے نعرے ہر جگہ بلند ہونے لگے اور یہ امید بھی تھی کہ عورتوں کے لیے بھی مساوات کے اصول مرتب کیے جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ حالانکہ عورتوں نے بھی اس انقلاب میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

''اس بڑے ہجوم میں جو فرانس کے بادشاہ اور ملکہ کو ان کے محل سے نکال کر
پیرس(Paris) لایا تھا۔ اکثریت عورتوں کی تھی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی نہ مل
سکا۔ انقلاب کے بعد جب مجلس(Convention) کے جلسے شروع ہوئے تو ایک
شریف رکن نے تجویز پیش کی کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیے۔ اس پر ایک
ستم ظریف رکن نے جواب دیا اس ملک میں کوئی ایک بیوی ایسی ہے۔ جس میں یہ کہنے
کی ہمت ہو کہ اس کی وہ خواہش نہیں جو اس کے خاوند کی ہے۔''(۳۲)

سول وار کے خاتمے پر یورپ میں 1861ء میں عورتوں کے حقوق کے لیے بے شمار فلاحی تنظیمیں بنائی گئی۔ ان تنظیموں نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ اس زمانے میں برصغیر میں انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ آزاد منسواں کے

خیالات بھی ہندوستان میں آئے۔ عیسائی مشنریوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم، طب اور ادب کے شعبوں میں قابل قدر کام شروع کیا۔

افتخار شیروانی عورت کی محکومیت میں لکھتے ہیں کہ۔

''ہندوستان کے معاشرے میں اس وقت زبردست تبدیلی آئی کہ جب انگریز آہستہ آہستہ ملک پر قابض ہوتے چلے گئے۔ انگریزی اقتدار قائم کرنے کے بعد جب یورپی تعلیم کے زیر اثر نوجوان طبقہ ابھرنا شروع ہوا تو انہوں نے ان وجوہات کو جاننے کی کوشش کی جن کی وجہ سے اہلِ مغرب نے ہندوستان میں برتری حاصل کی۔ چنانچہ جہاں اس کی وجوہات ڈھونڈی گئیں وہی ہر ہندو تعلیم یافتہ طبقہ نے اس حقیقت کو پایا کہ ہندو سماج کی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب عورت کا گرا ہوا سماجی مرتبہ ہے۔ کیونکہ جب تک مرد اور عورت کے درمیان مساوی اور برابری کے تعلقات نہیں ہوں گے، اس وقت تک معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا۔''(۳۳)

ہندو مت میں عورت مرد کا سایہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہندو سماج میں لڑکی کی انتہائی بچپن کی شادی، لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دینا، ستی کا رواج، بیوہ کی دوسری شادی نہ ہونا جیسے مسائل کا شکار تھی۔ یہ تمام برائیاں ہندوؤں کے زیر اثر مسلمانوں نے بھی اپنائی تھیں۔ مذہب اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق دیے گئے ہیں مگر مرد مرکزی نظام کے تحت عورت محکوم تھی۔ عملی طور پر ہندو اور مسلمان عورتیں کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ ان داتا، مجازی خدا اور مالک ان کے لیے مرد ہی تھا۔ اس اخلاقی پستی کے خلاف برہمن سماج، رام کشن کا مشن اور اس جیسی دوسری تحریکیں وجود میں آئیں۔ مذہبی ٹھیکیداروں نے ان کی بہت مخالفت کی مگر ان تحریکوں نے ہندو سماج پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ ان تمام ہندوستانی اداروں، اقدار اور روایات کی حوصلہ شکنی کی گئی جو عورتوں کی وجود کی نفی کر رہے تھے۔

مسلمان معاشرے پر قیام پاکستان سے پہلے نظر ڈالیں تو اس وقت حقوق نسواں کے لیے کوئی تنظیم یا ادارہ نہیں بنایا گیا اور نہ ہی ان کے لیے کوئی جد وجہد کی گئی۔ سر سید احمد خان جو طبقہ اشراف میں جدید تعلیم کے کوشاں تھے، بھی عورتوں کی تعلیم کے حق میں نہ تھے ۔ سر سید احمد خان عورتوں کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے۔

''جب تک مرد لائق نہ ہو، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے۔ میری رائے میں عورتوں کی تعلیم کا ذریعہ مرد ہی

ہوں گے۔ اگر مردوں کی تعلیم نہ ہو تو نہ استانیاں ہوں گی نہ کوئی سامان عورتوں کی تعلیم
کا ہوگا۔ جب مرد لائق ہو جائیں گے تو سب ذریعہ پیدا کر لیں گے۔''(۳۴)

سر سید کے نظریات میں مرد اور عورت کی تعلیم کے متعلق جو اختلاف تھا، نئی نسل ان نظریات اور کوششوں کے طفیل جب جدید تعلیم سے روشناس ہوئی، تو نتیجہ میں وہ مغربی افکار سے زیادہ متاثر ہوئی۔ ان کے سامنے انگریزی رسومات کا معاشرہ تھا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی انقلاب اور تبدیلیوں کی صدی تھی۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی شعور میں بہت سی تبدیلیاں اس صدی میں آئیں۔ انگریزی ادب اور افکار و خیالات کا آنا، نئے اور پرانے خیالات کا ٹکراؤ، مشرقی اور مغربی علوم کا حصول، قومی آزادی کی لہر، ایسی بہت سی باتیں جو ہندوستانی معاشرے میں تبدیلی لے کر آیا۔ ہندوستان کے تمام لوگ چاہے وہ ہندو تھے یا مسلمان ان باتوں کو بڑی خوشی سے اپنا رہے تھے۔ سر سید احمد خان کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی عورتوں کی جدید تعلیم کے خلاف تھے۔ اکبر آلہ آبادی کہتے ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کی عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

ان ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ علماء نے بھی عورتوں کی آزادی کی ہر طرح سے مخالفت کی۔

''آدم اور حوّا کی تخلیق کے بارے میں یہودی اور عیسائی عقائد ہمارے مذہبی لٹریچر کے تحت الشعور میں آج تک کارفرما ہیں مولانا اشرف علی تھانوی کا دور (1868ء۔ 1948ء) برصغیر میں پرانی قدروں اور نئے شعور کے تصادم کا دور تھا۔ مولانا کی مشہور کتاب (بہشتی زیور) فرسودہ روایاتکے سہارے عورت کو دبا کر رکھنے کی آخری علمی کوشش تھی۔''(۳۵)

پوری تاریخ انسانی تمدن کی اس بات پر گواہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجب، ننگ و عار، عورت کا وجود دنیا پر ذلت اور باعث شرم و گناہ تھا۔ اس ذلت کے باعث لڑکیوں کا پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا رواج تھا۔ علماء اور مذہب کے پیشوا کے علاوہ جہلا میں بھی یہ مسلہ زیر بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں۔

معاشی جبر کے ساتھ عورت بے شمار سماجی ناانصافیوں کا بھی شکار رہی ہے وٹہ سٹہ، ولور، ونی، سوارا، قرآن پاک سے نکاح، غیرت کے نام پر قتل، پولیس تحویل میں خواتین کا جسمانی استحصال، دشمنی میں خواتین کی بے حرمتی، خواتین

پر تیزاب پھینکنے اور خواتین کو ہراساں کرنے کے ایسے بہت سے واقعات عام سی بات ہے۔ سماجی رسوم کے دباؤ کے زیر اثر ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت متاثر ہے۔ ان سب مسائل اور سماجی رسوم کے دباؤ کے ساتھ عورت گھریلو تشدد بھی برداشت کرتی ہے۔ یہ جسمانی وذہنی تشدد عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویّوں کا حصہ بن چکا ہے۔ گھریلو تشدد کی وضاحت ڈاکٹر زاہد محمود ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''گھریلو تشدد اس طرز عمل کو کہتے ہیں ،جو مسلسل کسیشخص کے خلاف اس لیے روا رکھا جائے کہ اس کی حرکات و سکنا تاور قوت ارادی کو قابو میں لایا جاسکے۔ جسمانی ذہنی اور جنسی تشدد انہی طرز کی مثالیں ہیں۔ گھریلو تشدد کے حربوں میں چیخنا ، چلانا، گالیاں دینا، دھکے دینا، گھلا گھونٹنا، ٹھوکریں مارنا، کاٹنا، کسی ہتھیار سے مارنا، ڈرانا، دھمکانااور ہراساں کرنا، جان لینے کی دھمکی دینا، کسی کے احساسات اور جذبات کو مجروح کرنا، کسی کے ماں باپ یا بزرگوں کی بے عزتی کرنا، کسی کو نیچا دکھانا، کسی کو سر عام بے عزت کرنا کسی کو دوسروں کے سامنے زلیل کرنا، جنسی تشدد ، جبر واکراہ، زور زبردستی سے کام لینا، جنسی حملہ اور زنا بالجبر کاارتکاب شامل ہیں۔''(۳۶)

مندرجہ بالا دیئے گئے صورتوں میں عورتوں کی اکثریت کسی نہ کسی تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ زیادہتر شادی شدہ خواتین سسرال کی طرف سے ہر قسم کی زیادتیوں اور تشدد کا شکار بنتی ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ہونے والے تشدد کو گھریلو مسئلہ سمجھ کر نظرانداز کیا جاتاہے۔ اس صورت حال کو پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز(PIMS) کی رپورٹ اس طرح سے پیش کرتی ہے کہ :

> ''نوے فیصد سے زیادہ شادی شدہ خواتین کی شکایت ہوتی ہے کہ اگران کے شوہران کے پکے ہوئے کھانوں یاصفائی سے مطمئن نہ ہوں، اگر عورتیں بچہ پیدا کرنے میں ناکام ہو جائیں یاناپسندیدہ صنف کا بچہ یعنی لڑکی پیدا کریں توان کو لاتیں ماری جاتی ہیں۔ پٹائی کیجاتی ہے یاان کی جنسی بے حرمتی کی جاتی ہے۔''(۳۷)

عورتوں میں خواندگی کی شرح 1951ء سے بڑھ رہی ہے مگر عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں خواندگی کی شرح زیادہ ہے۔ گویامردوں اور عورتوں میں جنسی امتیاز یہاں بھی کارفرماں ہے۔ دیہاتی عورتوں میں چھ فیصد جبکہ شہری عورتوں میں ایک تہائی عورتیں خواندہ ہیں۔ دیہات کی عورت کھیتوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے۔ جبکہ شہری عورتیں شہروں میں ہر شعبے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں محنت مزدوری

بھی کرتی ہیں۔ مگر ان کو اپنی انتھک محنت کے باوجود کام کا اجر نہیں ملتا۔ عورت کے انسانی حقوق کی نفی آج بھی بے شمار رسوم ورواج کر رہے ہیں۔ معاشرے میں مردانہ حاکمیت پوشیدہ و ظاہر دونوں طریقوں سے موجود ہے جو عورت کے استحصال کا باعث ہیں۔

جو قانونی حقوق موجودہ سماجی ڈھانچے میں عورت کے لیے موجود ہیں۔ان کا حصول بھی ان کے لیے ناممکن ہے۔ شادی کے انتخاب میں عورت کی کوئی مرضی شامل نہیں کی جاتی۔ عورت کی پسند کی شادی کو معاشرے میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ نکاح نامے کی شقیں عورت اور مرد کے خاندان کے افراد شادی کے موقع پر طے کرتے ہیں۔ نکاح کے وقت عورتیں ملنے والے حقوق سے بھی لاعلم ہوتی ہیں۔ نکاح نامے میں عورت کو طلاق کا حق حاصل کرنے، ماہانہ خرچ طے کرنے اور مرد کی دوسری شادی کی صورت میں یونین کونسل سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی شق موجود ہے۔ شقوں کو نکاح نامہ پُر کرتے ہوئے اکثر کاٹ دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات عورت کو طلاق کے حصول کے لیے برسوں عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں کیونکہ عورت کے طلاق کے حق کی اہم ترین شق کو نکاح نامہ پُر کرتے ہوئے کاٹ دیا جاتا ہے۔ جہیز کی رسم بھی چند قبیح رسوم میں شامل ہیں۔اس گندی رسم نے عورت کو خاندان کے لیے ایک معاشی بوجھ بنادیا ہے۔ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی والدین کو اس کے جہیز کی فکر ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ جہیز سے ہی لڑکی کی قدر و قیمت طے ہوتی ہے۔ جو لڑکی سسرال میں جتنا قیمتی جہیز لے کر جاتی ہے۔اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہزاروں لڑکیوں کی شادیاں جہیز کی عدم دستیابی کی صورت میں نہیں طے پاتی۔ سسرال کے لعن طعن کا زیادہ تر نشانہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ زیادہ جہیز لے کر نہیں آتیں۔ان کو ذہنی اذیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔انتہائی نوعیت کے واقعات میں لڑکی کو جان سے مار دیا جاتا ہے۔ عورت کو ہر حالت میں گزارہ کرنے پر شدید دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ شوہر سے طلاق لینے کے باوجود بھی وہ معاشرے میں اذیتوں سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ ظالم سماج ایک لڑکی اور شادی شدہ عورت دونوں صورتوں میں مسائل برپا کرتی ہے۔

عورتوں کا مختلف واقعات میں آگ لگنے سے ہلاک ہونا، چولہوں کا پھٹنا، خودکشیاں (جو دراصل قتل ہوتی ہیں) اسی سسرالی تشدد کی کڑیاں ہیں۔ عورت کے لیے نان ونفقہ کی فراہمی شوہر کا فرض اولین ہے۔اسلام میں مرد پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے جو کہ یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ایک سے زائد شادیاں کرنا مرد ہر فرض پر اولیت دیتا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اسی وجہ سے خراب ہو جاتی ہے۔اسی حوالے سے رشیدہ پٹیل لکھتی ہیں کہ:

> ''اسلام کی بنیادی اور اصل تعلیمات پر لوک روایات یا پنیبرادریکے رواجوں کی تہہ چڑھا دی گئی ہے۔ مثلاً بیشتر مسلم ممالک میں زوجین کے مابین موجود باہمی حقوق کا

وہتوازن جو اسلام نے قائم کیا ہے عورت کے نقصان میں مرد کیطرف ڈھلکادیا گیا ہے۔مرد اکثر بیویوں کو ان کے حقوق کیذمہ داریوں بلکہ احکامِ قرآنی اور اس سلسلے میں اخلاقی تعلیمات تک کو نظرانداز کرتے ہوئے طلاقیں دیتے رہتے ہیں۔''(۳۸)

مرد مرکزی نظام میں عورت کے لیے ہر معاملے میں حدود و قیود مقرر ہوتی ہیں جبکہ مردوں کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ معاشی بد حالی، زبردستی اور مشترکہ خاندانی نظام بھی عورت کے بیشتر مسائل کی وجہ ہے۔عورت کی حیثیت مرد کے ہمسفر نہیں بلکہ خاندانکی خادمہ کی ہوتی ہے۔خاندان کے افراد کی خدمت،ان کو خوش رکھنااور خاندان میں اضافہ کرنابیوی کے اہم فرائض میں شامل ہیں۔گھر میں موجود اپاہج، بیمار، بڑے، بوڑھے سب افراد کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی عورتوں کا فرض ہے۔ان انتہائی اہم خدمات کو سرانجام دینے کے باوجود بھی عورت کو ناکارہ تصور کیاجاتاہے اور ان کے کاموں کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیاجاتا۔

عورت کی سماجی صورت حال کی عکاسی ساجد علی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ہمارے اپنے معاشرے میں عورت بے پناہ زیادتیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہے۔نہ اس کے دینی حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں نہ دنیوی۔جاگیردارانہ معاشرہ عورت سے بھیڑ بکری جیساسلوک کرتاہے۔شادی میں بھی عورت کی رضااور پسند ناپسند کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔وراثت میں بھی اس کا حقتسلیم نہیں کیا جاتانہ اس کا حصہ ادا کیا جاتا ہے۔سندھ میں ایک نہایت قبیح رسم جاری ہے۔عورتوں کو ان کے حقسے محروم کرنے کے واسطے ان کا قرآن پاک سے نکاح کر دیاجاتاہے۔عورتوں کو تعلیم دلوانا بھی معیوب سمجھاجاتاہے۔''(۳۹)

ر۔ عورت اور ادب کے مابین تعلق:

یہ حقیقت ہے کہ دنیامیں ہر چیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہوتاہے اور اسی طرح محرک،بنیاد،وجود، کردار، مرام اور نتیجے کا ایک اخلاقی، فلسفیانہ اور ادبی سلسلہ شروع ہوتاہے۔اب اُسی رشتے کو ابدی قرار دیاجاتاہے جس کا جوڑاا حترام آدمیت اور مساوات انسانیت سے ثابت ہوتاہے۔کائنات بھر میں جہاں اور مخلوقات کو فرائض اور سلوک کی وجہ سے مختلف درجات حاصل ہیں وہاں عورت کو سب گھر، چاردیواری،ماحول اور ریاست کے لیے معتبر اور مقدس کردار مانتے ہیں۔یہ عورت وہ مایہ ہے جس سے اندھیر وادیوں،تاریک راستوں اور سیاہ منزلوں کو روشن تر بنایاجاسکتاہے۔اس کردار کو اس لحاظ

سے مایا بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے واسطہ سراب اور گمشدہ کہانیوں اور داستانوں کو حقیقی اور دائمی شکلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عورت کسی بھی سماج کا وہ ازلی کردار ہوتا ہے جس سے انہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن صورت میں مطالعہ اور مشاہدہ کرنا نہایت آسان ہوتا ہے۔ مشکلات، مصائب اور تکالیف کو برداشت کرنا، اور اُن کو اپنی ذات میں چھپا کر کرم و تبسم، خوشی و دلفریبیاور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا اسی عورت کا کام مانا جاتا ہے۔ اس عورت کو ایک طرف گھر خاندان، نسل ، معاشرے، کنبے اور زندگی کا فعال حصہ تسلیم کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کو پورا گھر اور مکمل سماج بھی کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس شے، جسم، نام اور حیثیت سے کسی بھی ابتداء ترقیاور تشکیل کی باقاعدہ شروعات ہوتی ہے اُسی پر تکمیل اور کاملیت کا سفر بھی اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اگر واقعی اس قاعدے یا اصول کو قطعی یا تاکیدی مانا جاتا ہے تو پہلا نام بھی عورت کا ظاہر ہوتا ہے، اور آخری مرتبہ بھی اُسی عورت کو دیا جاتا ہے۔

الغرض ایک عورت ذاتی اور انفرادی طور پر بھی ایک دائمی جہاں کے برابر ہوتی ہے اور کل و اجتماعی لحاظ سے بھی امر کہلاتی ہے۔ اسی طرح چاہے کوئی بھی جمود، حرکت، رجحان، تحریک، نظریے یا عقیدے کا مسئلہ ہو تو روز اول ہی سے عورت کو بنیادی کردار سے یاد کیا جاتا ہے۔

ادب اگر ایک جانب رکھ رکھاؤ، احترام، تکریم اور عزت سے پیوستہ ایک حقیقت کا نام ہے تو ساتھ ساتھ احساسات، جذبات، رجحانات، میلانات، خیالات اور فکریات کو ظہور دینے اور اُن کو باقاعدہ طور پر ایک تخلیقی صورت عطا کرنے والی ان مٹ سچائی بھی ہے۔ اگر کسی بھی جگہ یا ذہنسے ادب کو باہر کیا جائے یا اس کو غیر ضروری مان کر دور رکھا جائے تو واقعی ایسا عمل کسی بھی حساس اور ذمہ دار سماج اور اس سے بڑھ کر انسان و انسانیت کے حق میں نہیں ہے۔ گذشتہ عصر، زمانہ حال اور مستقبل کے حالات پر رائے دینا گنجِ اصل کشید کرنا ہو، اصل نقل میں لکیریں کھینچنا ہو، عارضی و ابدی میں امتیاز کرنا ہو اور انسانیت و حیوانیت کی نشاندہی کرنی ہو تو زیادہ تر ادب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح عورت کے بغیر کوئی بھی چار دیواری اور بستی صحیح معنوں میں ترقی اور خوشحالی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، اُسی طرح ادب کو چھوڑ کر بھی آدم کما حقہ اپنی معراج کو پا نہیں سکتا۔ اگر عورت کو جاننا ہو تو ادب کا مخصوص مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ دوسری طرف عورت کو پل پل جس طرح جینا ہوتا ہے اور دشوار ترین مراحل اور آزمائشوں سے گزر کر قرار واقعی کے لیے تگ و دو کرنی ہے تو ادب ہی وہ مایہ ہے جو اس ایثار پرست یا جاوداں کردار کو معلیٰ مقام سے فیض یاب کر سکتا ہے۔ عورت اور ادب کا تعلق اور وصال ایک اٹل سچائی ہے۔ ان دونوں کے کے ساتھ سے وہ حالات بھی آشکارہ ہوئے ہیں جن سے اُجڑے دیاروں اور آباد گھروں کا پتا چلتا ہے۔ ان دونوں کا جوڑ اُن مراحل اور اقدامات کا ظاہر ہونا بھی ہے جن سے کبھی کبھار آدم وحشت کا شکار

ہوتا ہے اور بعض اوقات یہی انسان اشرف المخلوقات کا جامہ زیبِ تن کر جاتا ہے۔ایک کردار کے پاس جتنے گُم یا پوشیدہ خزانے ہوتے ہیں تو دوسرا کردار یعنی ادب اُن کو ظہور دیتا ہے،اور یوں جہاں اُنگلی اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ سر اُٹھا کر یہی فریضہ سر انجام دیتے ہیں اور جہاں تک خاک اور خون کو چنگاریوں اور شکلوں میں بدلنا لازمی ہوتا ہے تو وہاں پر عملی اُمور بھی ملاحظہ ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عورت کو مستحکم اور اکمل مقام و مرتبہ دلانے میں ادب کی مثال جِلا کی ہوتی ہے اور ادب کو دائمی شکل اختیار کرنے یا دینے میں عورت واقعی مایا سے کم نہیں ہوتی اور ان دونوں کا سنگم اور سنگت وقت اور تمام تر حالات ،حادثات،ارشادات، تخلیقات، تحقیقات، نتائج اور سفارشات سے حق و سچ ثابت کیا ہے۔

ح۔ عورت اور اُن کے عمومی مسائل:

عالمی ادب کا ایک اہم موضوع عورت ہے۔عورت کے مسائل اور عورت کے خلاف امتیازی رویہ مشرق اور مغرب دونوں میں نظر آتا ہے۔ پاکستانی عورت کے بہت سارے مسائل اور مطالبات وہی ہیں جو دنیا کی باقی عورتوں کو درپیش ہیں۔ مغرب کی عورت ، تعلیم ، صحت اور کام کے مساوی مواقع حاصل کر چکی ہے۔جب کہ ان حقوق کے حصول سے پاکستانی عورت آج بھی محروم ہے۔اپنے حقوق کے حصول میں عورت کو جو رکاوٹیں اور مشکلات درپیش ہیں اُن کا تعلق مرد کی سوچ اور نظریات سے ہے۔مرد عورت کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور عورت کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے زندگی کے کسی میدان میں برابر حقوق کا حامل وجود ماننے سے انکاری ہے۔ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں۔

> ''دور جدید کے آغاز میں صنفِ اناث کو پستی سے اٹھانے کی کوشش کی گئی عورت کی تذلیل کے تصور کو ختم کیا گیا۔اُس کے سلب شدہ معاشی حقوق بحال کیے گئے اور نکاح و طلاق کے پچھلے قوانین کی سختی دور کی گئی۔عورت کے حقوق کے لیے جو مہم چلائی گئی وہ دراصل انتظریات پر مبنی تھا جو جدید مغربی معاشرت کے ستون متصور ہوتے ہیں یعنی:
>
> 1 ۔ مرد عورت کی مساوات
>
> 2 ۔ عورتوں کا معاشی استحصال
>
> 3۔ دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔''(۴۰)

زندگی کے بہت سارے معاملات میں نہ صرف مرد عورت کا استحصال کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ عورت بھی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ہم یہ بھول گئے ہیں کہ عورت ایک انسان بھی ہے۔انسانی حقوق میں اس کا بھی کوئی حصہ

ہے۔ عورت کے استحصال کے رویے قابلِ مذمت ہیں خواہ وہ رویے مرد اپنائے یا عورت۔ عورتوں کے استحصال کے حوالے سے فردوس حیدر لکھتی ہیں کہ:

''مرد عورت کے درمیان طے شدہ رشتوں کے علاوہ بھی تعلق ہوتا ہے احساس جرم اور احساسِ گناہ کے بغیر۔ تمام تر حرمتوں کے ساتھ۔ جیسے کے ایک آزاد شہری کا آپس یا ایک بادشاہ کا دوسرے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ عورت کو مرد سے یا مرد کو عورت سے ہی اذیت نہیں ملتی بلکہ عورت کے ہاتھوں عورت اور مرد کے ہاتھوں مرد بھیظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔''(۴۱)

اسلام میں حقوق سے آگاہی کے باوجود عورت جس آزادی کی خواہش مند ہے، اُس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گھریلو ذمہ داریوں سے دستبرداری چاہتی ہے بلکہ اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں میں اپنی شخصیت کے اظہار میں شمولیت کی آزادی چاہتی ہے۔ بحیثیت ماں، بیوی، بہن اور بیٹی خدمات کا اعتراف کرنا، عورت کو بنیادی انسانی حقوق کی فراہمی اور فیصلے میں شراکت کا حق دینا ایسے اقدامات ہیں جو معاشرے کے ارتقاء اور بقاء کے لیے ضروری ہیں۔ بہت سارے رشتوں میں ایک معتبر رشتہ ماں کا ہے۔ مختلف تہذیبوں اور مذاہب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ماں کے روپ میں عورت کو عزت و احترام دیا ہے۔ ان کو دھرتی، ماتا، دیوی قرار دیا ہے۔ نسل انسانی کی بقاء عورت کی قوتِ تخلیق سے وابستہ ہے۔ بحیثیت ماں معاشرتی رسوم و رواج عورت کو عزت و تکریم کا مقام دیتے ہیں۔ ماں بننا عورت کی فطری خواہش ہوتی ہے اور اس کی شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔ ماں بننے کی عورت کی فطری خواہش اور تخلیقی آرزو کو ایک شکل قرار دیتے ہوئے سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''عورت کے نزدیک نسائی معراج ماں بننے میں مضمر ہے اس کے مقابلے میں وہ بھی دیگر فن کاروں کی مانند ہے، جو اپنی ہیتخلیق کے پرتوں میں اپنی بلندی دیکھتے ہیں۔''(۴۲)

ماں کا ایک اہم فریضہ اولاد کی دیکھ بھال اور پرورش ہے۔ وہ یہ ذمہ داری بااحسن و خوبی ادا کرتی ہے۔ معاشرے میں دوسرے افراد کی نسبت بحیثیت ماں اُس کا درجہ بلند ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ادریس آزاد لکھتے ہے۔

''ماں جو انسانی معاشرے میں اپنے بچے کے بچپن میں اس کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارتی ہے۔ اس کی شخصیت اور کردار پر سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی ہے اور بچہ بڑا ہو کر ماں ہی کیعادات، افکار، محرومیوں اور دکھوں کا بوجھ عمر بھر اپنے کشکول میں لیے پھرتا ہے۔''(۴۳)

انسانی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے زیادہ عوامل ماں سے وابستہ سر گرمیاں اور عوامل ہیں۔اپنے بچے کے لیے زیادہ تکالیف اور مصائب برداشت کرنے والی ہستی ماں ہے۔بچے کی نگہداشت اور پرورش میں ماں کو بہت سارے مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ماں کی محبت پُر خلوص اور بے ریا ہوتی ہے۔اولاد کو جان سے بڑھ کر چاہتی ہے۔ایک عورت ماں بننے کے بعد اپنی ساری خواہشات اور ارمانوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خوشیوں پر اولاد کی خوشی کو ترجیح دیتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں ماؤں کی اکثریت محرومی اور تکلیف کی زندگی گزار رہی ہے۔بہت سی مائیں اولاد کو جنم دیتے ہوئے حیات سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔اس کی وجہ غربت اور طبّی سہولیات کی عدم دستیابی ہے۔ماں پر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے اکثر اوقات اُن کی صحت خراب رہتی ہے۔اُس کے سر پر گھر کے کاموں کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔اگر وہ صنف ناپسندیدہ کو جنم دیتی ہے تو اُس کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔نوبت طلاق تک آجاتی ہے۔ماں کا درجہ بہت بلند ہے مگر شوہر کا جی جب چاہے اس بلند درجہ ماں کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔اولاد کی ساری ذمہ داریاں ماں پر آجاتی ہیں۔اولاد نہ ہونے پر بھی سارا قصور وار عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔اولاد کی خاطر ماں ہر قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتی۔خود بھوکی رہتی ہے، مگر ان کے لیے کھانے پینے اور رہن سہن کا بندوبست کرتی ہے۔ہمارے ملک میں چونکہ تعلیم کی شرح بہت کم ہے اور غربت زیادہ ہے۔اس لیے زیادہ تر مائیں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔اس دوران ماں مختلف مسائل کا سامنا کرتی ہے۔جس میں سب سے اہم جنسی حراست ہے۔ہمارے معاشرے میں ایک طلاق یافتہ عورت کو بہت بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔طلاق کے نام سے بچنے کے لیے بھی وہ اپنے بداعمال شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔متوسط گھرانوں میں بچوں کے جوان ہونے تک ماں کی حیثیت بہت مستحکم ہو چکی ہوتی ہے اور اسی اُمید کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی مصائب و مشکلات میں گزار دیتی ہے۔بچوں کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ماں کا ہوتا ہے۔وہ ان کی تربیت میں دن رات ایک کر دیتی ہے مگر نااہل اولاد کل اپنی ماں کو ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ اُن کی ماں نے اُن کے لیے کیا کیا۔اسی اولاد کی کامیابی کے لیے ماں پھر بھی دُعائیں کرتی ہے۔جو عورت ایک ناجائز بچے کو جنم دیتی ہے اُسے تب بھی اپنے ہونے والے بچے سے اُتنی ہی محبت ہوتی ہے جتنی کہ جائز اولاد سے۔اگرچہ سماجی ضابطے ایسی ماں کو عزت و تکریم نہیں بلکہ ذلت و حقارت کا طوق عطا کرتے ہیں۔ماں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ماں کی محبت بے غرض ہوتی ہے خاص طور پر مشرقی عورت یا ماں بیٹے سے محبت کرتی ہے وہ ایک بیٹے کی صورت میں ایک جواں مرد کے احساس تحفظ کی متلاشی ہوتی ہے۔شوہر کے بعد وہ اپنے بیٹے سے ساری اُمیدیں وابستہ رکھتی ہے۔مگر جب وہی بیٹا بڑا ہو کر اپنی ماں کو چھوڑ جاتا ہے تو ماں بکھر کر رہ جاتی ہے۔مشرق میں آخری عمر میں ماں اپنی اولاد پر بوجھ بن جاتی ہے۔ماں کے

پاس زندگی کے دکھ درد بانٹنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ تنہائیوں اور مایوسیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ تنہائی اور بے توجہی، کامیاب اولاد کی ماں کا مقدر ہے۔ ساری زندگی ماں اپنا روپیہ پیسہ بچوں کی تعلیم اور صحت پر خرچ کر دیتی ہے۔ اُن کی خواہشات پوری کرنے کے لیے جان تک ہار دیتی ہے۔ مگر آخری عمر میں جب اُنھیں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو اُن کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہے مگر اپنی اولاد سے شکایت تک نہیں کرتی۔ اس خیال سے اپنی جوان اولاد کے سامنے کسی خواہش کا اظہار نہیں کرتی کہ اولاد ناراض ہو جائے گی۔ ایک ماں اپنے بچوں کے لیے جتنی حساس اور فکر مند ہوتی ہے بچے اُتنے ہی اُس سے کٹتے چلے جاتے ہیں۔ بیٹی خاص طور سے ماں سے بحث کرنے سے گریز کرتی ہے اس کے خیال میں ماں اس کے نظریات کو نہیں سمجھ سکتی۔ اس لیے اُسے بے کار سمجھ کر اُس سے بات نہیں کرتی۔

بیٹی مشرقی معاشرے میں وہ اولاد ہے جس پر والدین اظہار خوشی کرنے کی بجائے سوگوار ہوتے ہیں۔ اپنے بوجھ ہونے کا احساس لیے بیٹی ماں باپ، بہن بھائیوں سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہے۔ اُن کو خوش رکھنے کے لیے ہر طرح سے تگ و دو کرتی ہے۔ بڑی محنت اور مشقت کے بعد چھوٹے چھوٹے حق حاصل کر کے شاد رہتی ہے۔ ہر معاشرے میں بیٹی سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو کھانے سے لے کر صحت کی بنیادی سہولتوں، آزادی رائے اور اپنی پسند کی زندگی کے حصول تک جا پہنچتا ہے۔ تعلیم یافتہ روشن خیال خاندانوں سے لے کر ان پڑھ گھرانوں تک بیٹی کسی نہ کسی تناسب میں ان امتیازات کا شکار ہوتی ہے۔

ماں خود ایک عورت ہو کر بیٹی کی پیدائش پر سوگوار ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے جس طرح سے اپنی زندگی عورت ہو کر گزاری ہوتی ہے۔ جب اس کا خیال وہ اپنی بیٹی کے لیے لاتی ہے تو رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی لڑکا لڑکی میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ وہ گھرانے جو غربت زدہ ہیں اپنی کم سن بہن بیٹیوں کو دوسروں کے گھروں میں کام پر لگوا دیتے ہیں۔ پھر اُس گھر والے اس لڑکی کو جیسا بھی رکھیں، جس طرح کا بھی سلوک روا رکھیں، والدین کو اس کی کوئی فکر نہیں۔ وہی لڑکی اپنا بچپن اور جوانی تک مایوسیوں اور حسرتوں، میں گزار دیتی ہے۔ اس کا رہن سہن، کھانا پینا مالکوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اس ماحول میں پلنے والی لڑکیاں اکثر منفی رد عمل اختیار کر لیتی ہیں اور زیادہ تر بدکار، جھگڑالو، چور اور بدزبان بن جاتی ہیں۔ اس میں قصور اس لڑکی کا نہیں ہوتا جس میں وہ پلی بڑھی۔

متوسط گھرانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین زیادہ تر بچے کی پیدائش سے پہلے اپنا الٹرا ساؤنڈ کرواتی ہیں تاکہ جنین کا پتہ چلے۔ اگر اُسے پتہ چلے کہ پیٹ میں پلنے والا بچہ لڑکی ہے تو پھر وہ زیادہ تر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتی اور نہ ہی دوائیاں اور اچھی خوراک لیتی ہے۔ بلکہ اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ پیدائش کے وقت بچہ مر جائے کیونکہ بچی پیدائش پر شوہر اور سسرال والے ناراض ہونگے۔ معاشی بوجھ کی وجہ سے بھی لڑکی کی پیدائش کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر اوقات جنین کا پتہ

چلنے پر ماں حمل ضائع کر دیتی ہے۔ جن گھرانوں میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہ لڑکیاں احساس کمتری لے کر بڑی ہوتی ہیں۔اس خیال کے ساتھ کہ لڑکا بڑا ہو کر گھر کا سہارا بنے گا۔اس کو اچھی خوراک و لباس کی ضرورت ہے۔اس لیے لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو اچھا اور بہتر کھانا دیا جاتا ہے۔گھر میں مردوں کے کھانا کھانے کے بعد عورتیں کھانا کھاتی ہیں۔ گوشت اور پھل زیادہ تر مردوں کو کھلائے جاتے ہیں جبکہ لڑکیوں کو دالیں اور سبزیاں یا زیادہ تر بچا ہوا کھانا دیا جاتا ہے۔اس طرح لڑکیوں کی صحت خراب رہتی ہے اور اکثر پیچیدہ بیماریوں کا شکار بن جا
تی ہیں۔ماں کا اپنی صحت کا خیال نہ رکھنے کے باعث اکثر گھرانوں میں معذور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو کہ ایک سماجی بوجھ ہے۔

غریب گھرانوں میں بیٹوں کی پیدائش پر ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور ان کی بہنوں کو ان کا غلام بنا دیا جاتا ہے۔ان کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ بیٹیوں سے محنت مزدوری کروائی جاتی ہے۔جب کہ بیٹوں کی صحت و سہولت کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔

متوسط گھرانوں میں جہاں لڑکیوں کو گورنمنٹ اسکولوں میں داخل کیا جاتا ہے تو لڑکوں کو وہاں کے کسی اچھے پرائیویٹ اسکول میں داخل کیا جاتا ہے ۔ بچپن ہی سے یہ امتیازی سلوک لڑکیوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لڑکے کے لیے باقاعدہ ٹیوشن کا انتظام کیا جاتا ہے جبکہ لڑکیاں اس سہولت سے محروم رہتی ہیں۔اسکول جا کر باقاعدہ لڑکے کے تعلیمی معیار کے بارے میں چھان بین کی جاتی ہے جبکہ لڑکیوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔اس وجہ سے لڑکیاں لڑکوں کی نسبت تعلیمی میدان میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکیوں کو مڈل یا دسویں تک پڑھایا جائے کیونکہ والدین سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے سے لڑکیاں بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہیں اور اپنے والدین اور شوہر کی نافرمانی کرتی ہیں۔ لڑکیوں کو اپنا ہمسفر چننے میں بھی آزادی رائے نہیں دی جاتی۔ بلکہ نہایت کم عمری میں کسی ناپسندیدہ شخصیت سے نکاح کروایا جاتا ہے جس میں لڑکی کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ دولت کی خاطر لڑکی کو کسی امیر ضعیف العمر شخص سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے بیٹیوں کو کاروبار کا ذریعہ بھی بنایا ہوا ہے۔دولت کی خاطر لڑکیوں کو بیچ دیا جاتا ہے ۔وٹہ سٹہ ،ولور ،ونی، قتل کے بدلے میں سورہ دینا بیٹیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حصہ ہے۔ لڑکی کا کسی لڑکے کو پسند کرنا، بات کرنا معاشرے میں باعث عیب و شرم سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی گھرانوں میں زیادہ تر عورتوں کو نامحرم مردوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ زیادہ تر وہ گھر میں قید رہتی ہیں۔ بعض علاقوں میں جائیداد کے بانٹنے کے خوف سے لڑکی کی شادی نہیں کرائی جاتی۔ایسی لڑکیاں زیادہ تر باغی یا نفسیاتی مریض بن جاتی ہیں۔ کسی لڑکی کا شادی سے انکار اُسے والدین اور معاشرے کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔اور اس کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ والدین

اُس سے ہر طرح کا ناطہ توڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔اور بے چاری لڑکی مجبوراً اس رشتے کے لیے ہاں کر دیتی ہے اور اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

اکثر غریب گھرانوں کی لڑکیاں اگر اسکولز یا کالجز وغیرہ جاتی ہیں تو احساس کمتری کی وجہ سے مختلف منفیسر گرمیوں میں ملوث ہو جاتی ہیں۔والدین اُن کو لڑکوں کی نسبت تعلیمی قابلیت پر نہیں سراہتے۔جس کی وجہ سے اُن کی تعلیم میں دلچسپی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔راستوں، کالجز یا یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے لڑکوں سے راہ ورسم اختیا ر کرتی ہیں۔اُن سے تحفہ تحائف لینا، مختلف نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنا، بے راہ روی کا شکار ہونا اور زنا جیسی بد ترین عادات میں ملوث ہو جاتی ہیں۔اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہیں۔مگر ان لڑکیوں کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

بہن کا رشتہ محبت سے عبارت ہے۔اپنی محبتیں خاندان پر نچھاور کرنے والی بہن اکثر محبت پانے میں ناکام رہتی ہے۔ہمارے معاشرے میں بھائی کو بہن پر فوقیت دی جاتی ہے۔بہن کو بھائی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تربیت ملتی ہے۔محبت کے چند بولوں کے عوض بھائی بہنوں سے بڑے بڑے مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔کبھی عزت وناموس کے نام پر، جبکہ کبھی جائیداد کے حصول کی خاطر بہنوں کی زندگی بھر کی خوشیاں چھین لی جاتی ہیں۔ایک بہن دوسری بہن کا دکھ درد ایک بھائی کی نسبت زیادہ سمجھتی ہے اور اس کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔بچپن ہی سے بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دینے سے لڑکیاں احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں اور اسی احساس کے تحت پروان چڑھتی ہیں اور زندگی کے ہر میدان میں بھائی سے کم تر ہونے کا نظریہ اُن کے سامنے ہوتا ہے۔لڑکیوں کی زندگی اور اس کی شخصیت پر اس ماحول کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے رابعہ الربا لکھتی ہیں کہ:

> ''اس طرح کے امتیازی سلوک سے لڑکیوں کی ذہنی تربیت بہت متاثر ہوتی ہے ان میں احساس کم تری پیدا ہوتا ہے۔وہ خود کو محکوم و کمزور سمجھنے لگتی ہیں۔یہی کمی اُن کی آئندہ زندگی پر ایسی اثرانداز ہوتی ہے کہ وہ بہ طریق احسن اپنے شوہر کے حقوق بھی پورے نہیں کر سکتی۔پھر اولاد کی تربیت میں بھی یہی کمی کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔''(۴۴)

سماجی استحصال کا شکار سب سے پہلے عورت ہوتی ہے۔بہن ہونے کے ناطے روایتی مردانہ سوچ اور بھائی کا حاکمانہ رویّہ اس کے آڑے آتا ہے۔بہنوں کو اس ظالم سماج میں جائیداد میں سے اپنا حصّہ چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔بھائی بہن کو اپنی غیرت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔بہن کے متعلق محلے میں کوئی غلط بات سننے پر بہن کو قتل کیا جاتا ہے۔پرانی دشمنیاں ختم کرنے یا بدلے چکانے کے عوض بہن ہی کو قربانی کا بکرا بنا دیتے ہیں۔بہن کا رشتہ عورت کے دوسروں رشتوں کی طرح

ایک خوبصورت رشتہ ہے۔ مگر اس مقدس رشتے میں بھی عورت طرح طرح کے مسائل و مشکلات کا شکار ہے۔ اسے کم تر اور محدود اختیارات کا سامنا ہے۔

سب بچوں کے لیے پیدائش سے لے کر سنِ بلوغت کا عرصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اپنے ارد گرد ماحول کا ادراک وہ اسی عمر سے شروع کر دیتا ہے۔ اپنے ماحول اور اپنی ذات سے متعارف ہونے کے ساتھ ساتھ بچہ اشیاء کی تفہیم اور واقعات کی سمجھ بوجھ میں رفتہ رفتہ انکشاف اور تحیّر کی فضا سے گزرتا ہے۔ یہ دور اس کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سماج میں لڑکیوں کی کم تر حیثیت بچپن میں دو طرح سے اہم ہوتی ہے، ایک جنسی تفریق کے عناصر ان کے ذہن کو قبل از وقت بہت سی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرا دیتے ہیں۔ دوسرا تجربہ اور احساس کے مختلف مراحل اس عمر کے تقاضے ہیں۔ بعض گھریلو ماحول کی وجہ سے لڑکیاں بہت ہی سنجیدہ، سیانی اور ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کا بخوبی اندازہ لگاتی ہیں۔ کچھ بچیوں میں بچپن ہی سے چڑچڑا پن آنا شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کو بات بات پر ٹوکنا، انہیں ضدی اور باغی بنا دیتا ہے۔ والدین کا لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کا زیادہ خیال رکھنا، اُن کی خوشی اور ضروریات کا زیادہ خیال رکھنا، بعض دفعہ لڑکیوں کو والدین سے بد ظن کر دیتا ہے۔ بھائی کے کھلونے توڑنا اور اُن کو تنگ کرنا ان ہی مسائل کی اصل ہے۔ بعض گھرانوں میں جہاں چار پانچ بہنیں پیدا ہوتی ہیں اور اُن کا کوئی بھائی نہیں ہوتا۔ تو والدہ کسی ایک بیٹی کو لڑکے کے کپڑے پہناتی ہے۔ اور اپنی تشنگی مٹانے کے لیے لڑکی کو احساس کم تری کا شکار بنا لیتی ہے۔ لڑکوں جیسے کپڑے پہن کر اور بال بنا کر وہ اپنے آپ کو لڑکا سمجھنا شروع کرتی ہے اور اُن جیسی حرکات و سکنات کی بنا پر بڑی ہو کر سماج میں لعن طعن کا نشانہ بنتی ہے۔ جس میں اس بچی کا کوئی قصور نہیں ہوتا جب کہ قصوروار والدین ہوتے ہیں۔

بچپن ہی سے لڑکیوں کو غیر نصابی سرگرمیوں میں حصّہ لینے سے منع کیا جاتا ہے جس میں مختلف کھیل کھود شامل ہیں۔ جن گھرانوں میں بہن بھائیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہیں۔ وہاں ماں کی محبت دوسرے بہن بھائیوں میں بٹ جانے سے ماں کے لمس سے محرومی کا شکار ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا خیال کرتی ہیں۔ اُس کو وہ محبت اور توجہ نہیں ملتی جو اس کا حق ہے۔ لڑکیوں کی اخلاقی پستی کا شرفاء کے گھر میں نچلے طبقے کی عورتوں کا آمد و رفت بھی ہے۔ کیونکہ ان کے والدین ان پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اس طرح وہ بھی ان عورتوں کے مشاغل اختیار کر لیتی ہیں۔

میاں بیوی کا رشتہ ایک بنیادی اور مضبوط رشتہ ہے سماجی ڈھانچہ کی بنیاد اور انسانی نسل کی بقاء کا دار و مدار اسی پر ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کو شادی قانونی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ نکاح مرد اور عورت کو سماجی ذمہ داریوں کا پابند بناتا ہے۔ شادی حقوق و فرائض کا بوجھ مرد و عورت دونوں پر یکساں ڈالتی ہے۔ عورت پر سماجی ذمہداریوں کی صورتمیں جبکہ مرد پر معاشی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ چونکہ ایک روایتی معاشرہ ہے۔

مرد کی بالادستی کو اس معاشرے میں قدر کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی پر زیادہ تر فرائض کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں۔

''بیوی کی حیثیت سے عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے کیونکہ یہی وہ تعلق ہے جس میں مرد کو اپنے اختیارات استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس تعلق میں ہر معاشرے میں عورت کے لیے فرائض تو مقرر کیے گئے ہیں لیکن حقوق سے اُسے محروم رکھا گیا ہے۔''(۴۵)

معاشرے میں شوہر سے اس کا مقام و مرتبہ وابستہ ہے۔ سماجی تحفظ اور معاشی ضروریات کے لیے عورت مرد کی محتاج و ضرورتمند ہوتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اسلام نے شادی کے ایسے طریقے سے جن سے عورتوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ اور وہ منڈی میں بکنے والی حیوان نما مخلوق اور محض ایک نفسیاتی تسکین کا باعث سمجھی جاتی تھی، کی واضح اور شدید الفاظ میں مذمت کی اور اس کو عزت و تکریم کا مستحق ٹھرایا۔ کسی عورت سے تعلق رکھنے کے لیے نکاح کی شرط رکھی اور شادی کو باقاعدہ ایک شکل دی اور اس کو تقدس، محبت اور تحفظ عطا کیا۔ پہلے زمانے میں بیویوں کی کوئی باقاعدہ معین تعداد نہیں تھی۔ مرد کو اسلام نے چار شادیوں تک محدود کر دیا اور ان چار شادیوں کی اجازت بھی خاص شرائط کے تحت دی ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''عورتوں میں سے جو بھی تمھیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابر نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی یہ زیادہ قریبے کہ (ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھک جانے سے بچاؤ۔''(۴۶)

عورت کی ازدواجی زندگی کی استحکام کے لیے مشرقی معاشرے میں اولاد کی پیدائش لازمی شرط کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ بیوی کی اہمیت اولاد کی پیدائش کے بعد مرد کی زندگی میں بڑھ جاتی ہے۔ اولاد کی غیر موجودگی میں عورت کی گھریلو زندگی ناممکن اور پُر خطر ہوتی ہے۔ شوہر کی فرماں برداری اور سسرال سے وابستہ ہر طرح کے توقعات کو پورا کرنا سماجی حوالے سے عورت کی مجبوری بن جاتی ہے۔ ایک عورت کے لیے سسرال کسی جہنم سے کم نہیں ہوتا جہاں اس کی خواہشوں اور ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، گھر کے تمام افراد کی دیکھ بھال جن میں بچے بوڑھے سب شامل ہیں، کا خیال رکھنا عورت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ گھر کے سب افراد کا خیال رکھنے کے باوجود اگر کسی بھی قسم کی کوتاہی بیوی سے سرزد ہو جاتی ہے تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

بیوی کی موجودگی میں مرد دوسری عورتوں سے بھی تعلق رکھتا ہے مگر بیوی خوف کے مارے اپنے شوہر سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے کیونکہ اس طرح اس کو طلاق بھی ہو سکتی ہے۔ بچوں سمیت اس کو گھر سے نکل جانے پر بھی مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ شوہر کے گھر والوں سے بات کرتی ہے تو بدلے میں عورت کو ہی طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گھر میں عورت کو باندی کی طرح رکھا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت گھر میں ایک رفیق کار کی نہیں بلکہ ایک نوکرانی کی طرح ہوتی ہے۔ اپنی ازدواجی زندگی کی خاطر ہر قسم کی مشکلات و مصائب برداشت کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ ساس اور نندیں بہو کے لیے ہر قسم کے مسائل پیدا کرنے میں آگے آگے ہوتی ہیں کہ کسی بھی طرح سے بدمزگی پیدا کی جائے۔ تاکہ وہ ایک خوش و خرم زندگی سے ہمیشہ محروم ہو۔ اس طرح گھروں کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان فساد برپا کرنے کے لیے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہے۔ مگر ان حالات میں بھی زیادہ تر عورتیں اپنے گھر کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی ہیں۔ اپنی زبان سے شوہر کے خلاف ایک لفظ تک نہیں نکالتیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر عورت کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

> ''ماحول میں اس کی قدر منفی ہے اپنی انفرادیت کو تسلیم کرانے کے لیے وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے بغیر خاوند کے وہ بالکل صفر بن جاتی ہے، غرض یہ کہ ہر لحاظ سے اُسے مقابلتاً مرد، کمزور قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے برابر نہیں اور اُسے زیادہ سے زیادہ جو درجہ مل سکتا ہے وہ نصف بہتر کا ہے۔''(۴۷)

بے جوڑ شادیوں کی صورت میں عورت کو کبھی کسی بوڑھے یا کبھی کسی بچے کے ساتھ اور کبھی روایات کی آڑ میں قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ وٹے سٹے اور ولور کی رسموں کی آگ میں بھی بچاری عورت ہی جلتی ہے۔ شادی کے قابل مرد نہ بھی ہو تو وہ شادی کر کے عورت کی زندگی تباہ کرنے کا حق رکھتا ہے اور عورت کو بانجھ کا الزام دیتا ہے۔

بیوی کے لیے شوہر کی رفاقت، توجہ، محبت اور وقت دینا تمام آسائشوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ سماجی اور معاشی ذمہ داریوں کے حوالے سے مرد، روٹی، کپڑا، زیور، گھر اور آسائشیں دے کر خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو وہ سب کچھ دے دیا جس کی وہ خواہش مند تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ امیر عورت کی جھولی اس وقت تک خالی رہتی ہے جب تک اسے شوہر کی توجہ حاصل نہ ہو۔ شوہر کی عدم توجہی سے عورت محرومیوں اور اصلما یوسیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ مردوں کی اکثریت عورتوں کو گھر میں رکھنے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس طرح بہت سی تعلیم یافتہ عورتیں شادی کے بعد ملازمت ترک کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف غریب طبقے کے اکثر مرد خود کام نہیں کرتے اور بیوی کو کما کر لانے پر مجبور کرتے ہیں۔ پی ٹی وی کے ڈراموں میں زیادہ تر عورتیں ہمیں شوہر کے دستِ نگر نظر آتی ہیں۔ بیوی ہونے کے ناطے

وہ شوہر کی محبت کی طلبگار، اس سے وفا کرتی، سمجھوتے کرتی اور قربانیاں دیتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی وہ شوہر کی وفا اور اپنے گھر کی بقا کے بارے میں عدم تحفظ کا شکار ہے۔ اور سخت ناانصافی اور استحصال کی زد میں ہے۔ پی ٹی وی کے یہ کردار اصل معاشرے کے حقیقی کرداروں کے عکاس ہیں۔

بیوہ ہونے کی صورت میں عورت کی زندگی بے شمار مشکلات اور مصائب کا شکار ہو جاتی ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کی دوسری شادی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی اولاد ہونے کی صورت میں اس کا دوسرا شوہر اتنی وسعتِ قلب نہیں رکھتا کہ اس کے بچوں کو اپنا کر پال سکے۔ لڑکیوں کی بیوہ ماں کی پریشانیاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ پاکستانی ظالم سماج میں بیوہ کی دوسری شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

شوہر کی وفات کے بعد زیادہ تر سسرال والے بیوہ عورت پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ جائیداد کا مسئلہ ہونے کی صورت میں اکثر بیوہ کی شادی گھر کے کسی مرد کے ساتھ طے کر دی جاتی ہے تاکہ گھر کی جائیداد باہر نہ جائے۔ اکثر بیوہ خواتین کو سسرال والے جائیداد کی خاطر قتل بھی کر دیتے ہیں۔ عورت ہمارے معاشرے میں دوسرے درجے کی مخلوق تصّور کی جاتی ہے۔ جنسی معاملات میں عورت کو مفعولی حیثیت سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ اس کی جنسی خواہش نہایت ملعون خیال کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس معاشرے میں پڑھا لکھا مرد بھی عورت کو برابر انسان نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بیوہ مشرقی عورتیں دوسری شادی کے نام سے کتراتی ہیں کیونکہ بیوہ کے اس فعل کو معاشرہ اچھا تسلیم نہیں کرتا۔

مردوں کی طرح عورتیں بھی اعلیٰ صلاحیتوں اور علم و فنون میں ماہر ہوتی ہیں۔ ملک کی ترقی کے لیے کیے جانے والے کاموں میں وہ بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔ عورتوں کی سمجھ بوجھ کے حوالے سے جان سٹورٹ مل کا کہنا ہے کہ

> ''تجربہ اور عام سمجھ بوجھ برابر ہو تو عورت مرد سے زیادہ حالات سمجھتی ہے۔ جو اس کے سامنے ہو۔''(۴۸)

گھر کی چار دیواری تک ہی ظالم سماج میں عورت کے دائرہ عمل کو محدود خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم میں اضافہ کی شرح کے باوجود بھی عورت کے گھر سے باہر کام کرنے کے بارے میں معاشرتی قبولیت کا رویّہ عام نظر نہیں آتا۔ زیادہ تر عورتیں بہت مجبوری کے باعث گھر سے کمانے کے لیے نکلتی ہیں۔ کام کرنے والی خواتین کو معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اپنے گھر والوں کا سہارا بننے کے لیے جو خواتین گھر سے نکلتی ہیں۔ خاندان والے گھر والوں کو بے غیرتی کے طعنے دیتے ہیں کہ عورتوں کی کمائی کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو عورتیں مختلف کارخانوں، دفتروں یا ہسپتالوں

میں کام کرنے جاتی ہیں وہاں کا عملہ انھیں ہر طرح سے ہراساں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف حیلوں بہانوں سے انھیں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں اور جو عورتیں یا لڑکیاں آڑے آجاتی ہیں انھیں نوکری سے نکال دیا جاتا ہے یا اس کے لیے زیادہ سے زیادہ مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ان مسائل کے باوجود بھی عورتیں حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہیں۔ متوسط طبقے کی خواتین اپنی صلاحیتوں کے اظہار، قابلیت کے اعتراف اور معاشی خود مختاری کے حصول کے لیے شہروں کی پڑھی لکھی لڑکیاں مختلف پیشوں سے وابستگی اختیار کر رہی ہیں۔اس صورت حال کے بارے میں ارشاد احمد رقم طراز ہیں کہ۔

> ''اب ہر طرف تعلیم حاصل کرنے اور نوکری کا رجحان روز افزوں ہے۔اکثر مہنگائی سے تنگ آکر ضرورت کے تحتاور کبھی شوقیہ بھی نوکری کی جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی تعلیم یافتہخواتین ملازمت کی طرف راغب دکھائی دیتی ہیں۔ہاں مگر گھریلوں ذمہ داریوں کا بوجھاٹھانے والی عورتیں ملازمت پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں اور گھر داری کا کام عمدہ ڈھنگ سے نبھاتی ہیں۔''(۴۹)

پاکستانی خواتین موجودہ دور میں معاشی حالات کی بہتری اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بہتر اظہار کے لیے ہر میدان میں شمولیت اختیار کر رہی ہیں۔پرائیویٹ اداروں ، فیشن انڈسٹری، ملوں، بینکوں، وفاقی اور صوبائی محکموں، طب، تدریس، سول سروس، پولیس، صحافت، ریڈیو، ٹی وی غرض بہت سے شعبوں میں خواتین کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ دیہاتوں کی نسبت شہروں میں تعلیم کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر ملازمت کا تناسب تعلیم کے مقابلے میں ابھی بھی بہت کم ہے۔ تعلیم اور طب کے علاوہ باقی شعبوں میں عورتوں کی ملازمت کو اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔ڈاکٹر عارفہ سیدہ عورتوں کی ملازمت کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> ''ماضی قریب تک عورتوں کے لیے قابلِ قبول معزز پیشے اُستاد اور ڈاکٹر بن جانے کے تھے۔اب اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں اُن کا داخلہ ممکن ہے۔ لیکن قلیدی آسامیوں پر تقرری ابھی بھیاُن کا حق نہیں ہے۔ معاشرتی منشا ابھی بھی اُن خواتین کو فوقیت دیتیہے جو تعلیم حاصل کریں مگر معاشی مصروفیت میں شامل نہ ہوں۔''(۵۰)

عورتوں کی ملازمت کی ناپسندیدگی کے اسباب ہیں زیادہ تر پسِ پردہ سماجی روایات اور مذہبی اعتقادات بھی ہیں۔اس روایتی نظام میں عورت کے گھر سے نکلنے اور ملازمت کرنے کو شرم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ زیادہتر لوگ اس روایتی تنگ نظری کا رشتہ مذہب سے جوڑتے ہیں۔ درحقیقت اسلام نے عورتوں کو ان کی فطری اور اکتسابی صلاحیتوں کے

استعمال سے نہیں روکا ہے اور نہ ہی معاشی جدوجہد میں شمولیت سے منع کیا ہے۔ڈاکٹر ثمر فاطمہ مسعود اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

''اسلام میں بنیادی طور پر کسبِ معاش کی آہی جاتی ہے تو اسلام اس کو ممنوعقرار نہیں دیتا بلکہ عورت کی اس معاشی جدوجہد پر اس کو دوہرا ثواب ملنے کی نوید سناتا ہے۔''(۵۱)

ڈاکٹر ذاکر نائیک لکھتے ہیں کہ :

''اسلام میں عورت کی ذمہ داری مرد پر ہے۔لیکن اس کے باوجود حالات و واقعات کی مناسبت سے اگر کبھی یہ ذمہ داری عورت پر آجائے تو کام کرنے (ملازمت وغیرہ) پر کوئیپابندی نہیں۔قرآن اور حدیث میں ایسا کوئی حکم نہیں جو عورتکے کوئی کام کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔بشرطیکہ یہ غیر قانونی نہ ہو اور اسلامی شرعی حدود کے تقاضے مجروح کرنے والانہ ہواور اس کالباس بھی اسلامی ستر کے مطابق ہو۔''(۵۲)

ان سب باتوں کے باوجود بھی عورت کے ملازمت کرنے پر عورت کو غلط نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔حالانکہ زیادہ تر عورتیں شوقیاًگھروں سے ملازمت کے لیے نہیں نکلتیں۔بلکہ مجبوراًملازمت کاراستہ اپناتی ہیں۔لیکن معاشرہ کام کرنے والی خواتین کے لیے ہزار قسم کے مسائل پیدا کرتا ہے اور اس کو تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ملازمت پیشہ خواتین کواُس کے سخت محنت کرنے کے باوجود بھی کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔دیہاتوں میں زیادہ تر عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں مگر اس کا زیادہ تر کام بےاُجرت مزدوری ہی رہتا ہے۔دیہاتوں میں رہنے والی خواتین نہ صرف کھیتوں میں کام کرتی ہیں بلکہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال بھی ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔جو عورتیں کام کی غرض سے گھر سے باہر جاتی ہیں۔وہ عورتیں زیادہ تر مردوں کے غیر متوازن اور غیر صحت مند اخلاقی رویے کی وجہ سے متعدد مشکلات اور مسائل کا شکار رہتی ہیں۔فاخرہ نورین لکھتی ہیں کہ :

''عورت کسی کے گھر میں ملازمت کر رہی ہو، کھیتوں میںکام کرنے کے لیے نکلے،دفتر میں کسی کی سیکرٹری ہو،فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہو ،ہسپتال میں نرس ہو،ڈاکٹر ہو،ایئر ہوسٹس ہو،کہیں بھی اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔۔۔۔۔۔۔کبھی اسے الفاظ کے ذریعے، کبھی اشاروں سے اور کبھی چھو کر اسے ایک الگ مخلوق ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔یہاں تک ہی نہیںبلکہ جو خواتین مردوں کے ساتھ دیر تک کام کرتی ہیں وہاں خواتینکو مختلف طریقوں سے ورغلانے کی کوشش کی جاتی ہےاوران میں سے کئی خواتین جنسی تشدد کانشانہ بھی بنتی ہیں۔''(۵۳)

سب سے پہلے مشرقی عورت کو جس پیشے کو اختیار کرنے کا موقع ملا وہ تدریس سے تعلق رکھتا تھا۔ پاکستانی معاشرے میں ابھی زیادہتر عورتیں اسی پیشے سے اپنے آپ کو منسلک رکھتی ہیں۔ معاشی جد وجہد میں مرد کے مساوی شرکت کے باوجود زیادہتر اسکولوں، کالجوں میں پڑھانے والی خواتین بہت سے مسائل کا شکار رہتی ہیں۔ بسا اوقات غربت کی وجہ سے اس کی نوکری خاندان کی ایسی ضرورت بن جاتی ہے جس کی وجہ سے اُس کی شادی بھی نہیں ہو پاتی۔ ظاہری اور باطنی مسائل میں محبوس عورت اپنی ساری زندگی گھر کی اور اسکول کی چاردیواری میں گزار دیتی ہے۔ کسی مجبوری یا مسائل کے لیے عورتوں کی ایک بڑی تعداد گھر سے نکلتی ہے۔ یہ عورتیں گھر اور باہر دونوں کی ذمہ داری اُٹھاتی ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل، گھر کا نظام چلانا، بچے پالنا، ملازمت کے مسائل کا سامنا، مہمان داری کے انتظامات، یہ سب ذمہ داریاں مل کر ان خواتین کو بہت ساری پریشانیوں میا کرتی ہیں۔

اس حوالے سے کشور ناہید رقمطراز ہیں۔

> ''ورکنگ مدرز کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ان کو فکر لگی ہوتی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں بچے کیسے اور کتنے مصروف ہیں، کس طرح ٹیوشن پڑھیں، قرآن پڑھیں، کھیلیں اور محنت کریں۔ ورکنگ مدر نہ چغلیاں کرتی ہیں اور نہ سنتی ہیں۔''(۵۴)

گھر اور بچوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے ساتھ عورت کو مردوں کی تنگ نظری بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ گھر اور گھر سے باہر مردوں کا منفی رویّہ اس مسائل میں اضافہ کر دیتا ہے۔ مرد مرکزی نظام میں چونکہ مرد کو برتر اور عورت کو اس سے کم تر خیال کیا جاتا ہے اس لیے مردوں کے ذہن میں عورتکے آگے بڑھنے کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ مرد حضرات اس کو ہتک خیال کرتے ہیں۔ مردوں کی اس مخصوص مردانہ ذہنیت کے باعث ملازمت پیشہ عورت کو اپنے پیشہ ورانہ ماحول اور گھریلوں زندگی میں بہت سارے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

> ''معاشرے میں مردوں کی اکثریت عورتوں کو نوکریکے چکر میں ڈالنے کی حامی نہیں ہے۔ خصوصاً مخلوط ملازمت کو تو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے خیال ہیں کماؤ بیوی خود کفیل اور خود اعتماد ہونے کی وجہ سے خاوند کی ہمسری کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ وہ دونوں میدانِملازمت کے یکساں سوار ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر اُتر سکتے ہیں۔ یوں گھریلوں زندگی کا سکو نخود پسندی اور انانیتکا شکار ہوتا ہے۔''(۵۵)

جنسی جذبہ انسانی زندگی کا ایک بہت طاقت ور جذبہ ہے۔ انسان نے اس جذبے کی تسکین کے لیے کئی طرح کے اصول و ضوابط کی بندشیں قائم کرنے کے باوجود اس سے مغلوب ہو کر چور دروازے بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ طوائف کی

زندگی اسی کی پیداوار ہے۔ طوائف جس نے جسم فروشی کو ایک ادارہ بنایا ہوتا ہے۔ جو کچھ دام کے عوض جسم اور وقت فروخت کرتی ہے۔ یہ ادارہ ایک قدیم ادارہ ہے ڈاکٹر وپی سوری رقم طراز ہے کہ۔

''تاریخی اعتبار سے اس انسٹیٹیوشن کا آغاز کب ہوا یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن دنیا کی قدیم ترین روایتوں، مذہبی فن پاروں اور تاریخی دستاویزوں سے اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ یہ ادارہ ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہا ہے۔''(۵۶)

برصغیر کی تاریخ میں طوائفوں نے ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے۔ اس وقت کے بادشاہوں اور امراء کا بڑا حصّہ ہے۔ ڈاکٹر وی پی سوری لکھتے ہیں کہ

''برصغیر کی تاریخ میں لکھنؤ کی تہذیب غیر معمولی عیش و نشاط اور ہوا و ہوس میں ڈوبی تہذیب ہے جہاں تہذیب کا مرکز طوائف ہے۔''(۵۷)

ڈاکٹر مبارک کے مطابق یہ دور مختصر تھا مگر اس کے اثرات تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

''اس دور کی طوائف علوم و فنون کی ماہر، آداب سے آگاہ، ادبی ذوق کی حامل اور عیش کی زندگی گزارنے والی عورت تھی۔''(۵۸)

جیسے جیسے یہ امراء اور رؤسا گھٹتے گئے ان طوائفوں کے انداز لوازمات بھی زوال پزیر ہوئے۔ دو عظیم جنگوں، آزادی اور ہجرت کے بعد معاشی انقلاب آیا جس نے عام عورت کو روٹی کے عوض بکنے پر مجبور کیا۔ طوائف کے ادارے ختم نہیں ہوئے بلکہ اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔ مگر اس دور کی طوائف ماضی کی طوائف کی طرح نہ خوشحال ہے اور نہ آسودہ زندگی رکھتی ہے۔ طوائف کا پیشہ اختیار کرنے کی مختلف وجوہات ہیں۔ جن میں مرد کی بے وفائی، شوہروں کی دوسری شادیاں کرنا، ملازمت کی آڑ میں عورتوں کی عصمت دری یا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیاں یا عورتیں جیسی وجوہات کی بناپر عورتیں زیادہ تر طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ایسی عورتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ گاؤں ہو یا شہر دنیا کے ہر کونے میں طوائف موجود ہیں۔ ان میں کچھ عورتیں طوائف کے لیبل کے ساتھ جبکہ کچھ اس لیبل کے بغیر ہی جسم فروشی کا کام کر رہی ہیں جس کی ذمہ داری یہ خود نہیں بلکہ معاشرہ ہے۔ جبکہ طوائف کو ہی معاشرے میں برائی پھیلانے کی جڑ خیال کیا جاتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ طوائف کو معاشرے میں بہت پست حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا دلدل ہے جس میں قدم رکھنے کے بعد عورتیں اس دلدل میں پھنستی ہی جاتی ہیں۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کی اگلی نسلیں بھی اس دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتیں۔ طوائف کے لیے سخت سے سخت سزائیں تو تجویز کی جاتی ہیں مگر اس کے لیے ایک بہتر زندگی دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کی وضاحت ڈاکٹر عصمت جمیل ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''یہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جو عورت اس میں ایک دفعہ داخل ہو جاتی ہے تو اس کی واپسی تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے کچھ توڈیرہ دار طوائفوں کی بیٹیاں ہوتی ہیں کچھ اغواء شدہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کچھ دور دراز غریب علاقوں سے خرید لی جاتی ہیں۔ کچھ خام کار لڑکیاں کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر گھر سے نکلتی ہیں پھر یہ عاشق حضرات انہیں کسی ہوٹل میں، کسی موڑ پر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ وہاں سے بکتی بکاتی کوٹھے پر پہنچ جاتی ہیں پھر ان خواتین کو باہر کی دنیا میں قبول نہیں کیا جاتا۔ وہ کبھی اس پیشے کو چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتیں کیونکہ ان سے وابستہ افراد انہیں چھوڑنے نہیں دیتے۔ ان سب کی آمدنی کا ذریعہ وہی ہوتی ہیں۔ ان کے مرد باہر کی دنیا کو قبول نہیں ہوتے۔ معاشرے کی ناپسندیدگی کے باوجود یہ کاروبار ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ جس سے معاشرے کے دوہرے معیار سامنے آتے ہیں۔''(۵۹)

عورت کو کسی بھی حیثیت سے دیکھا جائے۔ تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر عہد میں ہر روپ و حیثیت میں عورت ظلم و ستم کا شکار رہی ہے۔ سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ عورت کی زندگی ہر سیاسی فضا اور حالات پر اس حد تک اثر انداز ہوتی ہے کہ ان کی زندگیوں میں تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی حالت میں ہم سیاسی حالات کو انسانی زندگی سے جدا نہیں کر سکتے۔ پاکستانی عورت خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو، زندگی کو کسی نہ کسی حوالے سے ایک مجبوری اور سمجھوتے کی طرح نبھاتے اور اس کا بوجھ اٹھانے پر مجبور نظر آتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کے بغیر زندگی اور انسانیت کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ زبانی لحاظ سے ہر کوئی عورت کے بارے میں اچھے الفاظ اور خیالات کا اظہار کرتا ہے مگر عملی طور پر کوئی بھی اس کی عزت اور حیثیت کے لیے کوئی ٹھوس اور تعمیری اقدامات نہیں اٹھاتا۔ عورتوں پر ہر جگہ ظلم و ستم کیا جا رہا ہے اور عورتوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کو ان کے حقوق کس طرح دلوائے جائیں۔ تاکہ ان کو آزادی نصیب ہو اور معاشرے میں عزت و احترام کی زندگی گزاریں۔

حوالہ جات

۱۔ غلام اکبر ملک، عورت کا مقدمہ (اسلام کی عدالت میں)، لاہور، جنگ، پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

۲۔ ادریس آزاد، عورت، ابلیس اور خدا، لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶۵

۳۔ عبدالرحمٰن خان، ایم، عورت نسائیت کے آئینہ میں، شیخ اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۷۴ء، ص ۴۵

۴۔ مولانا سید جلال الدین انصر عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، لاہور پبلی کیشنز، طبع ہفتم، ۱۹۸۳ء، ص ۴۶

۵۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۴۴

۶۔ مولانا سید جلال الدین انصؔر عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، لاہور پبلی کیشنز، طبع ہفتم، ۱۹۸۳ء، ص ۴۶

۷۔ وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۲

۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی □، پردہ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، طبع ستائیس، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۴۔۱۸۵

۹۔ فریدہ وجدی آفندی، مسلمان عورت، (مترجم) ابوالکلام آزاد، لاہور، داتا پبلشرز، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء،، ص ۷۸

۱۰۔ جان سٹورٹ مل، عورتوں کی محکومیت، (مترجم) افتخار شیروانی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۳ء، ص ۹۹

۱۱۔ لیلیٰ احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، (مترجم) خلیل احمد، شغل، ۱۹۹۵، ص ۸

۱۲۔ بانو قدسیہ، حوّا کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۱۰

۱۳۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، (حصّہ ۱) کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۸۸ء، ص ۵۴۷۔۵۴۸

۱۴۔ رسول حمزہ وقوف، میرا داغستان، لاہور، آواز فاؤنڈیشن، برائے تعلیم، س۔ن، ص ۲۳

۱۵۔ لیلیٰ احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، (مترجم) خلیل احمد، شغل، ۱۹۹۵، ص ۹

۱۶۔ ادریس آزاد، عورت، ابلیس اور خدا، لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۶۹۔۲۷۱

۱۸۔ بانو قدسیہ، حوّا کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵

۱۹۔ کشور ناہید، (مرتب) عورت زبان خلقسے زبان حال تک، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء ص ۳۲

۲۰۔ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶، ص ۳۶۸

۲۱۔ The new Lexicon Websiter's Dictionary,P.942

۲۲۔ International Encyclopedia of social sciences,Volume13.14, London,1972, P.577

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۸۱

۲۴۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر، ہندو ضمیات، بیکن بکس ملتان، اشاعت اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۵۶۰

۲۵۔ جواہر لال نہرو، تلاش ہند، ص ۱۷

۲۶۔ القرآن، سورۃ البقرہ، ص ۴

۲۷۔ ایضاً۔

۲۸۔ جواہر لال نہرو، تلاش ہند، ص ۱۸

۲۹۔ رشید ملک، مضمون، ''انڈالوجی''۔ ''آریا اور آریائیت'' فنون لاہور، اپریل۔جون، ۱۹۹۱ء، شمارہ ۳۲، ص ۵۸

۳۰۔ افتخار شیروانی، عورتوں کی محکومیت، فیروز سنز لاہور، بار اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۹

۳۱۔ ایضاً، ص، ۹

۳۲۔ ایضاً، ص، ۱۳

۳۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاوس، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۶ء، ۳۴

۳۴۔ احمد خان، سر، سید، خطبات سر سید، (حصّہ دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۲۲۴

۳۵۔ پروفیسر وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۳۶۔ زاہد محمود، ڈاکٹر، گھریلو تشدد۔ وجوہات، اثرات اور انسداد، نگارشات لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۶، ۲۵

۳۷۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی اور زندان، دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی، ۲۰۴ء، ص ۱۰۷

۳۸۔ رشید، ہیٹیل، پاکستانی عورت کی سماجی و قانونی حیثیت، کل پاکستان انجمن، خواتین، (اپوا) کراچی۔ ۱۹۸۱ء، ص ۲۶

۳۹۔ ساجد علی، مقدمہ، اسلام جنسی تفریق اور اسلام، لیلیٰ احمد، مشعل لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۴۰۔ خالد علوی، ڈاکٹر، عورت کی معاشرتی حیثیت ایک جائزہ، ویمن انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ہیومینیٹیز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷

۴۱۔ فردوس حیدر، تاحال، دی ریسرچ فورم کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۷، ۱۵۸

۴۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹۳

۴۳۔ ادریس آزاد، عورت، ابلیس اور خدا، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۴ ۔ ۲۷۵

۴۴۔ رابعہ الربا، عورت، مصائب، وجوہات، نفسیات، دعا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۸

۴۵۔ خالد علوی، ڈاکٹر، عورت کی معاشرتی حیثیت ایک جائزہ، ویمن انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ہیومینیٹیز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص۱۳۸

۴۶۔ القرآن، النساء، ۴، ۳

۴۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۰

۴۸۔ جان سٹورٹ مل، عورتوں کی محکومیت، (مترجم) افتخار شیروانی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۳ء، ص۱۰۳، ۱۰۴

۴۹۔ ارشاد احمد، پنجابی، پنجاب کی عورت، (حیات و ثقافت)، الفیصل لاہور، س۔ن، ص ۴۴۰

۵۰۔ عارفہ سید، ڈاکٹر، خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے، مشہولہ عورت زبان خلق سے زبان حال تک، (مرتبہ) کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۲۶۸

۵۱۔ ثمر فاطمہ مسعود، ڈاکٹر، مشعل راہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۲۶۲

۵۲۔ ذاکر نائیک، ڈاکٹر، مسلمان عورت مظلوم نہیں خوش قسمت، (مترجم) سید خالد جاوید مشہدی، یکن بکس ملتان، ۲۰۰۹ء، ص۲۷

۵۳۔ فاخرہ تحریم، عورت کا المیہ، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۵۸، ۵۹

۵۴۔ کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط، زائیدہ بیٹی کے سنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰

۵۵۔ ارشاد احمد، پنجابی، پنجاب کی عورت، (حیات و ثقافت)، الفیصل لاہور، س۔ن، ص ۴۴۰

۵۶۔ وی۔ پی۔ سی سوری۔ ڈاکٹر، اردو فکشن میں طوائف، ادارہ فکر جدید دہلی، س۔ن، ص۲۶

۵۷۔ ایضاً، ص۲۳

۵۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاوس، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۶ء، ص ۴۴۰

۵۹۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور عورت، شعبہ اردو زکریا یونیورسٹی ملتان، ص ۸۰

باب دوم:

پی ٹی وی طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں عورتوں کے بنیادی حقوق کی عکاسی

یہ ایک بہت بڑاانسانی المیہ ہے کہ ہم نے زندگی اور سماج سے متعلق تقریباً تمام عناصر کے بارے میں علم حاصل کیااور سب کواپنے اپنے مقام پر رکھ کر صحیح قدر و منزلت سے نوازا، مگر جو خود کائنات ہے اس ہستی کو یا تو گم کر دیا یا فراموش کر دیا۔

یہ دائمی ہستی عورت کی ہے۔یہ کس قدر بے حسی اور معاشرے کی روایتی جاہلیت ہے کہ اس عظیم خاتون کو فطرت اور قدرت نے جو بنیادی حقوق عطا کیے ہیں وہ بھی ہم نے چھین لیے۔ہمیں اس مخلوق کی ذمہ داریوں اور فرائض کا خوب پتہ ہے مگر ان کے بنیادی حقوق اور مسائل کیا ہیں، وہ ہم کو یاد نہیں ہیں۔

عورت دن رات کام کرتی ہے, محنت مشقت کرتی رہتی ہے, خدمت اور وفاداری میں لاثانی ہوتی ہے, نگرانی اور تیمارداری میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے اور گھر اور گھرانے و چادر اور چاردیواری کی حفاظت اور تعمیر میں اپنی زندگی نچھاور کرتی ہے مگر ہمارا سماج اس بے مثل کردار کی صحت، تعلیم اور دیگر ابدی امور اور حقوق سے آگاہ نہیں ہے۔بے شک یہ عورت صحت کے حوالے سے مر رہی ہو، غربت کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہو، جہیز کے نام پر نیلام ہو رہی ہو، اظہار رائے کے سلسلے میں وہ لاکھ ہتھکنڈوں میں قید ہو، پردے کے سلسلے وہ جیتے جی مرتی جاتی ہو، امتیازی سلوک سے وہ اور اس کی شخصیت نیست و نابود ہو رہی ہو، اور خاص کر غیر انسانی رویوں سے وہ روز روز فنا ہو رہی ہو، مگر کسی کو بھی فکر نہیں ہے۔اور یوں اس بے فکری، بے حسی، طوائف الملوکی، انانیت اور اجارہ داری سے انسان و انسانیت آہستہ آہستہ مٹ رہا ہے۔

یہ اصول بھی ہے، تقاضائے بشری بھی ہے اور مصلحتِ ماحول بھی، کہ جہاں حقوق کی بات ہو گی تو وہاں فرائض کو بھی ضرور بیان کرنا ہو گا۔اگر ہم کسی ایک کردار کی اہمیت کو لازمی قرار دیتے ہیں تو باقی افراد کو بھی ٹھیک ٹھاک عزت و مرتبے سے نوازا جائے گا تب ہی اجتماعی فکر کو جلا نصیب ہو گی اور ہر نفس مطمئن اور اپنی جگہ پر نہایت خوش اسلوبی سے آگے اور ترقی کی جانب قدم اُٹھائے گا۔وصال کیا ہے؟ سنجوگ کسے کہتے ہیں؟ ہم اور اجتماعیت کے صیغے کیوں ہیں؟ گھر و چاردیواری کس لیے ہے اور انسان و انسانیت کی بقا کس طرح ممکن ہے؟ ایسے بہت سے سوالات پر سوچا جا سکتا ہے اور باقاعدہ تحقیق کر کے جہاں اور نتائج نکل سکتے ہیں، وہاں یہ حاصلات بھی ظہور پائیں گے کہ مساوات اور انصاف کے ساتھ اشرف مرتبے و مقام کا پاس رکھنا بہت مقدم و مقدس ہوتا ہے کہیں جا کر گھر و گھر داری، آبادی و مملکت، ارد گرد و ماحول، معاشرہ و

و قوم اور عام و خاص لوگ و گروہ محفوظ بھی ہوں گے اور آئے روز خاطر خواہ ترقی سے ہم کنار بھی ہوں گے۔

اگر اس زمین پر عورت کو صحت کے بنیادی سہولیات فراہم نہیں ہوں گی اور وہ اس کی نابودگی کی وجہ سے روز روز مرتی و زلیل ہو تو واقعی بگاڑ کی شکلوں میں دن بہ دن اضافہ ہوگا اور اسی عورت کو کائناتی طور پر جو مقام ملا ہے وہ ہر سطح پر پامال ہو کر رہ جائے گا۔ کیا اس خاک و مٹی پر صرف مردوں کا حق ہے، کیا غربت کی ذمہ دار صرف ایک بے چاری عورت ہے، اس بنیادی اور زمینی حقیقت کو صرف عورت کے کھاتے میں ڈالنا ایک انسانی سوچ ہو سکتی ہے، کیا غربت کی پیدائش ایک عورت کی وجہ سے ہے اور آخر ایک عورت کے ساتھ غربت کا ہونا ایک گالی ہے کہ وہ اس کے ہونے سے بہت ضعیف تصور کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ جو چیز ایک انسان کو بشری تقاضوں سے وصال عطا کرتا ہے اور اس صداقت و غیر صداقت میں امتیاز کرنے کی قوت فراہم کرتا ہے، وہ بھی صحیح معنوں میں پاکستانی عورت کو حاصل نہیں ہے۔ یہ بات تعلیم کے متعلق کی جارہی ہے کہ ایک عورت کو بعض نام نہاد باتوں اور دیگر رویوں کی وجہ سے واقعی تعلیم کی دولت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ پاکستانی ڈراما نگاروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اگر ایک طرف عورت کے حوالے سے جہیز کی لعنت اور اظہار رائے پر روک تھام کے معاملے کو خوب اجاگر کیا ہے تو دوسری طرف امتیازی سلوک اور رویے سے جس طرح ایک عورت کی حیات کو تماشا بنایا گیا ہے، اس پر خوب قلم اُٹھایا ہے۔

ویسے تو ملکی سطح پر دیگر اداروں اور ذمہ داروں نے بھی پاکستانی عورت کے بنیادی حقوق کی فراہمی اور تمام سماجی مسائل کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے مگر میڈیا کے حوالے سے پاکستانی ٹیلی وژن ایک بنیادی ترجمان اور عکاس قومی ادارہ ہے جس کے زریعے پاکستان کے چوٹی کے ادیبوں اور فن کاروں نے عورت سے منسلک تمام تر بڑے چھوٹے مسائل کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس بارے میں ایک اختیار سربراہان پر واضح کیا گیا ہے کہ جب تک ہم ایک عورت کو بنیادی حقوق فراہم نہیں کریں گے اور ان کو درپیش مسائل کے حل کے لیے قانونی اور آئینی راہ نہیں اپنائیں گے تب تک ہم اور ہمارا ملک وطن صحیح معنوں میں ٹھوس اور جامع ترقی سے خوگر نہیں ہو سکتا ہے۔

پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں ادیبوں اور دانش وروں نے اس موضوع پر انتہائی اہم ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ جن میں اشاروں کنایوں اور کھل کر ان عنوانات و موضوعات پر زرین خیالات کو عملی وڈرامائی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ بے شک بعض ڈراموں اور کھیلوں میں انتہائی سخت انداز سے ان حقائق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر ذرا فکر سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن اور ڈرامہ نویسوں کی کاوشوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ڈرامے دیکھنے اور غور کرنے پر خوب علم ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں کی عورت کن کن حقوق سے

بے علم ہے اور ہماری دوہری نظام و سوچ سے کس قدر بنیادی مسائل کی شکار ہے۔ اگر اس سلسلے میں بر وقت آئینی اور قانونی اقدامات اٹھائے گئے اور خاص کر فطرتی و قدرتی اصولوں اور ضابطوں کو عملی صورت دی گئی، تو بہت حد تک عورتوں کو بنیادی حقوق حاصل ہو جائیں گے اور ان کو در پیش مسائل کافی حد تک ختم ہو جائیں گے۔

(ا) مسئلہ غربت:

اشفاق احمد نے ۱۹۸۲ء میں طویل دورانیے کے ڈراموں کے سلسلے میں ایک قدیم و پرانے موضوع کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے پیش کیا۔ یہ کھیل ''فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی''، ہمارے معاشرے کی طبقاتی تقسیم پر سادہ اور عام فہم ہونے کے باوجود ایک مؤثر تنقید کی صورت ہے۔ فہمیدہ ایک غریب بیوہ کی بیٹی ہے۔ اس کی ماں اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اپنا مکان نہ ہونے کی وجہ سے دونوں ماں بیٹی کرائے کے مکان میں رہتی ہیں۔ مالک مکان ایک امیر کبیر آدمی ہوتا ہے۔ فہمیدہ ایک بہت ہی حساس اور معصوم لڑکی ہوتی ہے۔ وہ اپنی غربت کو اس پر کیا گیا تقدیر کا ایک بہت بڑا ظلم تصور کرتی ہے اور یہی احساس کمتری اسے دیمک کی طرح کھا جاتا ہے اور وہ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ مالک مکان پر فہمیدہ کی ماں اپنی بیٹی کے قتل کا مقدمہ دائر کرتی ہے۔ دیکھا جائے تو اس مقدمہ کی مدعی فہمیدہ کی ماں اور مدعا علیہ مالک مکان نہیں بلکہ تمام تر امیر لوگ اس کے مدعی اور بورژوا انفرادیت میں اجتماعیت کا رنگ بھر کے اشفاق احمد نے فہمیدہ کی کہانی کو آفاقی بنا کر امر کر دیا۔

بانو قدسیہ کا شمار اردو کی معتبر ڈراما نگار خواتین میں ہوتا ہے۔ ناول، افسانہ یا ڈراما ہر صنف ادب میں مہارت اور فنی چابک دستی کا برملا اظہار کیا۔ ان کے ڈراموں میں پیش کردہ کہانی کا موضوع جائے وقوع پاکستان ہے۔ خاص طور پر پاکستان کی وہ نوجوان نسل جو برصغیر کے بعد پیدا ہوئی۔ ان کے موضوعات زیادہ تر ان نوجوانوں کے ذہنی اور جذباتی پیچیدگیوں اور روحانی اضطراب پر مشتمل ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو معاشرہ پروان چڑھا۔ اس کی جڑیں کھوکھلی تھیں۔ اس کی بنیاد صرف و صرف مادیت پر رکھی گئی۔ نتیجے کے طور پر حساس ذہن رکھنے والے انسانوں کے اندر روحانی اضطراب اور ذہنی کشمکش کی کیفیت پیدا ہوئی۔ انسانی وجود کے جن عوامل کا بانو قدسیہ نے احاطہ کیا، وہ مغرب میں دوسری جنگ عظیم کے بعد اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد برصغیر پاک و ہند میں انسانی وجود کے مسائل تھے۔ جب نوجوان نسل مادیت پرستی کی رنگینیوں میں تحلیل ہو گئی تو یہ مادہ پرست نسل اپنی پہچان اور شناخت دولت کے بل بوتے پر کرانے کی طرف متوجہ ہو ئی۔ ان میں زیادہ تر نوجوان لڑکیاں شامل تھیں۔

ڈرامہ آنکھ مچولی ۱۹۸۴ء کے سلسلے کا ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ جس میں مرکزی کردار سیما ایک دیہاتی ان پڑھ، بے شمار مسائل کے ریلے میں بہہ جانے والی ایک غریب گھرانے کی لڑکی کی روداد بیان کی گئی ہے۔ جس کی پوری زندگی غربت

سے مقابلہ کرتے کرتے گزر جاتی ہے۔اس ڈراما کی کہانی کچھ یوں ہے کہ سیما نامی لڑکی مرکزی پنجاب کے ایک غریب گاؤں سے تعلق رکھتی ہے۔والد ہر وقت بیمار رہتا ہے۔دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی ہے۔اس کا ایک ہمسایہ،،جسمانی طور پر ہٹا کٹا ایک خوبرو اور خوبصورت نوجوان جو وادی سوات سے تعلق رکھتا ہے ،سیما کے دل میں گھر کر لیتا ہے مگر مشرقی لڑکی کی طرح سیما اس سے کبھیا اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتی ہے۔روشن خان کسی کام کی غرض سے اس گاؤں آیا تھا۔کام ختم کرنے کے بعد واپس چلا جاتا ہے۔جس کا سیما کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کافی عرصہ سے سیما کے والد ذریعہ معاش کے سلسلے میں شہر کا رخ کرنا چاہتے تھے مگر سیما نہ جانے کو بضد تھی مگر روشن خان کے جانے کے بعد سیما کا گاؤں سے دل بھر جاتا ہے اور وہ خود ہی والد کو گاؤں چھوڑنے کا مشورہ دیتی ہے۔جب سیما اور اس کے والد شہر پہنچتے ہیں تو خوش قسمتی سے اس کی ملاقات روشن خان سے ہو جاتی ہے۔جو ایک اسکول میں چوکیدار کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔زندگی کے ایک موڑ پر پھر روشن خان اور سیما مل جاتے ہیں۔دونوں کی زندگیاں سختیاں جھیلنے اور مشکلات سے برسرپیکار ہیں۔

روشن خان سیما کے والد کی شدید بیماری اور مالی مشکلات کو دیکھتے ہوئے سیما کو اپنے ساتھ اسکول میں چپڑاسن بھرتی کر دیتا ہے۔والد کی خدمت کے ساتھ ساتھ سیما اسکول کا کام بھی اچھی طریقے سے نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔

حالات کا رخ بدلتا ہے۔سیما کے سپنوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔غربت کے علاوہ رنگ و نسل کے تفرقات روشن خان کو سیما سے جدا کر دیتے ہیں۔روشن خان سیما کو زندگی بھر کی احساس محرومی دے جاتا ہے۔جب وہ اسے اپنے گاؤں کی عورتوں کی خوبصورتی کے بارے میں بتاتا ہے۔سیما جیسی معصوم، مخلص اور دل سے محبت کرنے والی لڑکی ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔جب روشن خان گاؤں کی عورتوں سے اسے کمتر جانتا ہے۔دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو دیکھیں۔

> ''روشن خان:(خالص پٹھانوں والا لہجہ)بس جی،تم ہمارا ملک غور سے دیکھو تو تمہارا آنکھیں دنگ رہ جائے اللہ کے فضل سے۔اور عورتیں۔۔۔۔۔اف ،سپیپنی ستر گے مطلب نیلا آنکھیں،یکدم سفید۔تمہارا جیسا رنگ تو نہیں ہے۔کہ رات میں دیکھو تو آدمی ڈر جائے۔
>
> سیما:(بہت ہی اداس لہجے میں)آہ بھر کر،یہ تو بنانے والے کی مرضی ہے روشن خان (ذرا ٹھہر کر)
>
> جیسے اس نے بنادی شکل بنادی۔(آہ بھر کر)کوئی اپنی بس کی بات تھوڑی ہے۔''(۱)

اس طرح روشن خان اپنے رشتہ داروں کی خوبصورتی کا ذکر کرتا ہے اور سیما سے کہتا ہے۔ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔ تمہارا اور میرے گاؤں کی لڑکیوں کا کوئی برابری نہیں۔ وہ اسے یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ وہ ان لڑکیوں کے پاؤں دھونے کے بھی قابل نہیں ہے۔ اس طرح یہ پتھر دل انسان اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اب اس کے لیے کسی بھی مرد میں دلچسپی نہ رہیا ور وہ زندگی سے بیزار ہو کر وقت پر اپنا آپ ڈال دیتی ہے۔ سیما اپنے والد کے ساتھ ایک بار پھر گاؤں واپس آتی ہے۔ والد کے اصرار پر ایک مراثی سے شادی کر لیتی ہے۔

اس ڈرامے کا سب سے اہم پہلو غربت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ ایک لڑکی کے سپنے غربت کے سبب کبھی بھی پورے نہیں ہوتے ہیں۔ دیہی آبادی کا نصف حصّہ ایسا ہے جو زندگی کے مقصد سے بے خبر خاموشی سے جیئے جارہا ہے۔ دیہی عورتوں کے دکھوں کی بنیاد اس کا عورت ہونا ہے۔ جب عورت کو بچی پیدا ہونے پر منحوس کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ مردانہ حاکمیت، مجازی خدا اور اس کو راضی رکھنے پر ساری اخلاقیات اور مذہبیات کا دائرہ بنا دیا جاتا ہے۔ سیما کو ایک مراثی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک عام شکل و صورت رکھنے والی غریب لڑکی ہے۔ اس کا پہلا جرم کہ وہ غریب گھر میں پیدا ہوئی اور دوسری بڑی پیدائشی غلطی کہ اللہ نے اسے گوراچٹہ، خوبصورت نہیں بلکہ عام سی شکل و صورت کے ساتھ پیدا کیا۔

ہر مرد جبر، طاقت اور خوف کی علامت بن کر شعوری یا غیر شعوری طور پر عورت کے سامنے آتا ہے۔ معاشرے کا اس قدر خوف ناک نقشہ کھینچا جاتا ہے کہ ناانصافیوں اور ظلم واستبداد کے باوجود عورت اس عزیت گاہ جسے گھر کا نام دیا جاتا ہے، میں ہمیشہ رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ شادی کا فیصلہ سیما اپنے والد کے کہنے پر کرتی ہے لیکن دراصل اس طرح وہ اپنی ذات کو اذیت دینا چاہتی ہے۔ روشن خان جب سیما کا ہمسایہ تھا تو دن بھر سخت جسمانی محنت و مشقت کرتا تھا۔ اور رات کو بینجو بجا کر سوتا تھا۔ روشن سیما کے لیے چاند تاروں سے تعلق رکھنے والا اور مردانہ جاہ و جلال کا مالک شخص تھا۔ جب سیما چھپ کر دیوار پر چڑھ کر روشن خان کو دیکھتی تو وہ اس پر غصّہ ہوتا اور سخت لہجے میں باز آنے کو کہتا تھا۔ یہی مردانہ وجاہت اور محنت کی خصوصیات سیما کسی مرد میں دیکھنا چاہتی تھی جو اس کا ہمسفر بنے۔ مگر تقدیر اسکو ایک متضاد عادات کے مالک شخص سے بیاہ دیتی ہے۔ شوہر کا ڈھول کی تاپ پر ناچنا اسے دیمک کی طرح کھائے جارہا تھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد وہ مسلسل بیمار رہ کر وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہے۔

محنت کا شدید احساس، ایمانداری، خود اعتمادی، خلوص جیسے اوصاف سیما جیسی دیہی لڑکی میں پیدائشی نمو پا چکے تھے۔ مگر چونکہ عورت کی آزادی، خود مختاری مرد کی حسبِ منشاء اجازت کی مرہون منت ہے۔ عورت کے لیے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے اور تبدیلی لانے کے مواقع غیر محسوس حد تک معدوم ہیں۔ سیما کو بہت مشکل سے اسکول میں

چپڑاسن کی نوکری ملتی ہے اس پر اپنے بیمار والد سے اجازت لے کر جاتی ہے۔ چپڑاسن کی نوکری چھوڑنے کے بعد سیما گھر کا چولھا جلائے رکھنے کے لیے تندور کا کام شروع کرتی ہے۔ جہاں پر اسے مختلف اقسام کے مردوں کی گندی باتوں کا ہر وقت سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو ان کے مصائب اور مشکلات میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔ والد کی خدمت گھر کی دیکھ بھال اور تندور کا کام دوہرے بوجھ سیما برداشت کرتی ہے۔ نفسیاتی طور پر دونوں پلڑوں کے بیچ کھڑے ہو کر دونوں کیفیتوں میں بھرپور فرد کا کردار ادا کرتی ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہے۔

> ''مسلم تہذیب میں عورت کمزور، ورغلائے جانے اور ترغیب میں آجانے والی اور مرد کی حفاظت کے بغیر زندہ نہ رہ سکنے والی مخلوق ہے۔ اسی معاشرے میں عورت بہت نازک اور معصوم بھی قرار دی جاتی ہے۔ اور یوں چار دیواری سے لے کر، پردہ اور مرد سے الگ رکھنے کا فلسفہ، اس کے تحفظ کے اعلانات کا حصّہ ہے۔''(۲)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ڈراما عورت سے متعلقہ مختلف سماجی مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ جس میں بہت بڑا مسئلہ غربت کا ہے۔ غربت کی وجہ سے لڑکیوں کو معاشی بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ وہ چاہے کتنی بھی محنتی کیوں نہ ہوں، ان کی محنتانہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ اس کی کمائی کو معاشرہ غلط نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جوان ہو کر مختلف پیشوں سے جو سماج نے صرف مرد کے لیے مختص کر دیئے ہیں، ان کاموں کا عورت کا کرنا معاشرے کی نظر میں ایک بُرا فعل ہے۔ جیسے سیما کا تندور پر روٹی پکانا، اور وہاں پر طنزیہ جملوں اور غلط نظروں کا سامنا کرنا، اسکول میں چپڑاسن کی نوکری کے دوران اس سے استعداد سے زیادہ کام لینا، صفائی ستھرائی کے علاوہ اسکول کے باقی کام کروانا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا مسئلہ عورت کی شادی کا تعین ذات پات اور رنگ و نسل کے معیار پر کرنا ہے۔ سیما کا قصور کہ وہ ایک سانولے رنگ کی لڑکی ہے اور غریب گھرانے سے بھی تعلق رکھتی ہے، کی وجہ سے ٹکرائی گئی۔ یہی احساس کمتری اسے ذہنی طور پر خواب دیکھنے سے مفلوج کر دیتی ہے۔ وہ اس گناہ کی سزا میں خود کو عمر بھر قصور وار ٹھہراتی ہے جو اس کا ناکردہ گناہ ہے۔

عورتیں اکثر اوقات مختلف حالات و واقعات کے زیر اثر احساس برتری کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔ جس کی مثال اسکول کی ایک استانی کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ وہ ایک اثر و رسوخ والی گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مغرور عورت ہے۔ وہ بچوں کو سبق تو کسب حلال کا پڑھا رہی ہے مگر کمرہ جماعت میں بیٹھ کر تدریس کے اوقات میں بچوں سے لاپرواہ اون کا بنیان سی رہی ہے۔ جب سیما اس کے قول و فعل میں تضاد دیکھتی ہے تو طنزیہ نگاہوں سے دیکھ اور دل میں افسوس کر کے وہاں سے چلی جاتی ہے۔

نصف صدی سے پہلے بنایا ہوا یہ ڈراما آج کے دور میں بھی دیکھا جائے تو کل اور آج میں اتنا بڑا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ترقی کے اس دور میں ہم آج بھی وہیں کی وہیں کھڑے ہیں جہاں نصف صدی پہلے تھے۔ ماضی اور حال میں ہم کوئی بھی بڑی اور اچھی تبدیلی نہ لا سکے بلکہ مسائل و مصائب دن بہ دن نت نئی شکلوں میں ہمارے سامنے ظاہر ہو رہے ہیں۔

(ب) اظہار رائے کا مسئلہ:

بانو قدسیہ کا لکھا ہوا ڈرامہ امر بیل میں ایک ایسے گھرانے کو ظاہر کیا گیا ہے جو تین افراد پر مشتمل ہے۔ ایک والد نواز، ماں اور بیٹی زری خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں۔ اس گھرانے کا ایک بہت قریبی دوست آصف کثرت سے یہاں آتا جاتا ہے جس کو زری انکل کہتی ہے۔ آصف ایک سینئر کردار ہے جو کہ نواز سے بھرپور دوستی اور محبت رکھتا ہے
۔ وہ اپنی بیوی ماہ رُخ کے ساتھ الگ گھر میں رہتا ہے اور اولاد کوئی نہیں ہوتی۔ ان دونوں کی آپس میں بنتی نہیں ہے کیونکہ شوہر آصف آفس کے کاموں اور بیوی ماہ رخ مختلف فنکشنز اور سیمینارز میں مصروف رہتی ہے، نواز، اس کی بیگم اور بیٹی زری ہر وقت آصف آصف کرتی ہے اور وہ بھی زیادہ وقت اس گھرانے کے ساتھ گزارتا ہے۔

آگے کے مناظر میں میاں بیوی کے تعلقات اشاروں اور باتوں باتوں میں دگرگوں ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف زری بڑی اور بالغ نظر ہو کر ہر وقت آصف انکل کی منتظر رہتی ہے۔ یوں وہ خود میں بے چینی اور بے قراری محسوس کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ آصف ہی اس کے خوابوں کا شہزادہ ہے۔ پس وہ آصف سے اظہار محبت کے لیے کنایوں اور اشاروں میں بات شروع کرتی ہے۔ وہ گھر میں الگ اور چُپ رہنے لگتی ہے۔ اس کے گھر والے پریشان رہتے ہیں اور آصف سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اب آصف کافی پریشان ہو جاتا ہے مگر نواز کے اصرار پر وہ کمرے میں جا کر زری سے ملتا ہے۔ وہ اس کو سمجھاتا ہے کہ میں اس کے باپ کا دوست ہوں اور اس کے والد کی عمر کا ہوں مگر وہ نہیں مانتی، آصف کہتا ہے کہ وہ میری گود میں جوان ہوئی ہے اور میں تمہارا انکل ہوں مگر زری روتی رہتی ہے کہ مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو اور پھر طلاق دو مگر ساتھ مت چھوڑنا اور انکار بھی نہ کرنا۔ آصف بھی غصہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میں یہ ملک ہی چھوڑ کے چلا جاتا ہوں اور اس کے کمرے سے نکلتا ہے۔

آخری منظر میں زری خود کو گولی مارتی ہے اور یوں قصہ تمام ہو جاتا ہے۔ ماں باپ روتے رہتے ہیں اور زری کے اس اقدام اور موت پر چیختے چلاتے ہیں۔ دوسری طرف آصف تنہا اپنے کمرے میں زری کو یاد کرتا ہے اور بہت بوڑھا اور ضعیف ہو کر بس زری کی باتوں اور یادوں کے ساتھ خیالی گفتگو کر کے وقت گزارتا ہے۔

بانو قدسیہ نے اس ڈراما میں تین عورتوں اور دو مردوں کو دکھایا ہے۔ ان کرداروں میں ایک مردانہ مرکزی کردار آصف اور زنانہ بنیادی کردار زری کا ہے۔ اولین حصے میں آصف کی بیوی ماہ رخ وہ ضمنی کردار ہے جو شوہر کی طرف

صحیح اور ٹھیک ٹھاک توجہ نہ ہونے سے مختلف مسائل کی شکار ہے۔ وہ تنہائی محسوس کرتی ہے، زیادہ تر غیر محفوظ تصور کرتی ہے۔ یہ اکثر معاشروں میں ہوتا ہے کہ شوہر حضرات ان امور اور کاموں کو زیادہ توجہ دیتے ہیں جن کا حاصل کرنا یا جن کا ہونا وقتی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود یہ لوگ لگے رہتے ہیں اور اصل اقدامات یا موجودات کو بھول جاتے ہیں اگر شوہر اپنی بیوی کو بنیادی توجہ اور مقررہ وقت نہیں دے گا تو ظاہر ہے کہ وہ خود کو عارضی تسلیم کرلے گی اور زندگی گزارنے کے لیے دیگر سہاروں کی طرف چلی جائے گی۔ اس عمل سے گھریلو زندگی بگڑ جاتی ہے اور تمام کردار غیر انسانی اور غیر حقیقی افعال میں پڑ کر انفرادی و اجتماعی حیات کو کمزور کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اس عمل سے نسلوں کی گم شدگی اور گمنامی کا خطرہ بھی لاحق ہوتا ہے۔ آصف اور بیگم کی زندگی بھی خوشی اور خوشحالی سے کافی دور دکھائی دیتی ہے۔ نواز کی بیگم اپنی حیثیت اور اہمیت سے بے خبر ہوتی ہے۔ وہ بس شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور بیٹی زری کی صحیح تعلیم و تربیت سے لاعلم ہوتی ہے۔ آصف ہر وقت اس کے گھر، شوہر اور بیٹی کے ساتھ حاضر ہوتا ہے اور وہ خود بھی ہنس ہنس کر شہ دیتی رہتی ہے۔ بس ایک ماں کی علمی اور اخلاقی نظر سے یہ خاتون بے بہرہ ہوتی ہے اور یوں اس کا گھر بظاہر خوشیوں کا گہوارہ ہوتا ہے مگر اندر اندر سے آگ سے پیوستہ ہوتا جاتا ہے۔ اس ظاہری اعتماد اور اصل میں بیٹی کو بنیادی توجہ نہ دینے سے یہ خاندان بہت جلد خون کے آنسو روتا ہے۔

مرکزی کردار زری کب بڑی ہوتی ہے اس کا عمل ورد عمل کیا ہے، اس کی پسند و ناپسند کیا ہے، اس کی سوچ و فکر کیا ہے۔ اس کے لیے کیا کیا اہم ہیں اور کیا کیا غیر اہم ہیں، وغیرہ وغیرہ، اس بارے میں والدین نہیں سوچتے ہیں اور یوں وہ خود سر بن جاتی ہے۔

دراصل لڑکیوں کے بنیادی حقوق میں سے تعلیم و تربیت، اظہار رائے اور بر وقت پردے کی حقیقت مسلم ہے۔ بدقسمتی سے اس ڈرامے کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جب زری کے والدین کی طرح تمام والدین علمی، تعلیمی اور تربیتی امور میں تمام عناصر اور خاص کر بچیوں کا صحیح خیال نہیں رکھتے اور نگرانی کے عمل کو وقت پر سرانجام نہیں دیتے تو پھر واقعی منفی نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ اسی طرح زری کی طرح پردے کا خیال نہیں رکھا جاتا اور خاص کر بچیوں کو اظہار رائے کا حق میسر نہیں ہوتا تو لڑکیاں وقت سے پہلے اور مختلف اوقات میں آنکھیں دکھانا شروع کرتی ہیں اور بعض بچیّاں گھٹ گھٹ کر مرتی ہیں۔ بے چاری خواتین زیادہ تر اس طرح بنیادی حقوق سے محرومی اور مسائل میں گرفتار ہیں۔ کیا ایک عورت انسان نہیں ہے اور کیا ایک بچی ایک جیتی جاگتی مخلوق نہیں ہے، پھر کیوں اس حسین بشر کو فطری اور سماجی حقوق مہیا نہیں ہیں اور کیوں ایک ایسے دلدل میں ڈوب رہی ہے جس سے اس کے ہونے یا فعل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس ڈرامے میں جس طرح زری خودکشی کرتی ہے اور اپنی زندگی ہارتی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ وہ تو معصوم اور پاک ہستی ہے جو جذبات واحساسات رکھتی ہے مگر یہ ظالم معاشرہ اور بے حس سماج اس کو جینے نہیں دیتا اور یوں بے بسی کی موت کو گلے لگا کر ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے۔

ضروری ہے کہ ہم لوگ اپنی بیٹیوں اور بچیوں کو بنیادی حقوق سے محروم نہ کریں اور اُن کو ان مسائل میں غرق نہ ہونے دیں جن کا ان سے کوئی دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔ بانو قدسیہ کے اس ڈرامے میں اشاروں کنایوں میں جہاں اور کچھ دکھایا گیا ہے یہ تاکید بھی کی ہے کہ بچیوں کو صحیح توجہ دیں۔ ان کو قدرتی آزادی دیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی نگرانی کریں۔

ڈراما ''آسمانی جوڑا'' میں مزاحیہ انداز میں مغرب میں پروردہ دو مختلف ذہنیت کی مالک لڑکیوں کی شادی جیسے مسئلے پر آزادانہ رائے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ہمارے سماج میں آزادانہ فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ کیا وہ بھی کسی مرد کو اپنی مرضی سے قبول یا انکار کر سکتی ہے۔ اپنے اس بنیادی حق کو حاصل کرنے میں ان عورتوں کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا سماج عورت کو اپنی مرضی سے شادی کرنے پر اس کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوال اس ڈرامے کو دیکھ کر ہمارے اذہان کو اس اہم مسئلے کی طرف مدعو کرتے ہیں۔

ڈرامے کی کہانی یوں ہے کہ دو بہنیں چڑیا اور گڑیا جن کا تعلق پاکستان ہے، اور مغربی ممالک میں پلی بڑھی ہیں، واپس آکر والدین کی خواہش پر پاکستان میں اپنی مرضی سے شادی کرنے کی خواہشمند ہیں۔ یہ دونوں بہنیں امریکہ کی شہریت رکھتی ہیں۔ پاکستان آکر یہ دونوں اپنے والدین کے ساتھ پھوپھی کے گھر رہنے لگتے ہیں۔ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ بڑی بیٹی خالص اپنی مرضی سے رشتہ کرنا چاہتی ہے۔ اس غرض سے کئی لوگ رشتہ کرنے آتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک ادھیڑ عمر جاگیر دار تشریف لاتا ہے جن کے سندھ کے کئی شہروں میں بڑے بڑے ہوٹل و ریسٹورنٹ ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے بھی انہوں نے دو شادیاں کی ہوتی ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شہر میں قیام کرنے کے لیے وہاں عورت کے روپ میں ایک کھلونا موجود ہو جو اس کی بیوی کہلائے۔ وہ امریکہ بھی اپنے قیام کے لیے امریکہ شہریت رکھنے والی ایک لڑکی سے شادی کا خواہشمند تھا۔ لیکن چونکہ یہ رشتہ لڑکی چڑیا کی شرائط کے مطابق نہیں تھا اس لیے ناکام رہتا ہے۔

دوسرا رشتہ ایسے سادہ اور کم عقل نوجوان کا آتا ہے جس پر محض امریکہ جانے کا بھوت سوار ہے۔ اور وہ کسی طرح باہر جانا چاہتا ہے۔ لڑکی ان کے سامنے بھی اپنی شرائط، جیسے جھاڑو لگانا، برتن دھونا، سودا سلف لانا وغیرہ بیان کرتی ہے۔ لڑکے کی ماں یہ سارے شرائط ماننے کے لیے تیار ہو جاتی ہے مگر لڑکی کو یہ رشتہ بھی پسند نہیں آتا۔

دوسری طرف اس کی چھوٹی بہن گڑیا جو مغرب میں رہتے ہوئے بھی مشرقی خیالات کی مالک تھی، اپنی مرضی اور پسند کے لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ پھوپھی کے بیٹے میں جو اس کی طرح خیالات رکھتا تھا اور مشرقی اقدار کا پاس دار تھا اس سے شادی کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔ اس طرح دونوں کے رشتے کی بات بلا کسی تردود کے پکی ہو جاتی ہے۔

بڑی بہن ریڈیو کے ایک میزبان کی باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیالات چڑیا سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے اس کو گھر بلایا جاتا ہے اور اس کے سامنے بھی شرائط پیش کی جاتی ہیں۔ لڑکا بے چوں وچرا شرائط کو ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لڑکی اس بات پر اعتراض کرتی ہے کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے ساری باتیں کیوں مان لی ہے لہٰذا اس کو بھی شادی سے انکار کیا جاتا ہے۔

کچھ دنوں بعد چھوٹی بہن گڑیا کی منگنی کے دوران وہ لڑکا دوبارہ آتا ہے اور اپنے رشتے کی بات کرتا ہے۔ وہ چڑیا سے کہتا ہے کہ میں نے اس رشتے کے بارے میں بہت سوچا اور میں اس بات کے لیے تیار ہوں جو آپ کی شرائط ہیں۔ کیونکہ جو خوبیاں یا باتیں مجھ میں نہیں ہے میں اس کے لیے آپ کو بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ اس طرح دونوں کی مرضی سے یہ رشتہ طے ہوتا ہے۔ لڑکی لڑکے کو منگنی کی انگوٹھی پہناتی ہے اور ڈرامہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

اس ڈرامے میں دو مختلف عادات رکھنے والی لڑکیوں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان کرداروں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا مردوں کی طرح ہمارے معاشرے میں شادی کے معاملات میں اپنی مرضی، پسند ناپسند کا کوئی حق حاصل ہے یا نہیں، کیا لڑکیوں کو وہ بنیادی حقوق حاصل ہیں جو ان کا بنیادی حق ہے۔ اور ان حقوق کو حاصل کرنے میں ان کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ اس لڑکی، عورت کو وہ آزادی دیتا ہے کہ یہ لڑکیاں، بیٹیاں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کریں؟ کیا ایک مرد کی طرح وہ بھی کسی فرد یا شوہر کے سامنے اپنی خواہشات پہلے سے رکھ سکتی ہیں؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات ڈرامہ نگار نے ذہن میں رکھ کر اس ڈرامے کو تحریر کیا۔

ہمارے معاشرے میں مغرب میں پروردہ لڑکیوں کی چال چلن کو مشکوک خیال کیا جاتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معصوم اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن معاشرے کے کم ظرف اور ان پڑھ افراد ان لڑکیوں کے لیے بہت تنگ نظری اور تعصب بھرے خیالات رکھتے ہیں۔ ان لڑکیوں سے شادی کے لیے حامی صرف اور صرف ان کی دولت کی وجہ سے بھری

جاتی ہے یاان کو شریک سفر بنانے کی بڑی وجہ ان کی بیرونی ملک شہریت ہے۔ جاگیر دار جیسا خود غرض اور مکار انسان چڑیا سے شادی کرنے کی آڑ میں ان کی امریکی شہریت کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی یا اس کے جذبات واحساسات کی اس کے پاس کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس طرح دوسرا آدمی چڑیا کی دولت پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھا۔

بیرونِ ملک تربیت پانے والی لڑکیوں کے بارے میں یہ بھی عام خیال کیا جاتا ہے کہ ایسی لڑکیاں اچھی اور تابع فرمان بیویاں ثابت نہیں ہوتیں بلکہ شوہر کو تمام عمر اپنا غلام بنائے رکھتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں اپنے سسرال والوں کے قابو میں بھی نہیں آتیں۔ گھریلو کام کاج میں اناڑی ہوتی ہیں۔ اخلاقیات نام کی چیز سے مبرا ہوتی ہیں یہ اور اس طرح کے اور بہت سے منفی خیالات و مفروضے ان مغرب زدہ لڑکیوں کے بارے میں عام ہیں۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ منفی سوچ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جن میں مرد و عورتیں برابر حصہ دار ہیں۔ مردوں کی طرح کچھ عورتیں بھی نااہل اور ناتجربہ کار ہوتی ہیں مگر اس کے قصوروار وہ افراد نہیں بلکہ تربیت کرنے والے لوگ، والدین، بہن بھائی، رشتہ دار ہیں۔ لڑکیاں کہیں بھی ہوں ان کی اچھی تربیت کی جائے ان کو اچھا اور تعلیم یافتہ ماحول دیا جائے۔ تو وہ کسی بھی میدان میں لڑکوں سے پیچھے نہیں ہے۔ تضاد ہماری سوچ میں ہے۔ ہمارے رویوں میں ہے۔ ہمارے سماج میں لڑکے لڑکیوں سے مساوی سلوک نہیں کیا جاتا بلکہ ہر میدان میں لڑکوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اس ڈرامے میں لڑکیوں کے بارے میں والدین کی مثبت سوچ اور رویّہ ان کو برابر کے حقوق دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے افراد کو اس مسئلے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ شادی جیسے بنیادی حقوق میں لڑکا لڑکی دونوں کو اپنی پسند ناپسند کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ صرف لڑکوں کے لیے آزادانہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں بلکہ لڑکیوں کی اظہار رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ اس معاملے میں ان پر کسی قسم کا دباؤ یا مرضی مسلط نہ کی جائے۔ لڑکا، لڑکی دونوں کی باہم رضامندی اور خوشی سے ان کو رشتہ ازدواج میں جوڑا جائے۔ اس طرح معاشرے میں امن و امان ہوگا اور ایک کامیاب، خوش و خرم زندگی اور خاندان کی بنیادیں استوار ہوں گی۔

اس باب کا حاصل یہ بتاتا ہے کہ واقعی عورتوں کے ساتھ ایک طرف ایک منفی فکر والا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ انسانوں کا معاشرہ ہی نہیں ہے یا یہاں ابھی تک وہ سوچ و زاویہ نگاہ فروغ پایا ہی نہیں ہے جو عورت کو صحیح تکریم و احترام کے ساتھ مکمل مقام تک سے بھی مستفید کرے۔

(ج) تعلیم کا فقدان:

ڈراما باجی ڈکشت میں ایک مکمل گھرانہ ہے جس میں بڑی اماں، فوزیہ، دو بچے، نوکر غلام نبی، سلمان، بابر، روزینہ روزی اور نوکرانی صابرہ چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ بڑی اماں گھر کی سربراہ ہوتی ہے۔ اس ڈرامہ میں فوزیہ اور سلمان کی شادی کے مناظر کثرت سے ہیں۔ مرکزی کردار صابرہ نوکرانی ہے جو بہت غریب اور عام سی لڑکی کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک امیر اور ماڈرن خاندان ہے جس کے ہر طرف زرق برق لباسوں اور آرائشوں کی بہتات ہوتی ہے، صابرہ بے چاری اس ماحول اور گھرانے کو ہر وقت حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ آگے کے مناظر میں شادی اور بابر کے رقص کو وجود دیا گیا ہے۔ اس دوران صابرہ کے سامنے باہر سے آیا ہوا مہمان باہر آجاتا ہے تو صابرہ اس کو پسند کرنے لگتی ہے۔ یہ بات اور احساس بڑی اماں نوٹ کرتی ہے اور اس کا سلوک صابرہ کے ساتھ تھوڑا سخت ہو جاتا ہے۔ یہ سب گھر والے اور بچے صابرہ کو بہت پسند کرتے ہیں اور دل و جان سے پیار کرتے ہیں مگر جب وہ خود سے باہر سے آنے والے مہمان میں دلچسپی لینے لگتی ہے تو بے کل و بے چین رہنے لگتی ہے۔ پھر ایک اور کردار روزی آجاتی ہے جو اصل میں بابر کی دوست ہے اور یوں وہ اس نئے کردار کے آنے اور دیکھنے سے بہت افسردہ اور غمگیں ہوتی ہے۔ اب اس کو مکمل چپ لگ جاتی ہے۔ اور اس کی اماں آکر اس کو گھر لے جاتی ہے۔ اور یوں صابرہ اس گھر اور گھرانے کو نہایت غم والم سے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑی اماں اس کی حالت احساس اور جذبے کو جان کر افسوس سے اسے رخصت ہوتے ہوئے غم زدہ آنکھوں سے دیکھتی ہے اور ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

ڈرامہ نگار نے اس طویل دورانیے کے کھیل میں ہمارے سماج میں عورتوں کے حوالے سے ایک بہت بنیادی مسئلے کی نشاندہی کی ہے۔ اس میں مرکزی کردار صابرہ اور بڑی اماں ہے جب کہ ضمنی کرداروں میں دو بچے، فوزیہ، سلمان، بابر، روزی اور غلام نبی ہے۔ جس گھر میں کوئی ذمہ دار فرد اور منتظم فرد نہیں ہوتا تو ظاہر ہے وہاں بڑی اماں جیسے افراد کو یہ کام سرانجام دینا پڑتا ہے۔ کیا یہ ایک بڑا المیہ نہیں ہے کہ ایک اکیلی عورت تمام کنبے کی دیکھ بھال کرتی پھرے اور اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت ایک طرح سے ان مسائل کی عکاسی ہے جن سے مختلف معاشروں اور نسلوں میں خواتین آئے روز شکار ہوتی ہیں۔ کیا اب عورتوں کو مردوں کی ذمہ داریاں بھی نبھانی پڑتی ہیں۔ واقعی یہ اندوہ ناک اور کرب ناک صورت حال ہے جس سے عورتوں اور خواتین کا سامنا لازمی ہوتا ہے۔

اگر کسی گھرانے میں غلام نبی کی صورت میں ایک مرد نوکر ہو اور وہ گھر کی چار دیواری میں پھرتا رہتا ہے تو کیا ہمارا معاشرہ اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس سچائی کو بھی اس ڈرامہ میں تشت از بام کیا گیا ہے۔ جہاں تک صابرہ کا معاملہ ہے تو سچ و سچائی اور حق و صداقت کے ایک الم ناک روپ میں ظہور دیا گیا ہے۔

وہ ایک لاچار اور بے بس لڑکی ہوتی ہے جس کو ماں اس امیر گھرانے کے سپرد کرتی ہے۔ کیا یہ ایک گھمبیر مسئلہ نہیں ہے کہ ایک عورت اپنی سگی بچی کو پرائے گھر میں کام کاج کے لیے وقف کرتی ہے۔ یہاں پر ڈرامہ نویس نے غربت کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح اس غربت کی ماری والدہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو دور ایک مال دار گھرانے کو حوالہ کرتی ہے تاکہ دو پیسے آئیں اور پیٹ کا دوزخ قرار پائے۔ یوں اس غربت کی وجہ تعلیم و تربیت کا خواب پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور معاشرہ مختلف طبقات میں بٹ جاتا ہے۔ اس طرح خواتین کی حیات جانوروں کی طرح بن جاتی ہے۔

جب صابرہ نئے گھر میں آجاتی ہے تو یہاں پر بڑی اماں، فوزیہ، سلمان، نوکر غلام نبی اور بچوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ تمام گھر وافراد سے متعلق کام و خدمت کرتی ہے اور صبح و شام اسی امور میں مشغول رہتی ہے۔ بے شک اسے کپڑے، کھانا اور دیگر سہولیات دستیاب ہوتی ہیں مگر اس کے چہرے کا رنگ اور پاؤں صاف دکھائی دیتے ہیں کہ وہ باطنی لحاظ سے کس قدر تنہائی اور مایوسی کا شکار ہے۔ صرف بڑی اماں اس پر کڑی نظر رکھتی ہے اور بعض اوقات ڈانٹتی بھی ہے جس کو وہ خاموشی سے سہہ لیتی ہے۔

یہاں پر ڈراما نگار نے ایک اور مسئلے کی طرف توجہ دی ہے کہ ایک گھرانہ صابرہ کا ہے جہاں اسے اور اس کی اماں کو کسی قسم کی سہولیات اور چیزیں دستیاب نہیں ہیں اور وہ لوگ چھوٹی چھوٹی اشیاء اور سامان کے ساتھ ہر قسم علمی و تربیتی پر گراموں کے لیے باقاعدہ ترستے ہیں۔ صابرہ کے گھر میں ماں بھی ایک عورت ہے اور خود صابرہ بھی ایک خاتون ہوتی ہے مگر مجال ہے کہ اس کو پیٹ بھرنے اور دوسروں کے ہاں مختلف کام کرنے سے فرصت ہو۔ دوسری طرف بڑی اماں اور دوسری خواتین ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدید زمانے کے لباسوں اور گھروں سے فیضیاب ہیں۔ وہ لوگ غریبی، مفلسی، بے علمی، بے کاریا ور بے بسی کو جانتے تک نہیں ہیں بس وہ دولت اور جدیدیت کی دنیا میں اتنے آگے ہوتے ہیں کہ دوسروں کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ یوں غریب خواتین ان بنیادی سہولیات کے نہ ہونے سے اتنے دائمی مسائل کا شکار ہیں جن کو لفظوں میں بیان کرنا خاصا مشکل ہے۔

ایک مرحلے و منظر میں صابرہ کی ماں کہتی ہے کہ ہم غریبوں کے مرد کام نہیں کرتے مگر عورتوں کی عزت اتارنے میں کافی تیز ہوتے ہیں اس خیال سے پتہ چلتا ہے کہ غرباء خواتین کو بنیادی حقوق سے محروم کرنے میں جاہل مردوں کا بہت بڑا عمل دخل ہیں۔ یہ لوگ روایتی اطوار پر عمل کر کے اور کبھی مذہبی لبادھے میں عورتوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور خود کو بادشاہ سمجھ کر عورتوں پر حکم چلاتے ہیں۔ ان افراد کے ہاتھوں خواتین کے ساتھ بہت زیادتی ہوتی ہے۔ اگر یہ عورتیں اس بڑے مسئلے کے خلاف احتجاج کرتی ہیں یا عدالتوں سے انصاف مانگتی ہیں تو نتیجہ صفر ہی ملتا ہے اور یوں سر عام ظلم و ستم کا بازار برسوں سے گرم ہے۔

صابرہ اس بڑے امیر گھرانے کی خدمت کرتی جاتی ہے اور فوزیہ کی شادی میں بار بار ناچتی رہتی ہے۔ جسکو اب سب گھر والے باجی ڈکشت کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔اب صابرہ باجی ڈکشت ہو کر سب کا دل بہلاتی ہے اور شادی پروگرام کے ہر مرحلے میں پیش پیش ہوتی رہتی ہے۔

وہ چوڑیوں اور لباسوں کے رنگ دیکھتی جاتی ہے اور افسردہ ہو جاتی ہے ایسے میں کردار بابر آجاتا ہے اور یہ دونوں ناچ ناچ کر سارے افراد کو خوش کرتے ہیں۔ صابرہ یا باجی ڈکشت کو بابر اچھا لگنے لگتا ہے مگر اظہار محبت نہیں کر سکتی۔ یہاں پر دو طبقات میں پھنسی صابرہ عجیب کشمکش میں گرفتار نظر آتی ہے۔ معاشرے اور روپے پیسے کے غلط تقسیم سے غریب خواتین ظاہری واندرونی طور پر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں اور آخر میں ناامیدی کی تصویر بن کر مر جاتی ہیں۔

ایک طرف فوزیہ اور سلمان ایک گھر میں رہ کر محبت اور چاہت کی باتیں کرتے ہیں اور ہر وقت خوش گپیوں اور ہنسنے مسکرانے میں لگے رہتے ہیں اور سر عام دونوں اپنی شادیوں کی تیاریوں میں مصروف بھی رہتے ہیں اور کھلے عام دونوں مصروف گفتگو ہوتے ہیں اور دوسری طرف غربت اور غریبی کے ہاتھوں مفلس اور ان پڑھ باجی ڈکشت صابرہ نوکرانی اپنے دل کا حال کسی کو بتانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ یوں وہ لمحہ لمحہ جیتی ہے اور بار بار مرتی ہے۔

آخری مناظر میں وہی شادی، رقص، شور شرابہ، بعام و خوراک، روشنیاں و ہنستے مسکراتے چہرے، نئے نئے لباس اور کردار بچے بوڑھے اور بچیاں خواتین خوش و خرم دکھائی دیتی ہیں۔ اب بابر کو روزی مل جاتی ہے اور سب جوڑوں میں رقص کرتے ہیں تو صابرہ ایک دم سے خود کو تنہا اور الگ محسوس کرتی ہے۔ وہ بابر اور روزی کو مسکراتے اور ایک ساتھ دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے اور یوں سب کو چھوڑ کر ایک گوشے میں خاموش تماشائی بیٹھتی ہے۔ اس حال کو بڑی اماں جان لیتی ہے اور اسی دوران صابرہ کی ماں آجاتی ہے اپنی بیٹی کو بالکل زرد رنگ میں دیکھ کر چیختی چلاتی ہے کہ میری بیٹی پر جن نے گرفت کیا ہوا ہے۔ بڑی اماں معاملے کی نزاکت اور باجی ڈکشت کی حالت کو دیکھ کر خود بھی غمگیں نظر آتی ہے۔ صابرہ کو ماں ہاتھ سے پکڑ کر واپس لے جاتی ہے اور رخصتی کے وقت صابرہ یعنی باجی ڈکشت تمام گھرانے اور خاص کر بڑی اماں کو دیکھتی ہے۔ وہ نہ روتی ہے اور نہ بات کرتی ہے اور دوسری طرف بڑی اماں بھی الم کی تصویر بن کر اس کو دیکھتی رہتی ہے۔ اب باجی ڈکشت وہ صابرہ نہیں ہے جو ہنستی مسکراتی رہتی تھی اور خاص کر بابر کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی اب وہ ایک بت اور لاش کی مانند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور ڈرامہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

واقعی یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ دو طبقات میں منقسم لڑکیاں اور امیر غریب معاشرے میں موجود بچیاں دو الگ الگ نظاموں کے تحت زندگی گزارتی ہیں۔ اگر ایک خاتون غریب ہو، تعلیم نہ ہو، روپے پیسے نہ ہوں اور اس کا گھرانہ بے روزگار یا مفلس ہو تو اس کو محبت، چاہت اور نکاح کا حق نہیں ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہے، کیا وہ ایک مخلوق نہیں

ہے، کیا وہ کوئی احساس اور جذبہ نہیں رکھتی، کیا وہ خوش گوار زندگی کا خواب نہیں دیکھ سکتیا ور کیا وہ بھرپور حیات نہیں گزار سکتی۔ یہ وہ بنیادی حقوق ہیں جو ایک غریب خاتون کو دستیاب نہیں ہیں۔ یہ بے چاری بے تعلیم عورت غربت کے مارے زندہ لاش لڑکی نہ اپنے اصل حقوق سے آگاہ ہے اور نہ فطری، قدرتی، سماجی، خاندانی، معاشرتی، اخلاقیاور دیگر حاصلات سے فیضیاب ہے۔ یوں اس ڈرامے میں صابرہ باجی ڈکشت کو اس عورت کے روپ میں دکھایا گیا ہے جو زندہ تو ہے اور سانس لے کر جیتی جاگتی بھی ہے مگر اس کے آگے پیچھے اتنے مسائل ہیں کہ وہ ایک زندہ نعش اور خاموش بت کی مانند رہ گئی ہے۔

ڈراما کچے پکے رنگ میں سکینہ مرکزی کردار ادا کرتی ہے اور بیٹی ثریّا تعلیم حاصل کرتے اور ماں کا ہاتھ بٹاتی نظر آتی ہے۔ اس گاؤں میں ٹھیکیدار مختلف عورتوں سے سینے پرونے اور کپڑے بنانے کا کام کرواکر مزدوری دیتا ہے۔ وہ آدمی اور شہری بیگم ان غریب لڑکیوں اور عورتوں سے ڈھیروں کام لیتی ہے مگر صحیح دام نہیں دیتے اور یوں عورتوں کو بنیادی حقوق سے محرومی اور مسائل کی ایک دلخراش کہانی یہاں بیان کی گئی ہے۔ اس کھیل میں بستی کی اصل شکل، مردوں کی جاہلیت اور اجارہ داری، بچیوں کی تعلیمی کمی، صحت و غربت کی حقیقی عکاسی، زیادہ مشقت اور کم دام، شوہروں کے منفیرویےاور عورتوں کی خاموشی، گاؤں کے باشندوں کی مفلسی، عورتوں کی اظہار رائے کا فقدان، خواتین کی بے اتفاقی اور بے بسی، کچے کمزور گھرانے اور آخر میں پاس ہونے اور ساتھ دینے پر آمادگی اور زندگی کو درست خطوط پر ڈالنے کے مناظر کو بہترین انداز میں نشر کیا گیا ہے۔

ڈراما کچے پکے رنگ میں خواتین کی بہتات نظر آتی ہے۔ اس کھیل کا مرکزی کردار سکینہ ہوتی ہے جو دیہاتی زندگی گزارتی ہے اور اپنے شوہر اور ایک بیٹی ثریا کے ساتھ رہتی ہے۔ جب اس کا شوہر مر جاتا ہے تو مسائل منہ کھولتے ہیں اور ماں بیٹی کے لیے زندگی بہت مشکل بن جاتی ہے۔ یہاں سے یہ گھرانہ محنت مزدوری شروع کرتا ہے اور ایک اکیلی خاتون کے لیے مرحلہ و مسئلہ ایک طرح سے جان لیوا ہوتا ہے۔ اوپر سے ایک جوان بیٹی کی نگرانی اور علمی سفر کی تکمیل الگ سے ایک سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ معاشی اور حفاظتی بندوبست کرنا ایک تنہا عورت کے لیے عذاب ہوتا ہے۔ اس ڈرامہ میں ایک دیہاتی عورت اور اکیلی ماں کے حوالے سے کافی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لوگوں کے پاس باتیں اور مشورے ان گنت ہوتے ہیں مگر غم گسار اور نگہبان بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح اپنی صحت و عزت کی چنتا کرتے کرتے جوان بیٹی کو بھی ہر بلا اور بری نظر سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری بھی یہی ماں اُٹھاتی ہے جو ظاہر ہے اس ناتواں کا کام نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایسی عورت روز روز جیتی اور مرتی ہے۔ کوئی

پر سان حال نہیں ہوتا اور ہر دکھ سے سامنا کرتے کرتے اپنی موت تک بھول جاتی ہے۔ سکینہ گھر میں سلائی کڑھائی کا کام شروع کرتی ہے اور بیٹی کالج جاتی ہے۔

کیا یہ آسان کام ہے کہ ایک یتیم لڑکی تن تنہا تعلیم حاصل کرے اور اس کو لاکھ مسائل کا سامنا نہ ہو۔ کیا ہمارا معاشرہ اس لحاظ سے انتہائی جاہل نہیں ہے کہ ایک معصوم بچی صحیح طور پر علم سے آشنا ہو اور وہ بغیر مرتے مرتے اپنا مستقبل سنوارے۔ واقعی دل خراش حقیقت ہے جس کا ڈرامے کے ضمنی کردار ثریا اور دیگر لڑکیوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس ڈرامے کا ایک کردار پڑوسن تاجی ہے جو اپنے نشے باز شوہر کے ظلم اور ظالم سماج پر سکینہ سے گفتگو کرتی رہتی ہے۔ یہاں پر ڈرامہ نگار نے ایک اور بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ہمارے معاشرے کی عورتوں پر مرد حضرات زیادتی کرتے ہیں اور وہ زیادہ تر چپ رہتی ہیں اور ظلم سہتی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ بے شک وہ نشہ کرتا ہے مگر مجھے شہ دینے والا بھی یہی آدمی ہے اس لیے اس کو اب چھوڑنا ناممکن ہے۔ کیا یہی اچھا ہوتا کہ ہمارے آس پاس کی عورتوں کو اپنے مردوں اور شوہروں سے صحیح محبت اور احساس کے تحفے ملتے اور عورت اپنے گھر گھرانے میں رانی بن کر خوش و خرم زندگی گزارتی مگر یہ صرف ایک خیال و خواب کی مانند ہے جن کا حق و سچ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

آگے کے مناظر میں عورتیں ٹھیکیدار کے لیے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے رنگ و روغن کرتی نظر آتی ہیں۔ ڈرامہ نگار نے یہاں پر اس معاشرے کی عکاسی کی ہے جہاں عورتوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھ کر ان سے محنت و مشقت کا کام لیا جاتا ہے اور وہ تعلیم، آزادی اور علاج معالجے تک بھول کر مختلف مسائل کا شکار رہتی ہیں۔

سکینہ بھی یہی کام شروع کرتی ہے اور دوسری عورتوں کی طرح سر عام بیٹھ کر کپڑے بناتی جاتی ہے۔ کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ خواتین کے لیے مناسب مقام یا ہنر کدہ مرکز ہوتا اور وہ کھلے عام کام نہ کرتیں اور یوں ان کی عزت محفوظ ہوتی۔ یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ عورتیں مردوں کے اشاروں پر ناچتی رہتی ہیں اور وہ ایک لحاظ سے غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ اوپر سے ٹھیکیدار بروقت مزدوری فراہم نہیں کرتا اور نہ مقرر ہاور ٹھیک ٹھاک اُجرت دیتا ہے۔ ہر معاشرے میں عورتوں کے سامنے یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ وہ کوئی ایسی تنظیم، ادارہ، تحریک یا پلیٹ فارم کو نہیں جانتیں اور نہ بڑے بڑے لوگ اور طبقہ اشرافیہ یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کریں اور ایسا پلیٹ فارم بنے کہ جس کے سہارے یہ دیہاتی خواتین اپنے اصل حقوق سے آگاہ ہو سکیں۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ دیہاتی عورت کے ساتھ شہری بیگم بہت مصنوعی اور زہریلا رویہ روا رکھتی ہے۔ اس ڈرامے میں ٹھیکیدار اور بوتیک کی مالکن شہری بیگم مل کر گاؤں کی عورت کو اصل حق و اجرت سے دور رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ عورت

ظاہری عیش و عشرتاور لباس خراش کی شوقین ہوتی ہے اس لیے اس کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کس قدر زیادتی اور بے حسی سے کام لیتے ہیں۔ یوں سکینہ، ثریا، تاجی اور دوسری عورتوں کو صحیح دام نہیں ملتے۔

جب ثریا خود بوتیک جا کر وہاں اپنا مال اور دیگر عورتوں کے تیار کردہ کپڑوں کی فروخت اور قیمت دیکھتی ہے تو دنگ رہ جاتی ہے وہ گاؤں آ کر سب کو حقیقت بتاتی ہے اور وہ لوگ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ بے شک ٹھیکیدار آ کر منت سماجت کرتا ہے اور ہر کردار کو ورغلاتا بھی ہے مگر عورتیں اتحاد کا مظاہرہ کر کے ساتھ رہتی ہیں اور لالچ کو ٹھوکر مار کر سکینہ کے پیچھے ہنستی مسکراتی اپنے گھروں کو چلی جاتی ہے۔

آخری مناظر میں عورتوں کے حوالے سے اظہار رائے اور امتیازی سلوک کے بارے میں اشارے کیے گئے ہیں۔ دکھایا گیا ہے کہ جب خواتین کو کھلے عام اظہارات و ملفوظات کی اجازت نہیں ہوتی اور خاص کر ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے تو پھر یہ عورت گھٹ کر مرتی ہے۔ وہ اپنے حقوق کے لیے اٹھ نہیں سکتی اور نہ کاغذی قانون جاگ سکتا ہے کہ عورت کو مساوی طرز عمل سے جانچا جائے۔ یہ جو دیہاتی و شہری زندگی اور خواتین کے مابین امتیازات کی لکیریں ہیں یہ الگ سے زہریلے ناگ کے برابر ہیں۔

حاصل بحث یہ کہ اس ڈرامے میں اس تن تنہا عورت اور اکیلی لڑکی پر بات کی گئی ہے جس کو ان گنت بنیادی اور سماجی مسائل کا سامنا ہے مگر کوئی مداوا نہیں ہے اور وہ دونوں زندگی سے ہار تسلیم کرتی نظر آتی ہے۔

ڈرامہ کلوار دو ادب کی مشہور ادیبہ، ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بانو قدسیہ کا غربت اور تعلیمی مسائل پر لکھا ہوا ایک خصوصی کھیل ہے۔ طویل دورانیے کا یہ کھیل کلو اور سجو کے درمیان گھومتی ہوئی ایک لازاوال محبت کی داستان ہے۔ کلو جو کہ رنگت کی کالی ہوتی ہے، کی مناسبت سے بے چاری کو یہ نام دیا جاتا ہے۔ کلو ایک غریب اور ان پڑھ کردار ہے۔ وہ ایک سمجھدار، سلیقہ مند، ذہین و فطین لڑکی ہوتی ہے اور اس پر مستزاد محبت اور پاسداری کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ مگر سجو کو اس کے رنگ کے سوا اس میں کچھ نظر نہیں آتا سجو ایک خوبصورت تعلیم یافتہ نوجوان کردار ہے اور کلو اس پر دل و جان سے عاشق ہوتی ہے مگر اس کے پاس محبت اور محبت کرنے والی کی کوئی قدر نہیں ہوتی وہ مادہ پرست شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ ڈرامے میں اور کرداروں کے علاوہ ایک کردار حسن کا ہے۔ اس کے آنے سے سجو اور کلو کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ وہ سجو کو کلو سے چھین لینے کے چکر میں ہوتی ہے مگر کلو اپنی ذہانت سے اسے اس کام سے روکتی ہے۔ ناکام ہو کر وہ دوبارہ کراچی واپس چلی جاتی ہے۔ کلو کو دوبارہ اپنی محبت مل جاتی ہے دونوں کی شادی کے شادیانے بجتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد دونوں میں تکرار ہوتی ہے اور کلو سجو کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ سجو بہت پچھتاتا ہے مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

بحیثیت ماہر فنکار بانو قدسیہ نے ایک جہت ایک ذاد کو ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے ہمارے معاشرے میں زیادہ تر لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ان پڑھ ہیں۔ یہ ڈرامہ گھر میں موجود تعلیم یافتہ مرد اور ان پڑھ لڑکی کی کہانی ہے جو کہ عام طور پر تقریباً ہر گھرانے کا المیہ ہے۔ کلو اور سجو دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں مگر ان کی سوچ اور چال ڈھال میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کلو نہایت سادہ، اور بے ضرر لڑکی ہوتی ہے مگر ذہانت و فطانت میں بلا کا کمال رکھتی ہے۔ اس کی سوچ کی طرح اس کا لباس بھی نہایت سادہ اور آرائش سے پاک ہوتا ہے۔ جبکہ اس گھر میں رہنے والا ایک لڑکا جس کو سجو پکارا جاتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدید زندگی کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے والا شخص ہوتا ہے۔ کلو سجو سے دل ہی دل میں بہت محبت کرتی ہے مگر ایک مشرقی لڑکی ہونے کے سبب کبھی کھل کر اظہار نہیں کر پاتی ہے اور یہ غم اس کے تن بدن کو دیمک کی طرح کھا رہا ہوتا ہے۔

بانو قدسیہ نے ایک ماہر فنکار کی حیثیت سے اس ڈرامے میں جہیز اور خوبصورت لڑکیوں کے مسائل کو ہمارے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ڈرامے کا ایک کردار حُسن کو ایک خوبصورت لڑکی کے روپ میں پیش کیا ہے جو بظاہر تو بہت خوبصورت لڑکی ہے ظاہری خدوخال کافی حد تک دل لبھانے والے ہیں مگر اس میں سلیقہ مندی اور ذہانت جیسے جوہر نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حسن کے جلوؤں سے سجو کو اپنی محبت میں پھنسانا چاہتی ہے۔ دراصل یہ لڑکی کلو کی سہیلی ہوتی ہیں لیکن سجو کو دیکھ کر اس کی دیوانی ہو جاتی ہے مگر کلو اپنی ہوشیاری سے اس کی جھوٹی محبت کا پول کھول دیتی ہے۔ سجو کو نہ پانے کے بعد حُسن واپس کراچی چلی جاتی ہے۔ کلو کو سجو کی محبت دوبارہ حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے مگر ذہنی میلان نہ ہونے کی وجہ سے دونوں کے درمیان ہر وقت بحث و مباحثہ جاری رہتا ہے۔ بات علیحدگی تک پہنچ جاتی ہے اور کلو سب کچھ چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد سجو بہت پچھتاتا ہے مگر اب سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

(د) مسئلہ جہیز:

اب میرا انتظار کر، ایک ایسے خاندان اور گھر کا قصہ ہے جو معاشرے میں بد سے بد تر زندگی گزارنے کی ہزار داستان سے پُر ہے۔

ایک گھر میں ایک بیوہ خاتون دو بیٹوں کے ساتھ رہتی ہے۔ بھائی کے گلے میں کشکول لٹکتا ہے اور وہ سب فانی ہے اور ہر چیز خالی ہے، کے نعرے لگاتا ہے۔ اس گھر میں ظاہری طور پر کمانے والا اور نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بڑی لڑکی کپڑوں کو سیتی ہے اور ماموں ایک طرح سے خیراتی لگتا ہے۔ یوں اسگھر کی روزی روٹی کا بنیادی مسئلہ کسی نہ کسی صورت حل ہوتا ہے۔ چھوٹی بیٹی اکثر ماں اور بڑی بہن کو طعنے دیتی ہے کہ خود کو بہادر شاہ ظفر کی نسل اور کنبے کا بتا کر کسی

طرح ذلالت بھرا کام یعنی بھیگ مانگ کر وقت گزارتے ہیں، بیوہ کی بڑی بیٹی کھانا پکاتے اور زیادہ تر خاموشی سے صبح و شام کرتی جاتی ہے۔ کچھ مناظر کے بعد ایک کرایہ دار اس گھرانے کا فرد بن کر آجاتا ہے۔ چھوٹی لڑکی اس آدمی سے محبت کرنے لگتی ہے مگر وہ بڑی بہن کو دل میں بٹھا کر چاہت میں خوش ہوتا ہے۔ دونوں میں محبت پروان چڑھتی ہے۔ بعد میں مایوسی، ناکامی اور غریبی کی وجہ سے چھوٹی لڑکی گل بانو خودکشی کر لیتی ہے اور تعلیم و نوکری کی وجہ سے کرایہ دار احسن میاں واپس چلا جاتا ہے۔ بڑی لڑکی نرگس اس کے جانے پر خون کے آنسو روتی ہے اور اپنے ساتھ گنگناتی رہتی ہے۔ ایک وقت کے بعد نرگس اپنے گھر میں گانے بجانے کی محفل لگاتی ہے اور دوسری طرف احسن میاں اسی شہر میں بڑا آفیسر بن جاتا ہے۔ پھر دونوں کی ملاقات ہوتی ہے مگر اب سب بدل جاتا ہے اور دونوں اپنی اپنی راہ چلتے ہیں۔

آخری منظر میں احسن میاں دُعا اور صحت و تندرستی کے لیے ایک بزرگ کے مزار پر آتا ہے اور وہاں نرگس دیوانگی میں حق، حق اور سب فانی ہے، سب فانی ہے کے نعرے لگاتی دکھائی دیتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو حیران و پریشان دیکھتے ہیں اور دُور دُور چلے جاتے ہیں۔

پہلے منظر میں ایک معذور بھائی اور بہن کو دکھایا گیا ہے۔ بہن اپنے بھائی کو ریل پٹڑی سے اتار کر گاڑی کی ٹکر اور موت سے بچاتی ہے۔ یہاں پر اس بنیادی مسئلے کی نشاندہی کی گئی ہے کہ اگر مرد گھر میں نہ ہو اور جو ہو تو وہ بھی ذہنی معزور، تو ایک غریب عورت کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھر کو دیکھنا، بچیوں اور دیگر افراد کی دیکھ بھال ایک مرد ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے اور جب مرد نہ ہو اور یا ہو مگر فکری لحاظ سے پسماندہ ہو تو بے چاری ایک خاتون کس طرح بدحالی اور مایوسی کی شکار ہو گی، یہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ خواتین اکثر اس مسئلے سے دوچار ہو کر زندگی تک کو گنوا بیٹھتی ہیں۔

دوسرے منظر میں گھر، بیوہ اور دو جوان بیٹوں کے کردار سامنے آتے ہیں۔ یہ لوگ بہت غم زدہ اور غربت کی زندگی گزارتے ہیں اور ان کے مالی اور معاشی مسائل بہت گھمبیر ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی گھرانہ مالی اور معاشی لحاظ سے کمزور ہوتا ہے تو وہاں پر تعلیم و تربیت کا بہت بڑا فقدان ہوتا ہے۔ بڑی بیٹی نرگس اور چھوٹی لڑکی گل بانو اس لحاظ سے بہت مایوس ہو کر اور طنزیہ فقرے بول کر زندگی گزارتی ہیں۔ ہمارے ہاں جب کسی گھر میں مرد نہیں ہوتا یا دوسرے افراد تعلیم و تعلم سے آشنا نہیں ہوتے تو پھر باقی گھر والے اور خاص کر عورتیں اس زیور سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ ماں، بیٹیاں اور ماموں اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے روتے رہتے ہیں مگر دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے تاکہ حالات زیادہ الٹ پلٹ نہ ہوں۔ اس سلسلے میں زیادہ تر خواتین ہی متاثر ہوتی ہیں۔ بیوہ ماں اپنی دو جوان بیٹیوں اور ایک دیوانے بھائی کا بوجھ برداشت کر کے خود بھی جسمانی اور ذہنی طور پر لاغر بن جاتی ہے۔

ایسے گھرانوں میں خواتین کو بنیادی حقوق بھی نہیں ملتے جو ایک الگ گھر اندوہ ناک مسئلہ سے دو چار ہوتی ہے۔ غیر افراد اور بیرون کے لوگ اکثر بے دھڑک گھر میں آتے جاتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اس ڈرامے میں ایک کردار کلن میاں کو دکھایا گیا ہے جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بیوہ خاتون کے سامنے اچھا بننے کی اداکاری کرتا رہتا ہے۔ وہ دونوں لڑکیوں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتا ہے اور خاتون کو کام اور شادی وغیرہ کے ضمن میں الٹے ادھورے مشورے دیتا رہتا ہے۔ کیا اسلام اسی طرح غیر مرد کے گھر میں آنے اور بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے مگر کیا کریں ہمارے سماج میں اکیلی خواتین کے ساتھ زیادہتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ جن سے معاشرے کے اندر ان گنت عورتوں کا اس سے سامنا ہوتا ہے اور کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کمانا اور گھر چلانا اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے مگر جس گھر میں یہ سب کرنے والا کوئی مرد موجود نہ ہو تو پھر خواتین کو ہی یہ ذمہ داری اُٹھانی پڑتی ہے۔

کلن میاں ایک غیر مرد اور احسن میاں کو کرایہ دار کے روپ میں اسی گھر میں لاتا ہے اور خواتین اس کو کمانے اور پیسے دینے کا ذریعہ مان کر ایک اوپر والا کمرہ مہیا کرتی ہیں۔ کیا یہ بڑا اور بنیادی مسئلہ نہیں ہے کہ غیر مرد گھر میں موجود رہے اور اٹھتا بیٹھتا رہے اور بے چاری عورتیں ادھر ادھر بھاگتی رہیں اور بعض اوقات مردانہ زنانہ آنکھوں، اشاروں اور قدموں سے بھی سامنا ہو تو یہ کس قدر مشکل مرحلے ہوتے ہیں۔

یہ تشنگی اور شدت کیوں ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ فطرتی طور پر کچھ انسانی ضروریات اور قدرتی طور پر بعض تقاضے ہوتے ہیں جن کو پورا کرنا اور بروقت مکمل کرنا عین حیات ہوتی ہے۔ اس طرح کے گھر اور گھرانے میں شادیاں نہیں ہوتیں اور جو اوقات خاص نکاح کرنے کے لیے ہوتی ہیں وہ جب پاس نہیں ہوتی تب یہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ جس طرح گل بانو اور نرگس پرائے مرد میں دلچسپی لیتی ہے تو کبھی یہ تمام خاندان کے لیے باعث شرمندگی بن جاتا ہے اور بعض اوقات سانس بھر کے لیے طعنہ کہلاتا ہے۔ ایسے ادھورے اور بکھرے چار دیواریوں میں جہاں اور بنیادی مسائل جنم لیتے ہیں وہاں شادی بھی اور خوشی میں نہیں چلتی۔ یہ گھرانہ جس طرح تعلیم و تربیت سے عاری ہوتا ہے اسی طرح صحت اور تندرستی سے بھی خوگر نہیں ہوتا۔ کبھی والدہ، کبھی ماموں اور بعض وقت ایک بہن بھی بیمار ہوتی ہے مگر مجال ہے کہ ان لوگوں کو علاج معالجے کی سہولیات بروقت دستیاب ہوں۔ اب نئی صورت حال کے مطابق چادر اور چار دیواری کا مسئلہ در پیش ہوتا ہے اور یہ گھرانہ ایک اور مسئلے سے دوچار دکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب گھر میں شور شرابہ اور بچے بچیاں نہ ہوں، روپے پیسے نہ ہوں، ذمہ دار افراد نہ ہوں، بنیادی سہولیات کا فقدان ہو اور وقت گزاری کے لیے اور ہنسنے ہنسانے کے لیے مختلف چہرے نہ ہوں تو پھر خاموشی، مایوسی، نفسا نفسی اور ایک طرح سے دوری پیدا ہوتی ہے اور ایسے گھرانوں کے افراد ہُو کے عالم میں اور اپنی ذات میں گم زندگی گزارتے ہیں۔ اس گھرانے میں بھی ماں اور بیٹیاں ایک دوسرے سے

فاصلے پر رہتی ہیں اور ہر کردار انتہائی کم گو اور مایوس دکھائی دیتا ہے۔ وہ کرایہ دار بے شک باتیں اچھی کر لیتا ہے مگر جہاں لوگ اظہار رائے کو جانتے تک نہیں ہیں اور محبت واحساس کو غربت و بیماری نے دبوچ لیا ہو، وہاں وہ لوگ رد عمل میں خالی دیکھنے اور گھورنے پر ہی اکتفا کو بہتر سمجھتے ہوئے ہوں ہاں کرتے رہتے ہیں۔ جب ماں بیمار ہو، ماموں دیوانہ ہو، مالی حالت انتہائی بُری ہو، حسن کو بے تعلیمی و بے کاری نے سبوتاژ کیا ہو، جہیز و سامان کا نام و نشان نہ ہو تو پھر رشتے کیسے آئیں اور بات کس طرح بنے۔ کلن میاں اشاروں میں بکواس کرتا رہتا ہے اور نہ نرگس و گل بانو خاموشی سے سنتی رہتی ہیں۔

آگے کے مناظر انتہائی خوفناک ہوتے ہیں۔ گل بانو تو احسن میں دلچسپی لیتی ہے اور جب اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ تو نرگس کو پسند کرتا ہے اور دوسری طرف اس سے پوچھے بغیر اس کی منگنی اور شادی کا فیصلہ بھی کیا جاتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خواتین کے لیے ایسے گھرانے اور معاشرے میں خودکشی ہی واحد حل بن جاتی ہے جہاں اظہار رائے اور اپنی بات کرنے پر پابندی ہو۔ اکثر خواتین اپنے گھروں اور روایتوں میں زندہ تو ہوتی ہیں مگر وہ اصل میں قیدی ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ گھٹ گھٹ کر مر جاتے ہیں اور کوئی بھی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس ڈرامے میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک لاڈلی اور پیاری لڑکیاس ظالم سماج اور بے حس معاشرے کے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرتی ہے۔ کیا یہ ایک بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کی عمر نکل جاتی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا۔ ایسا اس لیے کہ روپیہ پیسہ نہیں ہوتا، ماں باپ امیر نہیں ہوتے، کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ہوتی، جہیز کے لیے ڈھیروں ساز و سامان نہیں ہوتا اور خاص کر یتیم ہونے کی کیفیت الگ ہوتی ہے۔ یوں بچیاں یا تو بیماری سے، زہر کھانے سے، یا معذور ہونے سے یا خودکشیوں سے مر جاتی ہیں اور کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایسا برہنہ ظلم اور کھلے عام ستم جاری ہے۔ احسن میاں دل برداشتہ ہو کر اور حالات کے منفی مدوجذر کے ہاتھوں بوریا بستر باندھ کر اور نرگس کو اکیلا چھوڑ کر واپس چلا جاتا ہے۔ جب گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا اور خاص کر والدین کا صحیح سلامت سایہ باقی نہیں رہتا تو لڑکیوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک اکیلی لڑکی کو مزید تنہائیوں اور اندھیروں میں چھوڑی جائے اور صرف باتیں اور اشارے اس کے لیے ہوں۔ نہ کوئی مسیحا بنتا ہے اور نہ کوئی مستحکم آسرا کہ نرگس کے سر پر سائبان بن جائے۔ واقعی ہمارے ہاں یہ ڈراما برسوں سے شروع ہے۔ اور اسی سے عورتیں برباد ہوتی جاتی ہیں۔ احسن تو بڑا آفیسر بن کر واپس اسی شہر میں فرائض سر انجام دیتا ہے اور نرگس گائیک بن کر لوگوں کے سامنے گاتی ہے۔ ایک منظر میں ہیرو، ہیروئن اسی کھنڈر نما گھر میں ملتے ہیں اور احسن کو یہ کہہ کر واپس جانے کا کہا جاتا ہے کہ اب یہاں ایک عورت رہتی ہے جس کا تعلق گانے بجانے اور سُروں سے ہے۔ ہیرو آفس آکر اور زیادہ سوچ کر ذہنی لحاظ سے پریشان ہوتا ہے۔

آخر میں دونوں کی ایک دربار میں ملاقات ہوتی ہے اور نرگھس ایک پاگل کے روپ میں احسن سے ملتی ہے کہ سب فانی ہے، جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا اور کل کا کسی کو پتہ نہیں۔

ڈرامہ نگار بتانا چاہتی ہے کہ جب عورت سماجی اور معاشی طور پر کمزور ہوتی ہے اور ساتھ مستقل مرد کی موجودگی نہیں ہوتی اور محبت میں بھی نامراد ہوتی ہے تو پھر انجام بہت بھیانک ہوتا ہے۔اسی طرح ایک بے چاری عورت یا مفلس خواتین ہر لحاظ سے مسائل میں گرفتار ہوتی ہیں اور اپنی بقا کا تمام تر سامان گم کر جاتی ہیں۔

(و) عورتوں سے امتیازی سلوک:

سلیم چشتی کا لکھا ہوا کھیل فاؤل پلے، ہاکی کھیل سے متعلق کچھ کھلاڑیوں، سپورٹس منیجر زاور دوسرے افراد پر مشتمل ہے۔ مرکزی کرداروں میں ریفری آغا جی، کھلاڑی شاہ رخ، عالم احمد اور سپورٹس کالم نگار عائشہ احسان کو دکھایا گیا ہے۔عالم احمد ایک منفی کردار ہے جو کہ ہیرو شاہ رخ کو مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے کھیل سے روکتا ہے۔دوسری طرف آغا جی اور عائشہ احسان اس کو سپورٹ کرتے ہیں۔یوں ہاکی کھیل میں اونچ نیچ اور باقی داؤ پیچ پر یہ ایک طویل ٹی وی ڈرامہ ہے۔اس ڈرامہ میں ایک خاتون جرنلسٹ کے مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔اختتامیہ حصے میں عالم احمد، شاہ رخ کے لیے نرم گوشہ رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سب خوشی خوشی آگے بڑھتے ہیں۔

سلیم چشتی کے اس ڈرامے میں ایک ایسی عورت کو ظاہر کیا گیا ہے جو سپورٹس صحافت سے وابستہ ہے۔یہ کردار عائشہ احسان کے نام سے ہاکی کھیل اور کھلاڑیوں سے متعلق حقائق جمع کرتی ہے اور کالم لکھتی ہے۔اگرچہ ریفری آغا جی بھی ایک توانا کردار ہوتا ہے اور اعلیٰ صفات کا مالک بھی ہوتا ہے مگر عائشہ احسان حق و سچ کی تلاش میں بہت دور تک جاتی ہے۔عالم احمد اور شاہ رخ بھی مرکزی کرداروں میں شامل ہیں۔ایک نے منفی اور دوسرے نے مثبت کردار ادا کیا ہے۔دونوں کے مابین کھیل اور ہاکی کھیلنے سے متعلق چپقلش موجود ہوتی ہے اور جیت ہیرو شاہ رخ کی ہوتی ہے۔

سلیکشن کمیٹی اور ریفری کے درمیان بھی ان دونوں کے حوالے سے بات بڑھتی ہے۔چونکہ آغا جی حق و سچ کے علمبردار ہوتے ہیں اس لیے باقی ممبران اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کردار کو شہ دیتے ہیں۔ہیرو کے والدین غریب ہوتے ہیں اور وہ اپنے بیٹے کو سپورٹ کرتے ہیں اور یوں شاہ رخ ہر لحاظ سے کامران ٹھہرتا ہے۔

ویسے تو اس ڈرامے میں موضوع کھیل اور اس سے وابستہ امور و مراحل ہیں مگر عورت کے حوالے سے جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں پردے کا مسئلہ اور اظہار رائے سے متعلق مسائل شامل ہیں۔عائشہ احسان ایک عورت ہے جب وہ تعلیم اور خاص کر صحافت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے تو وہ کھل کر اپنا کردار نبھا نہیں سکتی۔وہ اس لیے کہ مردوں کے معاشرے میں موجود ہوتی ہے جہاں اخبارات، بیاناتاور صحافتی معاملات پر مرد قابض ہوتے ہیں۔وہ بہت

کچھ سامنے لانا چاہتی ہے اور سچائی و صداقت کو ظاہر کرنا چاہتی ہے مگر اس کو مردوں کا سماج آگے آنے سے باز رکھتا ہے۔ عائشہ احسان اپنی بات کرنا چاہتی ہے اور عورت ہونے کے ناطے اپنا مقام بنانا چاہتی ہے مگر وہ ایک حد تک ناکام ٹھہرتی ہے۔

امتیازی سلوک کا مسئلہ الگ سے ہوتا ہے کیونکہ کمیٹی ممبران اخباری دنیا میں کوئی عورت نہیں ہوتی اور اس کو اکیلے لڑنا پڑتا ہے۔

بجا ہے کہ فاؤل پلے نامی اس طویل دورانیے کے ڈرامے میں عورتوں کے زیادہ حقوق اور مسائل پر بات نہیں کی گئی مگر کردار عائشہ احسان کے ذریعے یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ ایک تنہا عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ کام میں کس قدر مشکلات کا سامنا درپیش ہوتا ہے۔ وہ درست کالم کی اشاعت اور صحیح بات کو لکھنا چاہتی ہے مگر بہت ہی مشکلات سے گزر کر کام ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے مقابلے میں کوئی مرد ہوتا اور اخبار کا ایڈیٹر بھی اس کا چچا ہوتا تو خود سوچئے کہ پھر کیا کیا ممکن بنایا جاتا مگر عائشہ احسان ایسا نہیں کرتی بلکہ وہ انصاف اور اصولوں کی صحافت پر یقین کر کے آگے جانا چاہتی ہے۔

اگر ہمارے ہاں ایک عورت صحافت میں قدم رکھتی ہے تو جا بجا مدافعتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر لفافہ بندی اور حصّہ داری کا معاملہ ہو تو سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے اور اس طرح اگر سیاہ و سفید کو ملانے کا مرحلہ پیسوں اور لفافوں سے طے ہو تو پھر بھی یہ آزاد صحافت کہلاتی ہے۔ لیکن عائشہ احسان ان باتوں کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ وہ مسلسل آگے بڑھتی ہے اور اپنا کام خوب انداز سے پورا کرتی ہے۔

وہ فضول پردے والی بات صحافتی مدوجزر اور نقصان وغیرہ کو روند کر حق و صداقت کی امین بن جاتی ہے اور ایک عورت بن کر ہمیشہ کامرانیاں سمیٹتی ہے۔ وہ عالم احمد کو منفی اقدامات سے روکنے اور شاہ رخ کو مثبت منازل کی طرف گامزن کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ اور ہر موڑ پر بامراد ٹھہرتی ہے۔ جہاں اس طویل ڈرامے میں اور امور، مسائل، کرداروں اور چیزوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہاں اشاروں کنایوں میں عائشہ احسان کے روپ میں صحافت، قومی کھیل، متعلقہ لوگوں اور ممبران کے بارے میں بہت حقائق تشت از بام کر دیئے گئے ہیں ایک عورت کو جہاں جہاں مسائل درپیش ہوتی ہیں ان کو بھی ظاہر کیا گیا ہے اور ایک عور تجس طرح ان مسائل کا مقابلہ کرتی ہے اور اپنے حقوق کا تحفظ کرتی ہے اُن کو بھی اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔

ڈرامہ نگار ذکیہ اکبر نے ڈرامہ مقدر کا چقندر میں ایک ایسے کنبے کو ظہور دیا ہے جو مادی اور بناوٹی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔

اس خاندان میں مختلف کردار ہیں جو بھائی، بہن، بھابی، کزن، بیوی، نوکر، نوکرانی، ماں، ڈاکو، شوہر، دادا اور مالک وغیرہ کے روپ میں اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔اس میں جو گھرانہ آباد دکھائی دیتا ہے وہاں لالچ، جھوٹ، چاپلوسی، مال و دولت کی حکمرانی، حقیقی رشتوں کی شناخت، برائے نام و نمود ملنا، وراثت، جائیداد اور بے اتفاقی وغیرہ صاف محسوس ہوتی ہے۔

ایک آدمی کی دو شادیاں ہوتی ہیں اور مقدم گھرانہ دوسری اور اس کے بیٹے کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ جب وہ لوگ بھی یہاں شہری گھر و مکان میں آتے ہیں تو اولین لوگ اس کو نکالنے، اس کو شرمسار کرنے اور تمام دولت ہتھیانے کے لیے مختلف شیطانی منصوبے بناتے ہیں۔ نیا آنے والا کنبہ ایک لحاظ سے گنوار ہوتا ہے اور خاص کر مرکزی کردار متصدق تو خاصا کند ذہن اور نامعقول دکھائی دیتا ہے۔ایک شہری گھرانہ لباس، رکھ رکھاؤ اور بات چیت میں اونچے طبقے کی عکاسی کرتا ہے اور دوسری طرف دیہاتی خاندان سادہ لباس، عام گفتگو اور چال ڈھال سے نچلے طبقے کی تصویر پیش کرتا ہے۔

آگے کے مناظر میں شہری افراد اور گھر والے وراثت اور میراث کو آپس میں بانٹنے کی باتیں اور خفیہ منصوبے بناتے نظر آتے ہیں اور دیہاتی لوگ دولت و جائیداد کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور سب کے ساتھ ہنسی خوشی اور ایک جسم کی مانند وقت گزارتے ہیں۔اسی دوران متصدق کو ڈاکو یرغمال بناتے ہیں اور جب گھر والے تاوان ادا نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ آدمی واپس ہی نہ آئے تو وہ لوگ متصدق کے کردار اور اچھے اخلاق سے متاثر ہو کر یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہیرو ڈاکو کو بھائی بھائی کہتا ہے اور ان کی بہن رضیہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

وہ گھر آکر اصل شکل و صورت یعنی نہایت نفیس سوٹ بوٹ میں ملبوس ہو کر سب کو حیران کرتا ہے۔ وہ اور اس کی ماں کہتی ہے کہ ہم صرف آپ کو دیکھنا اور آزمانا چاہتے تھے ہم کو مال و دولت اور وراثت میں کچھ بھی نہیں چاہیے۔بس ہم سب بھائی بھائی اور اپنے ہیں۔

ڈرامے کے اختتام پر ہیرو رضیہ سے شادی کا اعلان کرتا ہے اور سب گھر والے اور تمام افراد خوشی خوشی گلے ملتے ہیں اور ہنسی مسکراہٹ کا اظہار کر کے ساتھ نبھانے اور رہنے پر خوش ہوتے ہیں۔

ذکیہ اکبر کے تحریر کردہ اس ڈرامے میں عورت سے متعلق جو بنیادی حقوق اور مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں دوسری شادی اور وراثت سرفہرست ہے۔

اس خاندان کے سب سے بڑے سربراہ کا نام ذکی الدین، پھر دادا رضیالدین اور بیٹے معین الدین کا ذکر ہوتا ہے۔ معین الدین دو شادیاں کرتا ہے اور یہاں سے مسائل کا آغاز ہوتا ہے۔آگے مذاق مذاق میں وکیل ۱۳۷ وصیت

ناموں اور پھر ان کی منسوخیوں کا بھی بیان جاری کرتا ہے۔ بے شک یہ ایک مزاحیہ ڈرامہ ہے اور مختلف کرداروں کا تعلق بھی ہنسی مذاق سے دکھایا گیا ہے مگر یہاں بہت اہم امور اور مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دوسری شادی سے اکثر گھرانے برباد ہوتے ہیں۔ بجا ہے کہ ایک شخص آسانی سے دوسری شادی کر سکتا ہے لیکن اگر حالات اور معاملات سازگار نہ ہوں تو پھر یہ قدم اُٹھانے میں سو مرتبہ سوچنا ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل سے انسان کے اوقات تقسیم ہوتے ہیں اور پھر بھی زیادہ تر مرد اور گھرانے صحیح خوشی اور خوشحالی پا نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ حقوق و فرائض سے متعلق مختلف سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک گھرانے کی طرف کم توجہ اور دوسرے افراد کو صحیح توجہ دینے سے بھی آنکھیں کبھی اُٹھتی ہیں اور کبھی نیچے ہو جاتی ہیں۔

اس ڈرامے میں ایک گھرانہ شہری اور دوسرا دیہاتی دکھایا گیا ہے۔ ایک جانب بڑا کنبہ ہوتا ہے جہاں میاں بیوی، کزن، نوکر نوکرانی اور ایک وکیل کردار کا بیان جاری ہوتا ہے کہ جب بڑے صاحب نہیں رہے تو میرا اور ہمارا کتنا حصّہ ہوگا اور اس کی تقسیم کیسے ہوگی۔ ہر کردار اسی مادی سوچ کا شکار ہوتا ہے کہ مال و دولت کتنی ہوگی اور میں نے فلاں فلاں جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کے بدلے کتنی دولت ملے گی۔ اب جب یہی سوچ ہوگی تو ان میں ایک خاتون کا کیا حال ہوگا۔ اس طرح جائیداد بارے کافی کچھ کہا گیا ہے۔

اگر ایک طرف عورت کو سنجیدہ اور درست کردار میں سامنے لایا گیا ہے اور وہ قانون کے مطابق اپنے حصے کے بارے میں فکر مند ہے تو دوسری طرف ایک ایسی عورت یا عورتوں سے بھی ملاقات ہوتی ہے جو لالچی اور جاہل ہوتی ہیں۔ ان دونوں کو ذہنی اور فکری لحاظ سے پسماندہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس گھرانے میں اگر صحیح تعلیم و ترتیب ہوتی اور مردوں کا ہونا ایک انعام ہوتا تو پھر یہی عورت اپنی اصلیت اور اہمیت سے آشنا ہوتی۔ وہ آسانی سے جان لیتی کہ یہی میرا حق ہے اور وہ میرا فرض ہے، یوں یہاں پر عورت مختلف منفی سوچوں میں اسیر ہے۔

ایک خوش حال گھرانے سے جب وکیل صاحب کی دوسری شادی کا ذکر کرتا ہے تو ایک ماتم کا سماں اور منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اب خود بہ خود پتہ چلتا ہے کہ جب شادی کا نام جنم لیتا ہے تو اگلے مناظر اور مراحل کس طرح زہریلے ہوں گے۔ بجا ہے کہ جس طرح اس ڈرامہ میں فساد کا دور شروع ہوتا ہے تو اس میں مرکزی کرداروں یعنی ماں اور بیٹیوں کا ہی بُرا حال ہوتا ہے۔

دوسری شادی سے یہ نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ مرد اپنے فیصلوں میں آزاد اور بے چاری عورت قیدی کی طرح زندگی گزارتی ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ایک جھلک یہ دکھایا گیا ہے کہ عورت کو مشاورت اور فیصلوں میں شامل نہیں کیا

جاتا۔ وہ محکوم زندگی گزارتی ہے اور گھر کے مرد کرداروں کے آسرا پر صبح شام کرتی ہے۔ واقعی یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے جس سے ہر کنبے کی عورت دوچار ہے۔

اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ عورت کو اظہار رائے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ یہ عمل یا فکر عورتوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ ہے کہ ظاہری طور پر ایک گھرانہ اسی عورت سے آباد ہوتا ہے مگر جب خاص مواقع آتے ہیں تو پھر عورت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور یہ تصور بھی ظلم کے مترادف مانا جاتا ہے کہ اب ایک عورت بولے گی یا وہ مردوں کے ہوتے ہوئے بات چیت میں حصّہ لے گی۔ اسی طرح اس ڈرامے میں امتیازی سلوک والے رویے کی طرف بھی واضح اشارے موجود ہیں۔

اسی طرح یہ دولتیے لوگ مطلق العنان بن کر یک طرفہ فیصلے کر کے عورتوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ اولین عورت سے اجازت لی جاتی۔ اس سے مشورہ طلب کیا جاتا اور اُس کی مرضی سے دوسری شادی ہو جاتی۔ اگر ایک عورت اپنے تحفظات پیش کرتی اور باہمی صلاح و مشاورت سے اگلا قدم اُٹھایا جاتا تو یقینی طور پر عورت اس قدر مفلوج اور مسائل میں گھری نہ ہوتی مگر افسوس صد افسوس کہ ہر سماج میں عورت کے ساتھ یہ ظلم جاری ہے اور پتہ نہیں کب تک جاری رہے گا۔

پرانے گھر اور نئے گھر نے اس ڈرامے میں کچھ اور کرداروں کو جگہ دی ہے۔ دوسرے بیٹے متصدق کا گھر میں آنا اور ایک عنوان پر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ نہایت سادہ اور بے وقوف لگتا ہے اور گھر والے اُس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر ہر جگہ فقرے کستے ہیں۔ یہ کردار نوکر و نوکرانی کا ہاتھ بٹاتا ہے، پودوں اور درختوں کو پانی دیتا ہے اور ساتھ گھر کے تمام اُمور سرانجام دینے لگتا ہے۔ وہ کارخانے بھی جانا شروع کرتا ہے اور گھرانے میں سے ہر ایک کی مان کر اور بیگار میں لگا رہتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتا ہے اور گھر کے تمام افراد کے لیے یہ ایک قیمتی اثاثہ بن جاتا ہے۔

آگے کے مناظر میں ہیرو کو اغوا کیا جاتا ہے۔ ڈاکو گھر والوں سے پیسوں کا مطالبہ کرتے ہیں مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہاں پر رضیہ سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ماں بیٹی مل کر متصدق کو آزاد کرا لیتے ہیں۔ وہ گھر آ کر سب کو تحفے دیتا ہے، بے بے بھی ساتھ ہوتی ہے، سب گھر والے نہایت خوش ہوتے ہیں، ہیرو پینٹ شرٹ میں ملبوس ہوتا ہے اور بہت سنجیدہ اور باوقار لگتا ہے۔

ہیرو اور اس کی ماں جائیداد کو چھوڑنے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ رشتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور رضیہ سے نکاح کی بات بھی پکی ہو جاتی ہے۔ وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم سب ایک ہیں، محبت اور پیار سے بڑھ کر ہیں، رشتے اور اپنے لوگ مقدم و

مقدس ہیں اور انسانیت کی دولت ایک عظیم سرمایہ ہے۔ وہ لوگ بار بار گلے ملتے ہیں، ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں اور یوں ہنسی خوشی اس ڈرامے کا اختتام ہوتا ہے۔

بے شک اس ڈرامے میں عورتوں سے متعلق جتنے بھی مسائل ہیں ان پر بعض اوقات کھل کر بات کی گئی ہے اور بعض پر اشاروں کنایوں سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی معاملات اور مسائل میں سے عورتوں کی اظہار رائے نہ ہونے، امتیازی سلوک خاص کر موروثی جائیداد اور جہیز پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کا تعلق چاہے گاؤں سے ہو یا شہری زندگی سے، اُن کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔ تمام عورتیں گھر اور چار دیواری سے لے کر دیگر اہم موضوعات پر کھل کر بات کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ اسی طرح کسی بھی قانون کے تحت یہ نہیں ہے کہ خواتین سے فرق و امتیاز رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ نسلی و موروثی جائیداد میں سب بچیوں کا باقاعدہ حق ہوتا ہے اور جہیز سے متعلق تمام معاملات پر عورتوں کے ساتھ استحصال کا سوچ بالکل غلط ہے۔

ڈرامہ سائیں اور سائیکاٹرسٹ میں بہت سے کردار ہیں جن کے مرکزی کرداروں میں ڈاکٹر، میاں بیوی اور ایک پیر صاحب ہیں۔ شروع کے مناظر میں ایک عام ڈاکٹر کو دکھایا جاتا ہے جس کے پاس بیگم وحید اپنی بیٹی کو علاج کے لیے لے کر آتی ہے، وہ کہتی ہے کہ میری بیٹی ہر وقت مسکراتی رہتی ہے اور پر سکون زندگی گزارتی ہے جب کہ زندگی میں خفا ہونا اور بور ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو مشہور سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر بدر سے ملنے کا مشورہ دیتا ہے۔ بیگم وحید وہاں پر بھی یہی رونا روتی ہے اور ڈاکٹر بدر کچھ دوائیاں اور آرام کا بتا کر باقاعدہ علاج شروع کر دیتا ہے۔

دوسرے منظر میں میاں بیوی ڈاکٹر بدر کے کلینک میں موجود ہوتے ہیں اور میاں اپنی بیوی کے غصّے اور عجیب حالت کا بتا کر علاج کرنے کی بات کرتا ہے۔ ڈاکٹر بدر بہت کوشش کرتے ہیں اور خاصا بہتر علاج کرتے ہے مگر افاقہ نہیں ہوتا اور بیماری ایک طرح سے بڑھتی ہے۔ آئے روز مریضوں کی حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔

آخری اور تیسرے منظر میں یہ میاں بیوی موٹر کار میں ایک پر سکون ماحول کو پانے کے لیے روانہ ہوتے ہیں ۔ گاڑی خراب ہونے اور پانی کی طلب سے یہ دونوں ایک ڈیرے پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں پر ایک پیر صاحب سے ملتے ہیں اور بیگم پیر صاحب کی دانش بھری گفتگو اور سنجیدہ باتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ یہ خاتون اپنی بیماری اور غصّے کی حالت کو بھول کر خوش و خرم زندگی کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اب میاں بیوی بہت محبت اور خوشی سے آگے بڑھتے ہیں اور تمام غم و بیماری سے نجات پاکر ہر لحاظ سے خوشحالیوں اور شادمانیوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور دونوں ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔

ویسے تو یہ ڈراما کچھ نفسیاتی مسائل پر ہے مگر ایسے کردار اور افراد بھی نظر آتے ہیں جن کا تعلق بعض نسوانی حقوق اور بنیادی مسائل سے بھی ہے۔ بیگم وحید ایسا ہی ایک ضمنی کردار ہے جس کو یہ بیماری لاحق ہے کہ اس کی بیٹی کبھی بوریت اور بے زارگی محسوس نہیں کرتی۔ وہ خیال کرتی ہے کہ انسان کی دنیا میں ہنسی خوشی اور ناامیدی و پریشانی دونوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں پر اکیلی عورت کا ڈاکٹر کے پاس جانا اور اپنی بیٹی کے حوالے سے پریشان ہونا بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ اگر کسی گھر و گھرانے میں مرد نہ ہو اور تمام معاشی، گھریلو، سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا بوجھ ایک بیوہ یا تنہا خاتون پر پڑے تو واقعی ایک مشکل کاج ہے۔ اس مرحلے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا ہے اور اپنی انا اور عزت کا صحیح خیال رکھنا اور سماج کے منفی کرداروں سے خود کو محفوظ رکھنا اور تمام اندرونی و بیرونی امور کی بروقت صحیح تکمیل واقعی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ کیا اس طرح کی خواتین کی توقیر مثبت خطوط پر ہونا ممکن ہے، کیا موجودہ معاشرہ میں یوں غریب عورت کو اکیلے پاکر حفاظت کے قوانین اور اقدامات کی عملی صورت موجود ہے، جو بچی والدہ کے ساتھ علاج معالجے اور مردوں کے معاشرے میں مختلف ضروریات کے تحت باہر آتی جاتی ہے، کیا وہ قانونی اور سماجی پناہ میں ہے ہر گز نہیں۔ لہٰذا اکیلی خواتین اور تنہا عورتوں کی شرم و حیا کا خیال رکھنا ہم سب کا اور خاص کر ریاست کا فرض بنتا ہے۔ بیگم وحید تو ڈاکٹر کو بیٹی کی بیماری کا بتا کر بری الذمہ نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر لمحہ غور و فکر کرتی ہے اور بیٹی پر گہری نگاہ رکھتی ہے۔

جب بیٹی اور ایک عورت کو خود ایک ماں غیر معلوم بیماری اور کمزوری میں گرفتار مانتی ہے اور مختلف ڈاکٹرز اور مرد معالجوں سے علاج کروانے میں عافیت سمجھتی ہے تو یہ ایک الگ المیہ و مسئلہ ہے۔ اگر ایک عورت کو شروع ہی سے صحیح خطوط پر مبنی علاج معالجے کی سہولت میسر ہو اور اس کی صحت و تندرستی صحیح سالم ہو تو پھر شاید اس طرح کی غیر معمولی سوچ یا عمل سامنے نہ آئے۔

زیبا اور نعیم اس کھیل کے مرکزی کردار ہیں۔ شوہر اپنی بیوی کا صحیح خیال رکھتا ہے اور دنیا بھر کی سہولیات بھی فراہم کرتا ہے مگر اس کے باوجود بیوی کو جھگڑالو، غصّہ ناک اور شر پسند دکھایا گیا ہے۔ دراصل بیوی زیبا کو ایک ذہنی بیماری لاحق ہوتی ہے اور وہ اکثر غصّے اور شر کا اظہار صرف اداؤں اور اشاروں سے کرتی ہے۔ وہ کھل کر اپنے تحفظات کا اظہار نہیں کرتی اور اندر ہی اندر سلگتی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورت کو جس قدر بنیادی حقوق حاصل ہے ان میں درست تعلیم سے لے کر صحیح تربیت تک کے سارے مرحلے شامل ہیں۔ اکثر گھروں میں بچیوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و علاج کا بروقت اور کما حقہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کے ساتھ اُن کو اظہار اور اپنے خیالات کو پیش کرنے کے صحیح مواقع فراہم نہیں ہوتے اس لیے ان میں چڑچڑا پن ضم لیتا ہے اور وہ خود کو غیر محفوظ اور تنہا محسوس کرتی ہیں۔ شوہر نعیم اور ساس بہت کوشش کرتے ہیں کہ زیبا نارمل ہو اور ہنسی خوشی زندگی گزارے مگر اس کی خُو اور عادت سے سارا گھر ویران اور سب گھر

والے پریشان رہتے ہیں۔ اگر ہم اپنی عورتوں اور بچیوں کو مثبت خطوط اور اعلیٰ اقدامات سے خو گر کریں، ان کی نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے مقررہ اوقات کا تعین کریں۔ ان کی جان و آبرو کے لیے تعلیم و تربیت اور صحت و علاج کا صحیح خیال رکھیں اور سب سے بڑھ کر ان کے ساتھ فرق اور امتیازی سلوک کا طریقہ نہ رکھیں اور ان کو ہر معاملے میں شریک رکھیں اور ان کی رائے کو اہمیت دیں تو پھر زیبا والی صورت حال پیدا نہ ہو گی۔

آخری حصّے میں یہ میاں بیوی ایک مختصر سیر کے لیے باہر چلے جاتے ہیں اور وہاں راستے میں ایک سائیں آدمی سے ملاقات ہو جاتی ہے تو زیبا پر اس کی اعلیٰ ظرفی اور بہترین خیالات کا نہایت مثبت اثر ہوتا ہے۔ اب زیبا نارمل ہو جاتی ہے اور میاں بیوی اس شریف مرد اور پارسا شخص کے ڈیرے سے ہنسی خوشی واپس آتے ہیں اور آگے نہایت خوشی اور محبت سے زندگی گزارتے ہیں۔

یہاں نتائج کے طور پر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر ایک عورت کو بنیادی حقوق اصل زندگی سے وابستہ سہولیات اور ان کو فطری و سماجی اصولوں کے مطابق اظہار رائے اور برابری کے موافق حیثیت دی جائے تو پھر کسی بھی سطح پر عورت اور معاشرے میں بگاڑ اور جنگ کی صورت حال پیدا نہیں ہو گی اور ہر کردار اپنے حقوق، فرائض، اُمور، ذمہ داریوں اور زندگی کو گل زار بنانے کے لحاظ سے نہ صرف خود مطمئن اور خوش ہو گا بلکہ دوسروں کے لیے بھی سکون اور راحت کا باعث بنے گا۔

(ہ) صحت کا مسئلہ:

طویل دورانیے کا کھیل ساگر کا آنسو حسینہ معین کی غربت، عورت اور بیماری جیسے موضوع پر لکھی ہوئی ایک کہانی ہے۔ یہ کھیل ایک مچھیرے جس کا نام شانو ہے سمندر کے کنارے اپنے خاندان کے ساتھ نہایت کسمپرسی کی حالت میں گوٹھ پر زندگی گزارتا ہے پر مبنی ہے۔ شانو نہایت ہی غریب اور محنتی آدمی ہے۔ اس کے خاندان میں سارا (بیوی) گلُو (بھائی) اور مومل (بیٹی) ہوتے ہے۔ شانو اپنی بیوی سارا سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی بیٹی کو جب بچھو کاٹتا ہے تو گھر میں ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ سب بہت پریشان ہوتے ہے۔ مگر اس کے پاس علاج معالجے کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ شانو انتہائی پریشانی کی حالت میں ساحل پر مچھلیاں پکڑنے جاتا ہے اس ارادہ کے ساتھ کہ زیادہ محنت کرونگا اور بہت ساری مچھلیاں پکڑ کر بھیجوں گا تاکہ مومل کا علاج ہو سکے۔ اس کو ساحل پر موتی مل جاتا ہے۔ شانو موتی کو دیکھ کر انتہائی خوش ہوتا ہے اور خوشی خوشی گھر آکر سب کو بتاتا ہے۔ پورے گاؤں میں موتی ملنے کی خبر پھیل جاتی ہے۔ سب مبارک باد دینے آتے ہیں مگر یہ موتی گھر میں انتہائی برے دن لانے کا سبب بنتا ہے۔ شانو اور اس کی بیوی میں آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں

پورا گھر بے سکون ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سارا، شانو اور گھر کو چھوڑنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ مجبور ہو کر شانو دوبارہ موتی سمندر میں پھینک دیتا ہے اور گھر میں خوشیاں اور سکون لوٹ آتا ہے۔

ڈرامہ ساگر کا آنسو دراصل ایک ایسی حقیقت پر مبنی کہانی ہے جس کے لیے ہر وقت انسان تیار رہتا ہے۔ایک مرد ہر لحاظ سے اپنے گھر اور گھر والوں کا خیال رکھنے کے لیے دل و جان سے محنت و کوشش کرتا ہے۔اپنے خاندان کو خوش رکھنے کے لیے خون پسینے کی کمائی لاتا ہے تاکہ زندگی سکون و آرام سے گزرے۔

شانو جو کہ گھر کا سربراہ ہوتا ہے وہ تمام وقت اس سوچ میں رہتا ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر اپنے گھر والوں کے عیش و آرام کا سامان کرے۔وہ ہر دن نئی امید کے ساتھ ساحل پر مچھلیاں پکڑنے جاتا ہے مگر قسمت ساتھ نہیں دیتی لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ساگر کا آنسو میں زندگی میں ہزاروں خواہشوں کی ناممکن تکمیل کی ایک مایوسانہ تحمل کی جھلک ملتی ہے۔ساگر کا آنسو ایک انگریزی ناول کا ترجمہ ہے جس میں یہ سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ دولت سورج کی روشنی ہے جس کی چمک دمک انسان سے اس کی حقیقی خوشیاں چھین لیتی ہے جبکہ غریبی یا غربت انسانوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد بناتی ہے۔ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور محبت و پیار کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔اس روشنی کے حصار میں انسان کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور سوائے خوابوں کے اسے کچھ نظر نہیں آتا۔شانو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا وہ گھر اور گھر والے جن سے وہ بہت محبت کرتا تھا آہستہ آہستہ بھولنے لگتا ہے اسے صرف اور صرف موتی دکھائی دیتا ہے۔سارا اس کی بیوی جس نے ہر مشکل وقت میں شانو کا ساتھ دیا تھا اور اسے زندگی کی ایک نئی صبح کی امید دیتی ہے سے لاپرواہو جاتا ہے۔اب اس کے لیے اپنی بیوی میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی شانو اس سے ہر وقت جھگڑتا ہے اس کو بات بات پر ٹوکتا ہے۔ اس کا یہ رویہ دیکھ کر سارا کو بہت دکھ ہوتا ہے اور وہ تنگ آکر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے،

مگر جلد ہی اس کے شوہر کو احساس ہو جاتا ہے کہ واقعی موتی سے وابستہ جھوٹے خوابوں نے اس سے زندگی کی حقیقی خوشیاں چھین لی ہیں۔اس سے اس کی محبت یعنی سارا جیسی بیوی کو چھین لینے کی کوشش کی ہے وہ موتی کو دوبارہ سمندر میں پھینک کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مادی آسائشوں سے زندگی گل و گلزار نہیں ہوتی بلکہ عورت کی سچی محبت و پیار مرد کے آرام و سکون کا باعث بنتا ہے۔دیکھا جائے تو یہی اصل حقیقت ہے۔مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں چاہے جیسے بھی حالات ہوں اگر یہ ایک دوسرے کے لیے مثبت سوچ رکھیں ایک دوسرے کے لیے کمربستہ ہو اور ہر مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ رکھنے کا عہد رکھتے ہوں تو زندگی کے کسی موڑ پر ان کو ناامیدی اور مایوسی کا دامن نہیں پکڑنا پڑتا اور ہمیشہ سرخرو ہوتے ہیں۔

بانو قدسیہ کی لکھی ہوئی تحریر سرخ بتی ایک جدت پسند اور امیر گھرانے کی لاپرواہماں کے زیر سایہ پلنے والے بچوں کی عکاسی کرتی ہے۔

انسان کی شخصیت پر سب زیادہ اثرات ماں ہی کے ہوتے ہیں اور در حقیقت بچوں کی پرورش میں والد سے زیادہ ماں ہی مصائب و تکالیف برداشت کرتی ہے۔اس حوالے سے ماں جن تکالیف و مراحل سے گزر کر اولاد کو پیدا کرتی ہے اور پرورش کرتی ہے وہ اس کی خدمت اور احترام کے متقاضی ہیں۔مذہب اسلام بھی ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسن سلوک کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ایک ماں چاہے کسی بھی قوم یا نسل سے ہو اولاد کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیتی ہے۔اس کی محبت پر خلوص اور بے ریا ہوتی ہے۔وہ اپنی جان سے بڑھ کر اولاد کو چاہتی ہے۔بچوں کے لیے اس کا پیار ایک فطری امر اور جذبہ ہے۔

مگر بعض دفعہ حالات، مصروفیت، لاپروائی، دباؤ یا کسی اور وجہ سے مائیں بچوں کی ویسی تربیت نہیں کر پاتیں جیسا کہ اُن کا حق ہوتا ہے۔زیادہ تر امیر گھرانوں کے بچے والدین کی بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے بے راہ روی اور جہالت کا شکار ہوتے ہیں۔بچوں کی پرورش میں والد سے زیادہ ماں کا کردار اہم ہوتا ہے اگر وہ ہی بچوں سے بے خبر اپنی زندگی پر توجہ دے بچوں کے لیے وقت نہ نکالے اور اس کو نوکروں کے ہاتھ چھوڑ کر بڑا ہونے دیں تو گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ایسے بچے بڑے ہو کر بد تمیز، ناکام، باغی، خود سر اور کبھی کبھی شدید بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔بچوں کے ساتھ وقت گزارنا، ان کی زندگی کو باترتیب بنانا انھیں اخلاقیات کا درس دینا والد سے زیادہ ایک ماں ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے کیونکہ مرد روزی کمانے کے سلسلے میں زیادہ تر اوقات گھر سے باہر ہی گزارتا ہے۔ایسے میں چونکہ ماں ہی زیادہ تر گھر پر ہوتی ہے تو اس کی عادتیں اور خصلتیں اولاد میں زیادہ سرائیت کرتی ہیں۔اس کے برعکس سیٹھ سکندر کے بچے میاں بیوی کی لاپرواہی سے ضدی اور ہٹ دھرم ہو جاتے ہیں۔سکندر کے چار بچے تنزیلہ، نوفل، ساجد، اور زارہ ہیں جو زیادہ تر وقت نوکروں کے ساتھ گزارتے ہیں۔اس لیے وہ نہ پڑھائی میں اچھے ہوتے ہیں اور نہ ہی اخلاقی طور پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔اس ڈرامے سے ایسی عورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بچوں، شوہر اور گھر سے زیادہ اپنی خواہشات، پسند ناپسند اور عیش و آرام کو ترجیح دیتی ہیں۔ایسی عورتیں سماج میں بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔

سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے خدیجہ مستور کا نام بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔عورت کی ذات اور مسائل کو انھوں نے شعوری طور پر اپنی تحریروں کا مرکز و محور بنایا۔ان کے ڈراموں میں عورت ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ان کا لکھا ہوا ڈرامہ خرمن میں کنیز کا کردار جذباتیت کا شکار نظر آتا ہے۔خدیجہ مستور برصغیر کی عورت کو فکری حوالے سے سیاسی اور سماجی شعور بھی بخشتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کا بڑا

موضوع عورت اور جنس ہے۔نفسیاتی مطالعہ،ماحول،غربت،اور گھٹن کو وہ اس کے پس منظر میں بیان کرتی ہے۔ہمیں خدیجہ مستور کے ڈراموں اور افسانوں میں عورت ذات کے مسائل و مشکلات کی نشاندہی،معاشرے میں اس کے جائز حقوق کی پامالی اور اس مظلوم ذات کے استحصال پر کڑی نقطہ چینی نظر آتی ہے۔خدیجہ عورت کی افتاد طبع،اس کی نفسیات، اس کے جذبات واحساسات،اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں رائے وزن رکھتی ہے۔ٹیلی تھیٹر میں طویل دورانیے کا کھیل ''خرمن'' پیش کیا گیا۔خدیجہ مستور کے لکھے ہوئے اس ڈرامے میں ایک غریب یتیم بے سہارا لڑکی کی روداد بیان کی گئی ہے۔جس کا نام کنیز تھا۔کنیز کی شادی معاہدے کے مطابق ایک شادی شدہ آدمی،دو بچوں کے باپ سے ہو جاتی ہے۔سکینہ دین محمد کی پہلی بیوی ہے۔جو بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے۔بے چاری کنیز سب جانتے ہوئے بھی دین محمد کے ساتھ ایک روشن مستقبل کے خواب بُنتی ہے۔اس چھ ماہ کے دوران کنیز دین محمد،(پہلی بیوی)سکینہ،بچوں اور گھر کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔حتٰی کے مویشیوں تک کی دیکھ بھال بھی اس کے ذمہ تھی۔وہ یہ سارے کام نہایت خلوص،محبت اور ایمانداری سے سرانجام دیتی ہے۔سکینہ کا سوکن نہیں بلکہ بہن کی طرح خیال رکھتی ہے۔اپنی ہر خواہش اور جذبہ پر سکینہ کو اہمیت و ترجیح دیتی ہے۔سکینہ جب ہسپتال داخل ہوتی ہے تو کنیز پہلے سے زیادہ گھر اور بچوں کا خیال رکھتی ہے مگر ان سب کے باوجود دین محمد سکینہ کے مرنے کے بعد معاہدے کے مطابق کنیز کو طلاق کے کاغذات تھما دیتا ہے۔

اس ظالم مرد کے دل میں سکینہ کے لیے رحم کا کوئی گوشہ نہیں ہوتا۔غربت،سماج اور معاشرے کی ستائی ہوئی عورت کے لیے پہلی اور آخری امید،مسکن وٹھکانہ شوہر کا گھر ہوتا ہے۔مگر بہت زیادہ اطاعت وفرمانبرداری کے باوجود بھی بہت ساری عورتیں اس بنیادی سہولت وحق سے محروم رہتی ہیں۔عورت جب ماں باپ کے گھر ہوتی ہے تو اس کو اس وجہ سے اہمیت نہیں دی جاتی کہ وہ پرائے گھر کی امانت ہوتی ہے۔اور شوہر کے گھر میں اس لیے قابل عزت نہیں گردانی جاتی کہ وہ دوسرے گھر سے آئی ہوئی ہوتی ہے۔

کنیز کی قسمت میں کہیں بھی سکھ نہ تھا۔اس کا بھی کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔کیونکہ وہ غریب تھی۔بے سہارا تھی۔اور سب سے بڑھ کر کہ وہ ایک عورت تھی اور وہ بھی سانولی اور عام سی شکل کی۔عورت اگر سرخ و سفید ہو تو ہمارے معاشرے میں اس کے لیے گھر بسانے میں اتنی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بہ نسبت ایسی عورتوں یا لڑکیوں کے جو معمولی شکل وصورت کی مالک ہوں۔مگر کنیز تو غریب ہونے کے ساتھ کالی اور بدصورت بھی تھی۔اپنے ساتھ بہت سارا بھاری بھر کم جہیز بھی لے کر نہیں آئی تھی۔اس کا شوہر کس طرح اسے عزت دیتا۔حالانکہ وہ ایک سمجھدار،خدمت گزار اور محبت کرنے والی عورت تھی۔مگر دین محمد کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔دین محمد کی بیوی سکینہ بیمار ہو

کر بھی اس کو گھر کی نوکرانی سمجھ کر برتاؤ کرتی اور اس سے ہر قسم کا برا سلوک روا رکھتی مگر کنیز بے چاری نے اس کی باتوں کا کبھی برا نہیں منایا۔ اور ہمیشہ پہلے سے بڑھ کر خیال رکھتی۔ کنیز دن بھر محنت و مشقت کرتی۔ سوکن اور شوہر کی باتیں سنتی۔ مگر کسی سے کوئی گلہ شکوہ زبان پر نہ لاتی۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں رہی تھی۔ مگر وہ بے بس تھی یہاں ٹھکانہ اور دو وقت کی روٹی تو مل رہی تھی۔ اگر وہ یہاں سے بھی چلی جاتی تو ظالم سماج اس کا جینا پہلے سے زیادہ دوبر کر دیتا۔ تھک ہار کر وہ رات کو خود اپنے آپ کو دل کا حال سناتی۔ کیونکہ اس کی فریاد سننے والا اس کی ذات کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ کنیز خود سے مخاطب ہو کر۔

''کنیز: بن باپ کا جان کر جگ نے کتنا ستایا ساروں نے اپنی عورت سمجھ لیا پرایک نے بھی گھر نہ بٹھایا۔ جالم مار کر پانی بھی نہ دیتے اور تو بے سرم پھر بھی تلیا میں نہ ڈوب مری۔ یہ جندگی بھی کیسی چیج ہوتی ہے، اپنے ہاتھوں نہیں لی جاتی۔''(۳)

خواب کمخواب ''ٹیلی تھیٹر'' سلسلے کی ایک کہانی ہے۔ جس میں ایک مظلوم، غریب، ان پڑھ عورت رقیہ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ وہ بنیادی سہولتوں سے محروم نہایت ہی غریب والدین کی بیٹی ہوتی ہے۔ رقیہ کا شوہر اس کو معذور بچی کی پیدائش کے جرم کی پاداش میں گھر سے نکال دیتا ہے۔ غریب رقیہ بچی کو لے کر والدین کے گھر آجاتی ہے۔ وہ زار و قطار روتی ہے۔ حتٰی کے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ نفسیاتی مریضہ بن جاتی ہے مگر اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ایک دن وہ تنگ آکر اپنی بچی کو بہت مارتی ہے اور برا بھلا کہتی ہے اور اپنی بد قسمتی اور تباہی کا ذمہ دار اس بچی کو ٹھہراتی ہے۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو توجہ طلب ہے۔

''رقیہ: چڑیل تو نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ تجھے میں نہیں چھوڑونگی۔ تو نے مجھے تباہ کیا ہے۔ میں نہیں چھوڑونگی تمہیں، تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

سہیلی 1: چھوڑ اس کو، اپنے جگر کے ٹکڑے کو کوئی ایسے مارتا ہے۔

رقیہ: نہیں ہے یہ میرے جگر کا ٹکڑا۔ اسی نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

سہیلی: رقیہ تو تو جھلی ہو گئی ہے۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے۔

رقیہ: سارا قصور اس کا ہے سارے کرتوت اس کے ہیں۔ یہ نہ ہوتی تو آج میں سکھی ہوتی۔

پڑوس کی لڑکی: آپا ماں کا دل تو اتنا پتھر دل نہیں ہوتا۔

سہیلی: یہ چچا حسین بخش کی بیٹی ہے۔اور کون ہے۔

رقیہ: (جوتا اٹھا کر) چل جا یہاں سے چلی جا۔

پڑوسن کی لڑکی: آپا اس میں تیرا قصور نہیں ہے تجھ پہ رب کی مار ہے۔

رقیہ: چل دفعہ ہو جا یہاں سے۔

بھائی نادر علی: آپا کچھ تو خیال کیا کر،ادھر کالے جنگل تک اس معصوم کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔

رقیہ: میں کسی دن سارا قصہ ہی ختم کر دوں گی،گلہ دبا دوں گی اس کا گلہ۔''(۴)

مستنصر حسین تارڑ کے اس ڈرامے میں رقیہ کی شکل میں ہر اس عورت کی زندگی کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جو معذور اولاد کو جنم دیتی ہے۔معاشرہ کی صحت اور بقا کا ضامن شوہر اور بیوی کا رشتہ ہوتا ہے۔یہی سماجی معاہدہ دو طرفہ تعلقات کا مرکز و محور ہوتا ہے۔مگر اس رشتے میں بگاڑ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔مردانہ حاکمیت کی بدولت تصادم کی صورت میں بگاڑ کا سارا نزلہ عورت ذات پر گرتا ہے چاہے قصور وار مرد ہی کیوں نہ ہو۔اولاد کی پیدائش میں ماں سے زیادہ باپ کا حصہ ہوتا ہے۔مگر اولاد نہ ہونا، مخالف جنس کی پیدائش، معذور اولاد کی پیدائش کا ذمہ دار ہمیشہ ہمارا معاشرہ عورت کو ہی ٹھہراتا ہے۔مندرجہ بالا کسی بھی صورت حال کے رونما ہونے پر عورت کی زندگی مرد اور سسرال کے ہاتھوں اجیرن ہو جاتی ہے۔اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔مگر اس کو ہر حال میں یہ سب سہنا پڑتا ہے۔اس جرم کے پاداش میں بہت ساری خواتین کو مختلف قسم کے سماجی، معاشی، نفسیاتی و جسمانی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بیٹی کی پیدائش پر سسرال میں عورت کی وہ عزت نہیں ہوتی جو بیٹے کے پیدائش پر ہوتی ہے۔بچی کی پیدائش کے عمل سے لے کر اس کی شادی تک کا عرصہ والدین کے گھر میں ہر قسم کے تفرقات کا حامل ہوتا ہے۔اس کی ماں کی طرح اس کو بھی وہ گھریلو حیثیت اور بنیادی حقوق نہیں دیئے جاتے جو اس کی ماں کا حق تھا۔بہت ساری عورتوں کے اوپر سوکن کو بٹھایا جاتا ہے۔گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔اس سے ہر قسم کا نازیبا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔معاشی اور جسمانی استحصال کیا جاتا ہے۔زیادہ تر ایسی عورتوں کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔

رقیہ بے قصور تھی مگر اس کو معذور بچی کی پیدائش پر گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔وہ بچی کو باپ کے پاس چھوڑ کر دوبارہ بھی اپنے شوہر کے گھر آتی ہے مگر اس کا شوہر اس پر سخت غصہ ہوتا ہے اور اس کو دھکے دے کر دوبارہ گھر سے نکلنے کو کہتا ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ معذور بچے ہی پیدا کرے گی، کہہ کر طلاق دے دیتا ہے۔رقیہ کی شادی بعد میں ایک معذور مرد کے ساتھ ہو کر ہر طرح سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعے سے عورتوں کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عورت تقریباًہر دور میں حق و انصاف کی طلب گار اور مظلوم رہی ہے۔ مردوں کا جابرانہ وحاکمانہ تسلط صدیوں سے اس پر قائم رہا ہے اور مختلف صورتوں وطریقوں سے ناروا ظلم و ستم کا نشانہ بنتی آرہی ہے۔اس کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرنے کے لیے مرد نے اسے سماجی نظام کے حصار میں بند کر دیا۔اس کی پوری شخصیت کو کچلنے کی ہر طرح سے کوشش کی گئی۔اس شیطانی جال سے عورت کا خود کو نکالنا ناممکن بنا دیا۔وہ اس حد تک مجبور کر دی گئی کہ وہ اپنے تن بدن کو مرد کے وجود کا ہی ایک ضمیمہ سمجھے اور اس مرد مرکزی نظام میں مردوں کے واضح کیے ہوئے اس ضابطۂ اخلاق کا ہر طرح سے پابند بنالے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت ہمیشہ کم تر حیثیت رکھتی ہے۔عورت تاریخ میں ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آرہی ہے۔غلامی کے باقاعدہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی یہ غلام در غلام بنادی گئی تھی۔ کبھی بازاروں اور میلوں میں خرید وفروخت کے عمل سے گزارا گیا کبھی اس کو لونڈیوں کے درجے میں رکھا گیا۔ہماری تاریخ میں کچھ دور ایسے بھی آئے جب اس عورت کو ہمارے سماج میں برابر کا شریک بھی مانا گیا اور اسے پوری عزت اور اہمیت دی گئی۔ لیکن اس کے باوجود عورت مجموعی حیثیت میں زیادہ تر مظلوم ہی رہی ہے۔اس کو بنیادی حقوق جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے نہیں دیئے گئے۔

مذکورہ بالہ ڈراموں اور کرداروں کے زریعے زبردست پیرایے اور طرز بیان سے ٹھوس حقائق کو طشت از بام کیا گیا ہے کہ کس طرح ہمارے ہاں ایک عورت کے ساتھ ناروا سلوک اور غیر انسانی طرز عمل جاری ہے۔اگر ایک عورت غربت کی ماری ہوئی ہو، تعلیم سے صحیح معنوں میں آشنا نہ ہو۔احساس کمتری کے گرداب میں گرفتار ہو، طبقاتی امتیاز کی شکار ہو، شادی بیاہ کے فیصلے میں زیر عتاب ہو، رنگ و نسل کے نام پر پایہ زنجیر ہو، شکل وصورت کے لحاظ سے قابلِ قبول نہ ہو، آئیڈیل کے انتخاب میں لبِ خاموش کی مانند محض تماشائی ہو، اظہار رائے سے مکمل دور ہو، اولاد کی عدم توجہی سے زبوں حال ہو، مرد کی غلام اور گھر میں اسیر ہو، لوگوں کی طرف سے نفرت کی شکار ہو اور شروع تا اختتام صرف وفاداری اور خدمت گزاری پر معمور ہو، تو یہ کیا ہے، یہ کس کا کیا دھرا ہے، یہ حالت کیوں ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے، عورت کا کیوں اور کس وجہ سے ان صدمات، انعامات اور حالات کا سامنا ہے، عجیب مرحلہ فکر یہ ہے کہ ایک طرف اس عورت کو اس قدر بے حسی اور بے ضمیری سے آئے روز زخمی بلکہ نوچا جارہا ہے اور دوسری اسی کو اس کا ذمہ دار ٹھرایا جاتا ہے۔ہونا تو یہ چاہیے کہ اس ملک میں صرف تحریری اور گفتاری طور پر نہیں بلکہ عملی لحاظ سے ایسا قانون وضع ہو کہ جس کے سایہ میں عورت کو اکمل تحفظ حاصل ہو اور وہ ہر لحاظ گھر تا سماج اور مقامی سطح سے لے کر قومی سطح تک خود کو بہتر اور برتر محسوس کرے اور واقعی اس کو وہ تمام معیارات، سہولیات اور کمالات حاصل ہو جو کسی بھی زمین پر ایک آزاد بشر و شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔ فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی، آنکھ مچولی، امر بیل، کچے پکے رنگ، باجی ڈکشت، اب

میرا انتظار کر، فاؤل پلے، مقدر کا چقندر، کلو، ساگر کا آنسو، خرمن، آسمانی جوڑا اور سرخ بتی وغیرہ جیسی تمام ڈراموں میں عورتوں کے ان بنیادی مسائل اور حقوق کو مختلف کرداروں، حالتوں، حادثوں اور نتیجوں کی بدولت خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بتانے اور دکھانے کی بہترین کوشش کی گئی ہے کہ پہلے ان تمام بنیادی محرکات کا پتا لگانا بہت ضروری ہے کہ جن کی وجہ سے یہ عورت دگرگوں زندگی گزارتی ہے۔ پھر گھر تا سماج ان رویوں اور کرداروں کو ظاہر کیا گیا ہے جو عورتوں کے ساتھ روایتوں، رواجوں، خاندانی مسلوں اور فرسودہ خود ساختہ نظریوں کے تحت منفی اعمال روا رکھنے میں مصروف عمل ہیں اور آخر میں اُن نتائج کو سامنے لایا گیا ہے جن سے عورت بذاتِ خود، باقی رشتہ دار، گھر و چار دیواری، رشتے ناتے، بچے بچیاں اور دیگر زندگیاں بری طرح متاثر ہے اور چار سُو ایک ہُو کا عالم اور غم کا سماں چھایا ہوا ہے۔ اس فکر کو بھی بلانے اور جگانے پر زور دیا گیا ہے جو عورت کو ہر سطح پر یکساں حقوق عملی صورت میں دینے اور ان سے وابستہ تمام تر مسائل کو ختم کرنے میں ریڑھ کی ہڈی جیسا کردار ادا کر سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما" آنکھ مچھولی، www.youtube.com، ۵۱ جنوری، ۲۰۱۹ء، 9:00pm

۲۔ کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۳۱

۳۔ خدیجہ مستور، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما, خرمن, www.youtube.com، ۲۲ اگست، ۲۰۱۹ء، 4:30pm

۴۔ مستنصر حسین تارڑ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما, خواب کم خواب، www.youtube.com، ۵ جنوری، ۲۰۲۰ء، 3:00pm

باب سوم:

پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کی گھریلو حیثیت

گھریلو مسائل اور خاص کر مقام اور جائے پر خواتین کو درپیش گھریلو مصائب پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے ہم جان سکیں کہ گھر اور گھریلو سے کیا مراد ہے۔ دراصل مختصر طور پر گھر کے معنی میں ٹھکانہ، مسکن، آشیانہ، خانہ، خول اور پڑاؤ شامل ہے۔اس کے ساتھ اصلاحی و اصطلاحی دفتر، دیس، وطن، خاندان، مخزن، سازو سامان، شبستان، کنبہ، آقا، خاوند، بیوی، زوجہ اور اثاث البیت کو بھی گھر کہا جاتا ہے۔اب ظاہر ہے کہ گھر سے منسلک لفظ اس مفہوم میں ملتا ہے جہاں گھر سے متعلق عام و خاص مشکلات، مصائب اور مسائل ہوں۔

جہاں تک خواتین اور گھریلو مسائل کا تعلق ہے تو یاد رہے کہ جس مقام پر ایک خاتون کی پیدائش ہوتی ہے اس کو بھی گھر کہتے ہیں، جہاں وہ رہائش پذیر ہوتی ہے وہ بھی گھر کہلاتا ہے اور جہاں اس کی شادی ہوتی ہے اور باقی عمر وہاں گزارتی ہے اُسے عُرف عام میں گھر پکارا جاتا ہے یہی گھر اس کے لیے جائے پناہ بھی ہوتا ہے، یہی اس کا نگران اور رکھوالا بھی کہلاتا ہے۔ یہی اس کا وطن و دیس بھی مانا جاتا ہے اور یہی اس کے لیے جنت بھی ہوتا ہے اور دوزخ بھی بن جاتا ہے۔

اگر بروقت فطری اُصولوں کو مدنظر نہیں رکھا جاتا یا جاہلیت انتہا تک ہو تو بچوں کی پیدائش مناسب اور صحیح طریق سے ممکن نہیں ہوتی یوں بچّے، بچّیاں کثرت، بیماری، علاج، دیکھ بھال وغیرہ ہونے اور نہ ہونے سے کمزور و معذور جنم لیتے ہیں۔ بروقت خوراک اور نگہداشت نہ ہونے سے اکثر بچیّاں ذہنی و جسمانی لحاظ سے پسماندہ رہ جاتی ہیں۔ نوجوانی و جوانی کی عمر میں صحیح تربیت و تعلیم سے محرومی کا خدشہ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے خدمت گزار، غلام ابن غلام اور حتیٰکہ لونڈیوں جیسا خیال کیا جاتا ہے اور اُن کو بنیادی حقوق آزادی، تعلیم، تربیت، کام، سروس اور ہنر وغیرہ سے دور رکھا جاتا ہے۔ گھریلو مسائل میں تشدد بھی ہے۔ اکثر خواتین پر معمولی باتوں پر آئے روز تشدد کیا جاتا ہے۔

بعض جاہل اور گنوار تعلیم و تعلم نہ ہونے، زیادہ غربت اور دشمنی وغیرہ کی وجہ سے عورتوں کو فروخت کرتے ہیں اور یوں یہ ایک انتہائی تکلیف دہ گھریلو مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اکثر گھرانے اور خواتین نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ شوہروں کی جاہلیت، بڑوں کی جھوٹی شان و شوکت، خاندانی نام و ناموس، اولاد کا لاڈ پیار اور رشتہ داروں کے منافقانہ رویوں سے بھی اکثر خواتین منہ اور ذہن پر تالے لگا کر صبح تا شام اور رات تا صبح جانوروں کی طرح حالت گزارتی ہیں اور

زندگی کو کیسے جیا جاتا ہے، وہ جانتی تک نہیں ہیں۔ گھریلو رسوم کی پاسداری بھی ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ یہ کام وقدم لازمی ہے اور فلاں فلاں کاموں سے دور رہنا ہے اور یوں بے چاری خواتین خود تماشہ اور باقی افراد تماش بین بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

ان گھریلو مسائل کی وجہ سے خواتین اپنے بنیادی حقوق اور ضرورتوں سے بے علم ہوتی ہیں اور یوں ان مسائل اور مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل زندگی گزارتی ہیں۔ اگر قدرت اور فطرت سے لڑکی جنم لیتی ہے تو باقی گھر والے اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

الغرض جہاں جہاں گھر اور گھریلو زندگی سے متعلقہ مسائل ہیں اُن کی شکلیں بعض جگہوں پر صاف ظاہر ہوتی ہیں اور کچھ چار دیواریوں کے اندر چھپی رہتی ہیں اور ان دونوں صورت حال اور مناظر سے بے چاری خواتین اور عورتیں مشکل اور اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتی ہیں۔

(ا) پسند کی شادی:

''ڈرامہ 81'' سلسلے کے طویل دورانیے کے کھیلوں میں نفسیاتی نوعیت کا ایک اہم تحریر کردہ ڈرامہ منو بھائی کا ''دروازہ'' ہے۔ اس کہانی کا موضوع نہایت ہی گہرا، دلچسپ اور مؤثر ہے، آغاز آفرینش سے انسان خارجی دنیا میں آخری سانس تک منزل کا تعاقب کرتا ہے اور اپنے اندر نہیں جھانکتا اور نہ ہی اپنے اندر کی دنیا تسخیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کھیل میں منو بھائی ایک ایسے ہی دروازے کی نشاندہیکر رہے ہیں جو انسان کے اندر کھلتا ہے۔ اور ان راز ورموز سے پردہ اُٹھاتا ہے جس کے لیے بصیرت درکار ہے۔ بصارت کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے لیکن یہ ایک ایسا دروازہ ہے جس کی مادہ پرست اور، مادیت پسند لوگوں کو پرواہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو انہیں اس دروازے کا فہم ہی نہیں ہوتا۔ محمد سلمان بھٹی کہتے ہیں۔

> ''یہ دروازہ ہر شخص کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لیے ریاضت اور کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد ہی انسان اس دروازے کو اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ دروازہ صرف سچائی اور نیک سوچ رکھنے والے انسانوں کو نظر آتا ہے۔''(ا)

اس ڈرامے میں مُنو بھائی نے علامتی انداز میں دور بینی کی تعلیم دی ہے۔ مشکل، سنجیدہ اور علامتی نوعیت کے اس ڈرامے کو منُو بھائی نے کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ڈراما ''دروازہ'' محبت کے جذبے سے نمو پانے والے احساسات کا ترجمان ہے۔ ''زری'' کا کردار اس ڈرامے کا دل میں گھر کر جانے والا اور ذہن میں یاد بن کر جگمگانے والا کردار ہے۔ زرینہ یعنی

زری کے کردار کی تخلیق اور تشکیل میں منُو بھائی کی فنی مہارت اور دانش جھلکتی ہے۔زرینہ جیسی شکست پا عورت کے روپ میں اس نے اس کردار کو زندہ اور متحرک بنا دیا ہے۔زری کے مکالمے، معصومیت اس کے انداز کی بے ساختگی اور محبت پر اندھا اعتماد اس کے انجام کا محرکات ثابت ہوتے ہیں۔وہ نفسیاتی صدمے سے دوچار ہونے کے بعد ہوش کی دنیا سے بالکل ناطہ توڑ دیتی ہے۔اس صدمے کی اہمیت کو اس عورت کی بنیادی خصوصیات کی مدد سے واضح کیا ہے۔

ڈراما ''دروازہ'' میں زری متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک سرمایہ دار کی اکلوتی اولاد ہے وہ یونیورسٹی میں پڑھتی اور ڈراما کلب کی انچارج بھی ہے۔سلطان ایک ذہین خوبصورت نوجوان جو تقریباً ہر جماعت میں پہلی پوزیشن لیتا تھا زری کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔وہ ان کے ساتھ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے ڈراموں میں ہیرو کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔زری سلطان سے لاپرواہ اپنے کام سے کام رکھنے والی ایک روشن خیال لڑکی ہے۔سلطان کافی دفعہ زری سے اپنی محبت کا اظہار کر چکا ہوتا ہے مگر زری اس کو نظر انداز کر دیتی ہے۔زری کی شخصیت ایک مشرقی عورت میں پائی جانے والی تمام خصوصیات کی حامل کردار ہے۔زری کی توجہ و محبت حاصل کرنے کے لیے سلطان ہر حربہ آزماتا ہے جیسے یونیورسٹی کی مختلف سرگرمیوں میں حصّہ نہ لینا، چپ چاپ رہنا، نشہ آور چیزیں استعمال کرنا وغیرہ۔زری اور سلطان کے درمیان لائبریری میں ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''زری: کیا ہو رہا ہے۔

سلطان: کیا پتہ

زری: میں نے تو سنا ہے بہت کچھ ہو رہا ہے۔

سلطان: (زری کو دیکھتے ہوئے) مثلاً

زری: مثلاً یہی کے آپ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہے۔

سلطان: (کتاب کو دیکھتے ہوئے) اور۔۔۔۔۔

زری: (انگلیوں سے کھیلتے ہوئے) اور یہ کہ آپ اپنی صحت تباہ کر رہے ہیں۔

سلطان: اور۔۔۔۔۔

زری: اور یہ کہ آپ نشہ کرنے لگے ہیں۔

سلطان: (زری کو ایک ادائے بے التفاتی سے دیکھتے ہوئے) کسی نے آپ کو اس کی وجہ نہیں بتائی۔

زری: (پن سے کھیلتے ہوئے) کسی کو بتانے کی کیا ضرورت وجہ میں خود جانتی ہوں

سلطان: کیا۔۔۔۔۔

زری: دیکھو سلطان جب ایک شخص اپنی منزل تک پہنچنے کی طاقت و جرأت نہیں رکھتا تو وہ فرار کی راہ تلاش کرتا ہے زندگی سے ڈر کر موت کی دامن میں پناہ لیتا ہے۔

سلطان: میرا دکھ میری تنہائی ہے میں اکیلا یہ سفر طے نہیں کر سکتا زری۔

زری: آپ تنہا نہیں ہیں لیکن جس سفر کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس ہمسفر کا ہاتھ تھامنے کا حوصلہ بھی تو ہونا چاہیے۔

سلطان: (زری کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے)

زری: لیکن اس سفر میں بزرگوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

سلطان: یہی تو میرا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

زری: کیوں

سلطان: میں ایسا نہیں کر سکتا۔''(۲)

اس طرح سلطان مختلف حیلوں حوالوں سے زری کو اپنی محبت کا یقین کرا دیتا ہے۔ زری ایک معصوم مشرقی لڑکی ہے اور اس کی عمر بھی باقی ہم عمر لڑکیوں کی طرح خواب دیکھنے کی ہے جس عمر میں لڑکیاں حقیقت سے زیادہ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتی ہیں۔ زری کو بھی پیار کی تشنگی اور چاہے جاننے کا احساس گدگدانے لگتا ہے۔ سلطان کی محبت و توجہ اس کی زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیتی ہے۔ چھپ چھپ کر سلطان سے ملاقاتیں، اس کی محبت بھری باتیں اسے سلطان کے سحر میں گرفتار کر دیتی ہیں۔ سلطان اسے ہر طرح سے اپنی جھوٹی محبت کا یقین کرا دیتا ہے ۔ محبت اندھی ہوتی ہے اور یہی اندھا اعتماد زری کو کنویں میں دھکیل دیتا ہے۔ زری سلطان کو کہتی ہے کہ وہ اپنے والدین کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیج دے۔ ہوٹل میں زری اور سلطان کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''زری: اس سفر میں بزرگوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

سلطان: یہی تو میرا سب سے بڑا المیہ ہے۔

زری: کیا؟

سلطان: میں ایسا نہیں کر سکتا۔

زری: کیوں

سلطان: میرے والدین بہت پرانے خیالات کے ہیں انھوں نے بچپن میں میری منگنی ایسی لڑکی سے کر دی تھی جسے میں بالکل پسند نہیں کرتا وہ بالکل ان پڑھ ہے۔

زری: ان پڑھ ہونا کوئی خامی نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہو۔

سلطان: وہ ان پڑھ ہی نہیں بے وقوف اور پاگل بھی ہے اس سے میرا کسی قسم کا کمیونیکیشن نہیں ہو سکتا۔

زری: پھر آپ انکار کر سکتے ہیں۔

سلطان: جاگیر درانہ ماحول میں بسنے والے انکار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے جب تک کوئی بات ان کی مجبوری نہ بن جائے اسے قبول نہیں کر سکتے۔

زری: مجبوری، کیسی مجبوری؟''(۳)

اس طرح سلطان زری کو یقین دلاتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ زری اپنے والدین کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے کیونکہ اس کے والدین شہر سے تعلق رکھنے والے روشن خیال لوگ ہیں۔ زری کے لاکھ دلیلیں دینے پر بھی سلطان بضد ہے کہ زری ہی سے شادی کرے گا کیونکہ وہ اس کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ نو عمری کی محبت لڑکیوں کو ہر وہ جائز و ناجائز قدم لینے پر مجبور کر دیتی ہے جو معاشرے میں ذلیل و خوار ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔ عورت کی سب سے بڑی بے وقوفی یہ ہے کہ وہ مرد کی جھوٹی باتوں سے جلدی پگھل جاتی ہے ۔زری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ زری کے والدین نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بضد رہی۔ زری کے والد اس کی شادی تایازاد بیٹے سے کروانا چاہتے تھے کیونکہ دونوں بھائیوں کا کاروبار مشترکہ تھا اگر زری کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا جاتا تو اس کے تایا اس کے والد کو کاروبار سے نکال دیتے اور اس طرح معاشی طور پر زری کا خاندان تباہ ہو جاتا مگر زری نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی کیوں کہ سلطان نے اسے اپنی باتوں سے ہر طرح کی قربانی دینے پہ ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

سلطان اور زری دونوں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف سلطان کے چند دوستوں کو بلا کر نکاح پڑھوالیا۔ شادی کے بعد چند ہفتوں تک زری کو سلطان نے ہر طرح سے خوش رکھا۔ رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا اور سلطان نے ہر بات پر زری کو روکنا ٹوکنا شروع کر دیا۔ مثلاً محلے کے کسی شخص کے ساتھ زری کوئی رابطہ نہ رکھے اسے چاہنے والوں میں سے کسی کے ساتھ ملنے کی اجازت نہ تھی یہاں تک کہ وہ گھر کا دروازہ کسی کے لیے بھی نہیں کھولے گی۔ زری اپنے والدین کی شاندار کوٹھی اور عیش و عشرت کی زندگی ٹھکرا کر کسی بستی میں سلطان کے ساتھ ایک کمرے کے کرایے کے گھر میں گئی مگر سلطان کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے زری کو سمجھاتا کہ ہم جلد ہی یہ گھر

چھوڑ کر دوسرے شہر منتقل ہو جائیں گے۔ سلطان اب ہفتہ میں تین راتیں گھر سے غائب رہتا اور زری اکیلے گھر میں پڑی رہتی۔ ایک دن سلطان گھر آتا ہے تو زری اسے کہتی ہے۔

''سلطان: اسلام علیکم: کیا حال ہیں۔

زری: کہاں سے آئے؟

سلطان: کیا مطلب؟

زری: (سلطان کو غصے سے دیکھتے ہوئے) کہاں تھے دو دن۔

سلطان: (آنکھیں جھکاتے ہوئے) تمھیں بتایا تو تھا کہ۔۔۔۔۔۔

زری: (چیخ کر تیز آواز میں) کب بتایا تھا، بتایا ہوتا تو میں اتنی پریشان ہوتی، دو راتوں سے جاگتی رہی۔

سلطان: چند روز پہلے بتایا تو تھا کہ اچانک فیصل آباد۔۔۔

زری: (چلا کر تیز آواز میں) کیا اچانک پڑ گیا کہ گھر میں اطلاع بھی نہیں کر سکتے تم۔

سلطان: ملازمت کے لیے جانا پڑ گیا تھا۔

زری: ملازمت۔۔۔ مجھے اس طرح اکیلے چھوڑ کر نہ جایا کرو تم، مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔

سلطان: میں جانتا ہوں تم بہت بہادر لڑکی ہو۔

زری: (رو کر) نہیں میں بہادر، میں اکیلی تو رہ سکتی ہوں مگر تنہا نہیں۔''(۴)

زری سلطان کی محبت میں اپنی ہر خواہش کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ مشرقی عورت وفا کا پیکر ہوتی ہے۔ شادی کے بعد زری نے سلطان کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اپنی ہر خواہش پر سلطان کی خوشی کو ترجیح دی اور اسی کو اپنا فرض اولین سمجھا۔ وہ سلطان کو ہر لحاظ سے مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی خوشی میں ہی زری کی خوشی تھی۔ اس نے زندگی اپنے شوہر کے نام انتساب کر دی تھی۔ زری سلطان سے کہتی ہے۔

''زری: تنہائی میں اندیشے، وسوسے ڈراتے ہیں شبہات سر اٹھاتے ہیں۔

سلطان: (پریشان ہو کر) شبہات مجھ پر۔۔۔۔۔۔۔

زری: تمہاری پیشانی کی رگیں جو کبھی کبھی بہت زیادہ اُبھر آتی ہیں (زری اپنے آپ سے الجھ کر) تم مجھے صاف صاف بتا دو تمہیں پریشانی کیا ہے تم مجھ پر اعتبار کرو نہ مجھے بتا دو تمہیں کیا پریشانی ہے میں تمہاری پریشانی میں حصّہ دار بن سکتی ہوں۔

سلطان:(گھبرا کر) کوئی پریشانی نہیں زری۔

زری: دیکھو سلطان میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں آگئی دنیا، ماضی بھی چھوڑ آئی ہوں۔

سلطان: میں جانتا ہوں۔

زری: اگر تمہیں کوئی پچھتاوا ہے تو پھر آج ہی بتا دو میں زمین کی طرح تمہارے قدم نہیں روکوں گی۔"(۵)

زری سلطان کے مسلسل پریشان رہنے سے سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ مسئلہ ضرور ہے مگر وہ اس کو نہیں بتاتا۔اس کو اعتماد میں لینے کی زری نے بہت کوشش کی مگر سلطان انکار کرتا رہا اور اس کو ٹالتا رہا کہ دراصل اسے کوئی پریشانی نہیں مگر ایک دن اس کے جھوٹ کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور زری کو جس بات کا ڈر ہوتا ہے وہی تلخ سچائی زری کے سامنے آجاتی ہے۔

سلطان کے والد اور چچا جو جاگیر دارانہ سماج سے تعلق رکھنے والے ان پڑھ مگر اثر ورسوخ والے لوگ ہیں زری کے پاس آتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ دسویں پاس کرنے کے بعد سلطان کی شادی اس کے چچازاد بیٹی سے کر دی گئی تھی اور ان کے ساتھ آنے والا مرد اس کا سسر ہے۔ سلطان کا دو سال کا بچہ بھی ہے۔ سلطان کے والد اور چچا اپنے ساتھ طلاق کے کاغذات بھی بنا کر لائے تھے اور زرینہ سے ان پر دستخط کرنے کو کہتے ہیں۔زری کے لیے یہ سب کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔وہ ٹوٹ کے بکھر جاتی ہے۔عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر مرد کی بے وفائی نہیں۔وہ سلطان سے طلاق لے کر ایک عزیز سہیلی کے گھر چلی جاتی ہے۔

ایک طلاق یافتہ عورت کی زندگی بے شمار مصائب کا شکار ہو جاتی ہے۔قصور وار مرد بھی ہو مگر الزام بے چاری عورت کو ہی دیا جاتا ہے اور اس کو ہی ملعون ٹھہرایا جاتا ہے۔معاشرہ اس کو قبول نہیں کرتا اور اس کی زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے۔ کچھ عورتیں زندگی سے لڑنے کا حوصلہ رکھتی ہیں مگر زیادہ تر غلط ڈگر پر چلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں یا کروائی جاتی ہیں۔ بعض عورتیں زندگی سے بس ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتی ہیں اور خودکشی کر لیتی ہیں۔زری جب اپنی سہیلی کے گھر رہنے کی غرض سے جاتی ہے تو اس کی سہیلی کی ماں کو اچھا نہیں لگتا کہ وہ ان کے ہاں رہے۔زری کی سہیلی شہلا اور اس کی والدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

"شہلا کی ماں: شہلا مجھے زری سے پوری پوری ہمدردی بھی ہے مگر جو لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں اگر انھوں نے زری کے بارے میں پوچھ لیا تو ہم کیا بتائیں گے۔

شہلا: یہی کہ وہ میری سہیلی ہے۔

شہلا کی ماں: (پریشان ہو کر) ارے بیٹا اگر اسے پتہ چلے گا کہ تمہاری دوست گھر سے بھاگی ہوئی ہے یا اس کے والدین نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور یہ کہ پہلے سے شادیشدہ شخص سے شادی کر کے اس سے بھی طلاق لے چکی ہے تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ بتاؤ نہ بیٹا کیا سوچیں گے۔

شہلا: (پریشان ہو کر) امی تو میں کیا کروں۔

شہلا کی ماں: بیٹا تم اس سے کہو ایک دو دن کے لیے کسی دوسری سہیلی کے گھر چلی جائے صرف ایک دو دن کے لیے۔''(۶)

زری اپنی سہیلی اور اس کی امی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لیتی ہے اور اس سے یہ کہہ کر اجازت لے کر چلی جاتی ہے کہ اسے ہاسٹل میں رہنے کی جگہ مل گئی ہے۔ اس ڈرامے کا یہ سین ہر اس کم نصیب اور اپنی مرضی سے شادی کرنے والی عورت کی کہانی سناتا ہے جو اپنی مرضی سے شادی کرنے کے بعد طلاق یافتہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس عورت کو ہر لحاظ سے ایک بد عمل اور بد کردار عورت قرار دیا جاتا ہے۔

اس کا دکھ بانٹنے والا اور سہارا بننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو ہر طرح سے کچلنے اور رسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زری جب ہاسٹل رہنے جاتی ہے تو ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے ناقابل قبول ہوتی ہے۔ ہاسٹل کا کمینہ مالک اسے ہاسٹل کی بجائے گھر کے کوارٹر میں رات گزاری کی دعوت دیتا ہے۔ زری اس کے گندے ارادے بھانپ کر اسی رات ہاسٹل چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ غرض دنیا کے کسی فرد کے لیے زری برداشت نہیں چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ ہر فرد کے دل کا دروازہ اس کے لیے بند ہے۔

منّو بھائی نے اپنے ڈرامہ میں زری کے کردار کو ایک روایتی پاکیزہ مشرقی عورت کی برداشت کے رویے کو پیش کیا ہے۔ زری ایک حساس لڑکی ہے جو ایک باشعور عورت بھی ہے۔ سلطان کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے اوپر چڑھایا ہوا سماجی خول اتار دیتی ہے۔ اسے دل و جان سے اپنا لیتی ہے۔ اس کے لیے والدین جسے اس نے پالا پوسا، چھوڑ جاتی ہے۔ ایک لڑکی کا اپنے والدین اور گھر کو چھوڑنا سخت آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ مگر وہ اس طرح کا قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

عورت ہونے کے ناطے زری نے شوہر کو خوش رکھنے کی ہر طرح سے کوشش کی مگر سلطان ہمیشہ اس سے جھوٹ بولتا رہا۔ سلطان کے جھوٹ کا پردہ فاش ہونے پر زری یعنی زرینہ زندگی سے بے زار ہو جاتی ہے۔ عورت کا المیہ یہ ہے کہ اگر وہ زندگی میں کبھی ایسا قدم اٹھالے تو زندگی بھر اس کا خمیازہ بھگتتی ہے۔

ہمیشہ راضی اور خوش رہنے والی عورت کی کہانی بھی عجیب ہے۔ گھر آنگن کی خوشی کے لیے ساری زندگی ہر دکھ و غم جھیلتی ہے۔ سینکڑوں مسائل کے باوجود بھی گھر آنگن کو شاد و آباد رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈراما 81ء کے سلسلہ کا ایک دلچسپ کھیل بانو قدسیہ کی لکھی ہوئی تحریر ڈراما "چٹان پر گھونسلہ" ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی اس طرح ہے کہ ڈرامے کی ہیروئن حنا کالج سے واپس گھر جاتے ہوئے ہمایوں نامی لڑکے کو زخمی حالت میں پاتی ہے اور انسانی ہمدردی رکھتے ہوئے اسے ہسپتال لے جاتی ہے۔۔ حنا بہت ہی حساس اور دوسروں کی مدد کرنے والی ایک ایسی لڑکی ہے جو زمانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر مصیبت زدہ فرد کی چاہے وہ مرد ہو یا عورت مدد کرنے کی خواہاں ہے۔ حالانکہ اس کی ماں نے اسے کافی دفعہ اس بات پر روکا ٹوکا کہ ہر جانے انجانے فرد کو مصیبت میں پاکر مدد کرنا ایک احمقانہ فعل ہے کیونکہ زمانے کا کوئی اعتبار نہیں مگر اپنے والد کے لاڈ اور بہتر پرورش کی وجہ سے وہ ہمیشہ پُراعتماد رہتی ہے۔ وہ اپنا ہر مسئلہ اپنے والد سے بلا جھجک شئیر کرتی ہے۔ آج بھی جب وہ گھر آتی ہے تو اپنے گھر والوں سے اس زخمی لڑکے کا ذکر کرتی ہے جس پر اس کی والدہ اسے حسبِ معمول ڈانٹ سناتی ہے مگر اس کے والد اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سراہتے ہیں۔

حنا زخمی شخص جس کا نام ہمایوں تھا کے والد کو فون کر کے زخمی ہونے کی اطلاع دیتی ہے جو خود تو نہیں آتا مگر پیسے بھجوا دینے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ آنے والے دنوں میں حنا اور ہمایوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ مسلسل ملاقاتوں کا یہ سلسلہ محبت پر منتج ہوتا ہے اور حنا اپنے والدین کے منع کرنے اور ناراض ہونے کے باوجود بھی ہمایوں سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ حنا کی ہر ایک کے بارے میں مثبت سوچ کا رکھنا ہے۔ وہ ہر ایک میں مثبت پہلو تلاش کرتی ہے۔ اسے ہمایوں جیسے انسان میں بھی ایک معصوم اور سچا انسان نظر آیا۔ قصہ المختصر کہ ہمایوں سے شادی کر لیتی ہے۔ چونکہ ہمایوں کئی بار کاروبار میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے اس لیے حنا وقتاً فوقتاً اپنے والدین سے مالی معاونت لیتی ہے۔ حنا ایک محنتی لڑکی ہے۔ جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیتی ہے تو درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ گھر کے اخراجات میں شوہر کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہمایوں کا کاروبار چل نکلتا ہے۔ ہمایوں ایک خود پرست اور بے حس آدمی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ حنا سے اکتا جاتا ہے۔ اس کے تلخ اور بدلتے ہوئے رویّے اور حیرانی کی ذیل کے مکالمے سے یوں وضاحت ہوتی ہے۔

''ہمایوں: غالباً تمہارا خیال ہے کہ تم بزنس میں شیئر ہولڈر ہو، کیونکہ میں نے تم سے ایک زمانے میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔یہ لو شکریہ کے ساتھ واپس۔

حنا: یہ۔۔۔یہ یہ۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا ہے ہمایوں؟

ہمایوں: میں آپ کا اور آپ کے باپ کا ہر مالی احسان اتار دینا چاہتا ہوں اور میں کوشش کرتا رہوں گا ۔۔۔۔۔۔میری تم سے اتنی Request ہے کہ تم میرے زندگی میں interfair نہ کرو۔''(۷)

منقولہ مکالمہ اس بات کو سامنے لاتا ہے کہ ہمایوں ہر حقیقت اور ہر شے کو پیسے کے تناظر میں تول کر دیکھتا ہے اس کی یہ نفسیات اسے وراثتی طور پر ملی ہے اور انفرادی نوعیت کی نہیں۔ حادثے کے نتیجے میں اس کے باپ کا ہسپتال نہ آنا اور پیسے بھجوا دینے کا وعدہ اس امر کا غماز ہے کہ ہمایوں خاندانی مادیت پسند طبیعت رکھنے والا شخص ہے جس کے سامنے انسانی احساسات اور جذبات کی کوئی قدر نہیں۔ بانو قدسیہ دراصل یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتی ہے کہ ہمیں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ جو شخص خون کے رشتوں کی پرواہ نہیں کرتا اور قطع تعلق کر لیتا ہے وہ دوسروں سے کیسے وفا کر سکتا ہے۔ اس کی نفسیات کیونکہ موقع پسندانہ ہوتی ہے اور Opportunist کبھی مستقل مزاج نہیں ہوتا۔ ظاہری طور پر ڈرامے کی کہانی ایک غلط فیصلے کی پاداش میں زندگی بھر ملنے والی سزا نظر آتی ہے لیکن درپردہ اس پر نفسیاتی پہلو چھایا ہوا ہے کہ کوئی بھی ایک فعل اکثر اوقات کسی شخص کے ذہنی رجحان، میلان اور اس کی مجموعی نفسی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم جس طرح عادات و خصائل سے کسی شخص کی نفسیاتی حالت یا ذہن کی تصویر بناتے ہیں۔ زندگی کے کسی نازک مرحلے میں اسی طرح کسی شخص کا خاص ردعمل اس کی مجموعی نفسیات کا ترجمان ہو سکتا ہے۔

ظالم سماج اور حالات نے لڑکیوں سے وہ معصومیت چھین لی ہے جو ان کے خلوص اور محبوبیت میں اضافہ کرتی تھی۔ محبت اور ہمدردی کا وہ جذبہ جو شاید اس سنگ دل معاشرہ کی وجہ سے اسے کسی پر بھی اعتبار کرنے نہیں دیتا۔ اب وہ سوچ کی دنیا میں گم اور اپنی سوچوں سے بھی ہراساں نظر آتی ہے۔ ان کی صورتمیں وہ مایوسی اور حسرتیں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی گہرائی ان کی بے بسی اور تنہائی کو بیان کرتی ہے۔ ہمایوں کے رویّے سے حنا کرچی کرچی ہو جاتی ہے مگر پھر بھی اپنی زبان پر شکایت تک نہیں لاتی مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس اور لاچار پاتی ہے۔ حنا کی کہانی دراصل ہر اس حساس عورت کی کہانی ہے جس کے سینے میں ایک حساس دل ہے اور وہ مرد کا آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی ہے۔ حنا جو ہمیشہ زندہ اور متحرک عورت ہوتی ہے جس کے جذبات صرف مشرقی عورت کے جذبات نہیں بلکہ آفاقی جذبات و احساسات ہیں کو بہت ٹھیس پہنچتا ہے اور وہ بجھ سی جاتی ہے زندگی سے خفا ہو جاتی ہے۔

(ب) متفرق خانہ داری مسائل

ایک ماں اپنے بچوں کو عزّت سے پالنے کے لیے دنیا بھر کے دکھ اُٹھاتی ہے، چکی پیستی ہے۔ سلائی کڑھائی کرتی ہے، محنت مزدوری کرتی ہے حتٰی کہ ان کی پرورش میں جان تک ہار جاتی ہے۔ بچے ہی اس کے خوابوں کی تعبیر ہوتے ہیں۔ عورت ماں کے روپ میں بچوں اور شوہر پر اپنی صحت تک قربان کر دینے والا ایک ایسا کردار ہے جو اپنی خدمت اور ایثار کے بدلے کبھی اعتراف اور تحسین نہیں پاتا بلکہ ہمیشہ اس کی خاموش محبت دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔

ڈراما سیریل ''امّاں'' میں انور مقصود نے نوجوان نسل پر بالواسطہ تنقید کی ہے کہ اولاد بڑی ہو کر والدین کی فرمانبرداری نہیں کرتی۔ اس ڈرامے کے ذریعے عورت کے روحانی اور دلی جذبات اپنے گھر اور بچّوں کے لیے کیا ہوتے ہیں بیان کیے گئے ہیں۔ ایک ماں جو دن رات ایک کر کے اپنے بچّوں کی پرورش کرتی ہے۔ ہر خواہش اور ضرورت کو اپنے بچّوں پر ترجیح دیتی ہے۔ نہ اسے اپنی صحت کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی اپنی ضروریات کا، بلکہ اپنے بچوں کو اہم سمجھتی ہے۔ انور مقصود کا یہ ڈراما ہر اس ماں کے دلی جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے جو اولاد کے لیے سب کچھ ہار دیتی ہے مگر لب پر شکایت تک نہیں لاتی ہے۔

ڈرامہ سیریل امّاں ایک بوڑھی ناتواں اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ماں کی کہانی ہے جس نے دو بیٹوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں شب و روز محنت کی۔ انہیں اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ بچے بڑے ہو کر کاروبار کے لیے باہر ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ اکیلی ماں گھر پر رہ جاتی ہے۔ بیٹوں کو باہر گئے عرصہ گزر جاتا ہے مگر آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بڑا بیٹا باہر ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جس کی اطلاع ماں کو فون کے ذریعے دیتا ہے۔ اماں بے چاری کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا وہ بیٹے کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں بچے بھی ہو جاتے ہیں مگر ماں سے ملنے کا خیال تک دل میں نہیں آتا۔ حالانکہ اس کی بیوی کافی دفعہ اس سے کہتی ہے کہ اماں سے ملنے پاکستان جاتے ہیں مگر کاروبار اور پیسے کی لالچ اسے پاکستان آنے نہیں دیتا ہے۔ امّاں جو ڈرامہ کا اہم کردار ہے کی طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس کا نوکر اپنی مالکن یعنی امّاں کو کافی دفعہ یہ کہنے سے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں ٹیلیفون پر جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے مگر اماں اسے ڈانٹتی ہے کہ بچوں کو میری وجہ سے پریشانی ہو گی کیوں جوان اولاد کو پریشان کروں اور یہ کہ ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایک ماں کا یہ جملہ نوجوان نسل پر ایک طنز ہے کہ پیسے اور آمدنی کی لالچ میں اولاد بوڑھے والدین کو اور ان کی قربانیوں کو بھول جاتی ہے۔ اماں کی بے بسی اور نوکر کی منت سماجت کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''(بابا)نوکر: بی بی آپ اپنی صحت اور تندرستی کا کچھ خیال کریں کیونکہ کھانے پینے سے تو آپ نے منہ موڑ لیا ہے۔

اماں: بابا آپ سمجھتے نہیں ہے محمود اور مسعود مجھے بہت چاہتے ہیں۔

بابا:(سر ہلاتے ہوئے)ھم م م ،ہاں بہت چاہتے ہیں اس واسطے چار سال سے پاکستان نہیں آئے۔

اماں:(آہ بھر کر)ان کی مرضی ہے بابا، بعض لمحے اتنے ویرانگزرتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں مجھے ان کی یاد نہیں آتی، جی چاہتا ہے کہسب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر کیا کروں۔(دکھ بھرے لہجے میں)تنہائی کا دور اتنا طویل ہو جائے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔''(۸)

وہ ماں جس نے اولاد کی خاطر دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا آج وہی اولاد بڑی ہو کر ماں کو بھول جاتی ہے۔ماں بچوں کے دیدار کے لیے بھی ترس جاتی ہے مگر اولاد کو ماں پر رحم تک نہیں آتا۔وہ ماں جو بچوں کی خوشی میں اپنی رضا سمجھتی ہے مگر ماں کا غم ماں کا ہی رہتا ہے اور وہ اکیلے اس آگ میں جلتی ہے۔بچے جب بھی ماں سے فون پر بات کرتے ہیں تو جلدی آنے کا جھوٹا وعدہ کر کے ماں کو تسلی دیتے ہیں اور بے چاری ماں اسی آس پر جیتی ہے۔غریب ماں مقصود اور مسعود کی تصویریں دیکھ کر ان سے باتیں کرتی ہے۔

''اماں:(تصویر کو دیکھ کر)تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں نا بیٹے اولاد کی قرب کا اندازہ تمہیں تب ہو گا جب تمہارے بچے بڑے ہو کر تمسے دور چلے جائیں گے۔اولاد کی دوری میں جو کوفت ہے اسے کسی بھی پیمانے پر نہیں ماپا جا سکتا۔''(۹)

اکیلی گھر میں رہنے والی ماں کو ہر وقت اپنے بچوں کی بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک کے تمام مناظر، سرگرمیاں بچوں اور گھر پر نچھاور کرنے والی اپنی قربانیاں اور محبتیں یاد آتی ہیں۔وہ دن بدن بیمار اور کمزور ہو جاتی ہے مگر اپنے بچوں کے سامنے شکوہ تک نہیں کرتی ہے۔آخر کار اپنی تنہایوں اور اداسیوں کو ساتھ لے کر جہان فانی سے خاموشی سے چلی جاتی ہے۔اور بیٹوں کو ماں کی فوتگی کی خبر مصروفیت کے سبب ایک ہفتہ بعد ہوتی ہے۔مگر اب پچھتاوے کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔

1983ء میں انور مقصود نے طویل دورانیے کا کھیل دور جنوں پیش کیا۔اس کا مقصد بھی نوجوان نسل کو بوڑھے والدین کی خدمت اور محبت کی طرف آمادہ کرنا تھا۔یہ کھیل نوجوان نسل پر جو کہ مغرب کے ڈگر پر چلنے لگی ہے، پر ایک تنقیدی ڈراما ہے۔اولاد بڑی ہو کر اپنے بوڑھے ماں باپ کی فرمانبردار نہیں رہتی ہے۔وہ کمزور اور ضعیف والدین جو اپنی

جوانی اور جوانی میں کمائی ساری جمع پونجی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر دیتے ہیں۔اپنی آخری عمر میں آکر بے یارو مددگار رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ان کی خدمت کرنے والا اور پُرسان حال کوئی بھی نہیں ہوتا۔اس ڈرامے میں بچے بڑے ہو کر باہر ممالک کا رخ کر لیتے ہیں وہاں جا کر شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔باہر کی رنگا رنگیوں میں ڈوب کر بوڑھے والدین کا خیال تک نہیں آتا۔بے چارے والدین اپنے منہ کا نوالہ چھین کر بچوں کی خوشی کی خاطر آخر تک ان کی خواہشیں پوری کرتے ہیں تاکہ بچے خوش ہوں ان کا کبھی بھی دل نہ دکھے یہاں تک کہ ان کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا گھر بھی بیچ دیتے ہیں۔

انور مقصود کا یہ ڈراما ان تمام نوجوان نسل کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے جو والدین جیسی عظیم ہستیوں کی بے لوث محبت اور قربانیوں کی قدر نہیں کرتے ہیں۔جو بد نصیب ہیں اور جن کی قسمت میں شاید اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا کلہاڑا ہے۔اولاد کی جدائی میں ایک ماں پر کیا گزرتی ہے ،انور مقصود نے نہایت ہی موثر انداز میں ماں پر گزرنے والے کیفیات کی ترجمانی کر کے ان کے جذبات کو پیش کیا ہے۔

محمد نثار حسین کی سربراہی میں پاکستان ٹیلی وژن نے ۱۹۸۱ء میں طویل دورانیے کے کھیل پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا،اس کا ایک اہم کھیل ڈرامہ 81ء کا پہلا طویل دورانیے کا کھیل عورتوں کے نفسیاتی مسائل پر مبنی ڈرامہ کانچ کا پل تھا۔یہ ایک نفسیاتی نوعیت کا ڈرامہ تھا۔ڈرامہ نگار یونس جاوید کے تحریر کردہ اس کھیل میں ڈاکٹر شاہدہ کے روپ میں بکھری ہوئی تشنہ کام نفسیات کی ایک انوکھی اور بہترین تصویر ملتی ہے۔ڈاکٹر شاہدہ جس نے اپنے سامنے اپنے والدین کی علیحدگی کو دیکھا،اپنی معزور ماں کی نگہداشت کا واحد ذریعہ بنی، جس کا منگیتر مادہ پرستی کے باعث اسے اکیلا چھوڑ کر بیرون ملک جا کر اس کی خبر تک نہ لے سکا،جو اپنی انا پرستی کے باعث اسے روک بھی نہ سکی اور بے چاری اپنی تشنہ شخصیت کو مریضوں کی مسیحائی میں مکمل کرنے کی کوشش کرے ایسی شخصیت یا انسان کی نفسیات لازماً بکھراؤ کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔

اپنی جوانی کے آخری دنوں میں ڈاکٹر شاہدہ کو گُلو کی محبت مل جاتی ہے لیکن محبت کے مطلق اس کا ذہن اس قدر ابہام اور تشکیک کا شکار ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ بے چارے گُلو کی محبت ،خلوص اور صداقت کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔اپنے شوہر کو دھتکارتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو دیکھا پھر خود اپنی محبت اور منگیتر کے ہاتھوں دھتکاری گئی ہے۔زندگی اور محبت پر سے اس کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ذیل میں شاہدہ اور اس کی ماں بیگم نثار کا مکالمہ دونوں کی نفسیات کا عکاس ہے۔

''بیگم نثار: میں نتیجے پر پہنچ گئی ہوں۔اس نے تمہیں کچھ یاد دلایاہے۔میرے کہنے کے باوجود تم نےاس دروازے کو بند رکھا۔کسی نہ کسی کو دستک تو دیناہی تھااس پر اور۔۔۔یہ فطری امر ہے۔(رک کر نرمی سے) میں اسے برا نہیں سمجھی بیٹے۔

ڈاکٹر شاہدہ: ہاں ہاں۔آپ کیوں سمجھیں گی برا؟

بیگم نثار: میں اسے بھی سمجھاؤں گی۔مگر تم سے بھی کہتی ہوں کہ میرے ہوتے ہوئےاس باب کو مکمل کرلو(لمحہ بھر کے لیے دونوں خاموش ہیں۔صرف کلاک کی ٹک ٹک ہے۔)میں نہ ہوں گیتو میری باتیں یاد آئیں گی تمہیں۔۔۔۔۔۔گُلو نے زبان کھول کر مجھے بھی احساس دلایا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غافل رہی ہوں میں تم سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ لمحہ بہت پہلے گزر جاناچاہیے تھا۔

ڈاکٹر شاہدہ:ماں کو دھتکارتے ہوئے توآپ کو کوئی احساس نہ ہوا۔وہ لمحہ تو بہت پہلے گزر گیا۔

بیگم نثار: ہاں ٹھیک کہاں تم نے۔غلطی کااحساس جب بھی ہو جائےاس کی سنگینی کم کر دیتاہے۔مجھ سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔کہ تم بھی اسے دہراؤ۔''(۱۰)

منقولہ بالا مکالمہ بیک وقت شکست خوردہ اور شکست آمادہ نفسیات کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔وقت گزرنے کاساتھ ساتھ بیگم نثار کواپنی غلطی کااحساس ہو چکاہے۔کہ اس نے اپنی بیٹی یعنی ڈاکٹر شاہدہ اوراپنے شوہر کے ساتھ غلط کیا تھا۔کاش کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ نہ بناتی اور حالات کے موافق فیصلہ کرتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔معاشرتی حالات اور اخلاقی معیار جس طرح مردوں کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں اسی طرح ان کااثر عورتوں کے کردار پر بھی ہوتاہے۔سماج کی تعمیر یا تخریب میں عورتوں کی ذمہ داریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔شاہدہ کی ماں سے غلطیاں ہوئی تھی جس پر وہ اب پچھتارہی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی یعنی ڈاکٹر شاہدہ ان غلطیوں کو دہرائے اور نتیجتاً ہر مرد سے نفرت کرے۔ڈاکٹر شاہدہ چونکہ اب ان حالات سے گزر رہی تھی لیکن چونکہ اس نے ماضی کے تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کرلیاہے کہ کوئی بھی رشتہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا کہ وہ نظر آتاہےاس لیے وہ پاؤں میں کوئی نئی بیڑی نہیں پہننا چاہتی۔اس ڈرامے میں اکیلی اور تنہا عورتوں کے مسائل و مشکلات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ان عورتوں کوزندگی کے مختلف حالات میں مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔مرد مرکز معاشرے میں اکیلی عورت کازندگی بسر کرنانہ صرف مشکل ہے بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی ہے۔

نفسیاتی نوعیت کے اس ڈرامے نے ایک ایسی حقیقت کی نشاندہی کی ہے جو فطری آفاقیت ایک طرح سے اپنے نوع میں لیے ہوئے ہے۔ یہ موضوع دراصل فرائیڈ کے مکتبہ فکر سے ماخوذ ہے جس میں مخالف جنس کی طرف میلان ایک فطری امر ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ شروع ہی سے ڈاکٹر شاہدہ اکیلی اور نظرانداز کی گئی لڑکی ہے نہ تو وہ ماں باپ کے زیر سایہ پلی بڑھی، ہمیشہ والد کی محبت و شفقت سے محروم رہی اور پھر اپنے منگیتر نے اسے قابل اعتنا سمجھا۔ ایسے میں اس نے ڈاکٹر کا پیشہ اپنا کر مسیحائی میں محبت تلاش کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ گُلو کی محبت نکلا۔ محبت حالات جیسے عمر کا فرق، معاشرتی زنجیریں، ذات کی تنہائی، احترام اور فریضے کی کشمکش، ڈاکٹر شاہدہ کو کسی بھی نتیجے پر پہنچنے نہیں دیتے۔ یہ ڈراما ہمارے معاشرے کے بہت سارے ایسے مایوس کن اور منتشر نفسیات کی عکاسی کرتا ہے جو سب میں ہوتے ہوئے بھی اپنی محرومیوں کے باعث خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور اپنی اس کیفیت کو اس لیے بھی ختم نہیں کرنا چاہتے کہ ان کی تنہائی ان کی انا کو اور ان کی انا کا خاتمہ ان کے تن بدن کو ختم کر دے گا۔ اس لیے ڈرامے میں یونس جاوید نے سماج میں بدلتی ہوئی اقدار اور نفسیاتی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا تعلق تہذیبی اور تصادم اخذ کرنے والے نتائج سے ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نہ پیچھے ہٹ پاتے ہیں نہ قدم آگے رکھنے کی سکت رکھتے ہیں۔ اس ڈرامے پر صفدر میر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ویسے تو اس کی کہانی ایک ادھیڑ عمر کی لیڈی ڈاکٹر اور اس کے نوجوان مریض کے جذباتی تعلق کے بارے میں ہے لیکن حقیقتمیں اس کے ذریعے ایک پورے معاشرتی انقلاب کی نقش گری کی گئی ہے جس نے افراد، خاندانوں اور شہروں کی زندگیاں بالکل نئے تصورات، اقدار اور تعلقات پر استوار کر دی ہیں۔''(۱۱)

اس ڈرامہ کانچ کا پل کا موضوع بہت نیا یا اچھوتا معلوم نہیں ہوتا مگر جب آج سے ربع صدی قبل یہ ڈرامہ ٹی وی پر پیش کیا گیا تو اس وقت یہ ناظرین کے لیے بہت دلچسپ، متاثر کن اور پر کشش ڈراما تھا۔ بڑی کامیابی سے یونس جاوید نے اسے ڈرامے کی شکل میں ڈھالا اور پیش کیا۔

دھوپ دیوار گھریلو مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ایک طویل دورانیہ کا کھیل یونس جاوید نے 1982ء میں پیش کیا۔ سلمان طویل دورانیے کے اس کھیل کا مرکزی کردار ہے۔ کالج کے زمانے میں سلمان روشن نامی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ روشن بھی سلمان میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ سلمان ایک سیلف میڈ آدمی ہے اور اس کی شادی روشن سے نہیں ہو پاتی۔ روشن سلمان سے شادی اپنے والد کے کہنے پر نہیں کرتی۔ سلمان کو اپنے والدین کے دباؤ کی وجہ سے نرگس سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ نرگس کا تعلق سلمان سے محبوبہ کا نہیں بلکہ بیوی کا ہوتا ہے۔۔ گھر

کی تمام ذمہ داری، بہن بھائیوں کی پرورش، والدین کی نگہداشت اور بیوی کے اخراجات سلمان کی زندگی کو بہت مشکل بنا دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تین بیٹوں کی پیدائش اور دن بہ دن خرچوں کا بوجھ سلمان کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی اس سے روزانہ کی چڑچڑ سے تنگ آکر اپنے تینوں بیٹوں کو لے کر میکے چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد روشن پھر اس کی زندگی میں آتی ہے لیکن اب اس وصل کی گھڑیاں نہیں آسکتیں اس کا ثمر کچھ نہیں ہو سکتا۔ سلمان واپس بیوی کے پاس جاکر اپنی تنہائیوں کا ساتھی تلاش کرتا ہے۔

اس ڈرامے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی خود ترتیب دیتے ہیں، ان کو اس کی استطاعت سے زیادہ گھریلو ذمہ داریاں کس طرح خراب کرتی ہیں۔ دھوپ دیوار ڈرامہ میں رشتوں کی شکست وریخت ایک جوائنٹ فیملی کے پیمانے پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یونس جاوید نے مردوں کی توجہ اس جانب مبذول کروائی ہے کہ معاشرتی زندگی کی تعمیر میں عورتوں کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے ترقی کی اس منزل تک پہنچنا جو دراصل انسانیت اور شرافت کی منزل ہے، کسی طرح سے ممکن ہے۔ اس وقت عورتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے جب حقوق نسواں کا خیال رکھ کر ان میں پیار و خلوص سے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ جب تک مرد ان کے حقوق ان کو دینے پر آمادہ نہیں ہونگے، خواتین کو اس بات کی ترغیب دینا کہ وہ اپنے حق کے لیے لڑیں، ان کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ہو سکتا ہے۔

سلمان نے والدین کے دباؤ میں آکر نرگس سے شادی کر لی مگر ذہنی طور پر وہ اس بات کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھا۔ مگر بے چاری نرگس کا اس میں کیا قصور تھا وہ تو خلوص و چاہت لے کر سلمان کی دلہن بن کر آئی تھی۔ روشن کی طرح نرگس بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، سلیقہ مند، اور خوبصورت عورت تھی لیکن چونکہ وہ سلمان کی محبت نہیں ہے اس لیے اسے وہ پیار اور توجہ نہ مل سکا جو اس کا حق تھا۔ ظاہری طور پر سلمان اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتا۔ لیکن چونکہ عورت چاہے جانے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور چاہت ہی اس کی خوشی ہے، سلمان اس چیز کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر پایا۔ محبت کے وہ حسین خواب جو نرگس اپنی آنکھوں میں سجائے جس گھر آئی تھی، سلمان نے اسے چکنا چور کر دیا۔ اس کی بے مروتی، بے توجہی نرگس کو آہستہ آہستہ اس سے دور کرتی گئی۔ اس کی شخصیت ایک ضدی اور ہٹ دھرم بیوی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سلمان کی ناراضگی اور منع کرنے کے باوجود نرگس کالج میں لیکچرار کے طور پر پڑھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ گھر اور اپنی تنہائی سے فرار کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ کالج جانے کی ایک وجہ سلمان کا پورے گھر کے اخراجات اُٹھانا بھی تھا۔ کیونکہ سلمان بھی کالج میں لیکچرار تھا اور اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھیکہ جس سے وہ بیوی کی ہر

خواہش پوری کرتا۔ ناراضگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ان ہی مجبوریوں سے تنگ آکر اس کی بیوی نے تدریس کا پیشہ اپنایااور گھر اور بچوں کی ذمہ داری کو یکسر بھول گئی۔

مخصوص نسوانی ساختاور اس پر پڑنے والا معاشرتی دباؤ، عورت کی مخصوص ذمہ داریاں اور انتہائی آزاد ہونے کے باوجود داخل میں جاری و ساری عزت نفس کی بحالی کی جنگ عورت کو آوارگی کے بعد رندہ یا زندہ درگور کر کے دم لیتی ہے۔یہی حال روشن کا بھی تھاوہ ہر طرح آزاداور خود مختار ہونے کے باوجود بھی اپنی مرضی سے شادی کرنے کے فیصلے میں ناکام تھی۔جب روشن نے سلمان سے شادی کرنے کا فیصلہ کیاتواس کے والدنے اسے یہ کہہ کر سلمان سے شادی کرنے سے منع کیا کہ سلمان ایک خود ساختہ اور خود غرض شخص ہے۔اگر وہ تمہاری خاطر اپنے گھر والوں کو چھوڑنے پر تیار ہے تو کل کو تمہیں بھی کسی وجہ سے چھوڑ کر چلا جائے گا۔اس کے باوجود بھی وہ سلمان سے شادی کرنے پر رضامند ہے۔اس پر اس کا باپ اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔چونکہ روشن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے برسر روزگار ہے، کی نوکری ختم کرنے کی بھی دھمکی دیتا ہے۔وہ اپنی بیٹی پر یہحقیقت آشکارہ کرتا ہے کہجب وہ زمانے کی ٹھوکریں کھائے گی اور دووقت کھانے کو کچھ نہیں ملے گا تو یہ محبت کے افسانے ختم ہو جائیں گے پھر کوئی پرسانِ حال نہیں ہو گا۔اس طرح باوجود نہ چاہنے کے بھی وہ سلمان سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔مگر ساری زندگی اس کی محبت کو گلے لگا کر نیم وحشی حالت میں زندگی بسر کرتی ہے۔اس طرح وہ اپنے آپ کو ناکردہ گناہوں کی سزا دیتی ہے۔

یونس جاوید کے ڈراموں کی عورتیں پڑھی لکھی، سنجیدہ، سمجھداراور متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔مگر نفسیاتی طور پر مردوں سے گہرا جذباتی لگاؤاور محبت رکھتی ہیں جو کہ عورت کی فطرت میں شامل ہے۔یونس جاوید کے ڈرامے عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ان کی عورتیں بیک وقت ماں باپ، بہن بھائیوں اور محبوب سے محبت کرتی ہیں محبوب کی خاطر یااس کی محبت پانے کے لیے وہ باقی محبتوں سے منہ نہیں موڑتیں بلکہ زندگی سے منہ خفا ہو جاتی ہیں جس کی مثال اس ڈرامے کا مرکزی کردار روشن ہے۔ان کے ہاں فطرت اور حقیقت پر مبنی عورت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔روشن کی بے بسی کے پیچھے ظالم سماج اور ماحول ہے جو اسے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیتا۔روشن ایک ایسا کردار ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار کا دلدادہ ہے۔ان کے کردار میں نفاست، تہذیب، اخلاق، شعور اور اعلیٰ اقدار و روایات کا بہترین امتزاج موجود ہے۔روشن وہ باشعور اور حساس کردار ہے کہ اپنے آئیڈیل سلمان کی محبت میں ساری زندگی گزار دیتی ہے مگر کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتی۔روشن اور اس کے والد کے درمیان گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''روشن: (انتہائی غصّے میں آکر) کر دیجیے عاق، آپ تو کہتے تھے ماں ہوں تمہاری، ماں ایسی ہوتی ہے۔ (دروازے کی طرف تیزی سے جاکر) میں جارہی ہوں ہاسٹل۔

والد: مگر باہر نکلنے سے پہلے سن لو کہ تمہارا پاؤں میری شہ رگ پہ ہوگا۔ اور کبھی کوئی فیصلہ برداشت نہیں کرسکتا جب پاؤں کسی کیشہ رگ پہ ہو۔ اور میرا ایک فون۔۔۔۔ ایک فون تمہیں جاب لیس کر سکتا ہے۔ اور ہاں سارے دروازے بند ہو جائیں تو زمانہ انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ اس لیے سوچنے کا وقت دیا تھا تمہیں۔ (گہری سوچ میں ڈوب کر آہ بھرتے ہوئے) یہ لمحہ سنگین ہے اور تم خود مختار۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ تمہاری ذرا سی بھول ہم دونوں کی زندگی کو جہنم بنا سکتی ہے۔

روشن: (روتے ہوئے التجائی لہجے میں) یہ میری بھول نہیں ہے، غلطی نہیں ہے، بھروسہ ہے میرا۔

والد: تم میرے لیے، میری دولت کے لیے، میری جائیداد کے لیے ایک چیلنج بن گئی ہو۔ تم جانتی ہوں زندگی بھر چیلنج قبول کیے ہیں میں نے۔

روشن: یہ گھر، یہ شہر تنگ کر دیا ہے آپ نے مجھ پر۔

والد: اور تم جو میری دنیا تاریک کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ ایسا ہر گز نہیں ہونے دونگا میں۔ ہر گز نہیں۔ اس کا مطلب ہے تمہیں عاق کرنے کا دے دوں اخبار میں۔''(۱۲)

اس طرح دباؤ کا شکار روشن سلمان کی زندگی سے خاموشی سے نکل جاتی ہے۔

سلمان کی ماں کا کردار اس ڈرامے میں برگد کے درخت کی طرح ہے جس کی گود میں ماتا اور محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ دل کے تقاضوں کو یکسر بھلا کر ایک شوہر پرست بیوی کی حیثیت سے خاوند کی مرضی پر چلنے میں بڑا پن محسوس کرتی ہے۔ گھر کی مالکن ہوتے ہوئے بھی احساس ملکیت کا کبھی بھی اظہار نہیں کرتی ہے۔ عورت کا یہ روپ متوسط گھرانوں کا وہ روپ ہے جو بے زبان، بے ضرر، خدمت گزار، ملنسار، وفا شعار اور ایسا وجود جو آنگن میں شفقت اور محبت بکھیرتا ہے۔ ایسی عورت اوشا دیوی کا روپ کہلاتی ہے۔ سلمان کی ماں کا کردار نہ صرف ایک ماں کا کردار ہے بلکہ بہو کے لیے مثبت خیالات رکھنے والا ایک ایسا کردار ہے جو ہر لمحہ اس کے لیے اچھے احساس اور جذبات رکھتی ہے اور اسے بُرا کہنے کی بجائے اپنے بیٹے سلمان میں خامیاں ڈھونڈتی ہے اور اسے برا بھلا کہتی ہے۔ اپنے بیٹے کو ہر وقت اپنی بیوی سے محبت اور اچھا سلوک روا رکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور بیوی کے لیے توجہ اور وقت نکالنے کے لیے کہتی ہے۔ اس ڈرامے میں یہ بھی بتانے

کی کوشش کی گئی ہے کہ جو شخص اپنی حیات کو خود ترتیب دیتا ہے اور اس کی استطاعت سے زیادہ گھریلو ذمہ داریاں اسے خراب کرتی ہیں۔اور شادی کے سلسلے میں گھر والوں کا دباؤ گھر کی جنت کو جہنم کا نمونہ بنا دیتا ہے۔

''دھوپ دیوار میں رشتوں کی شکست و ریخت ایک پوری جوائنٹ فیملی کے پیمانے پر دکھائی گئی ہے۔سلمان میں ۔امجد حسین میں،نرگھس میں ہم سیلف میڈ اور سینٹر میڈافراد کی انانیت کو انسانی رشتوں کو توڑتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ہر سطح پر یہ عمل انسانوں کو زیادہ سے زیادہ تنہائی کا شکار کرتا ہے۔''(۱۳)

بہو نرگھس کا کردار متکبر،خود غرض اور کینہ پروری کی علامت ہے۔وہ پورے خاندان کے لیے عذاب عظیم ہوتی ہے۔جو اپنے شوہر کی کمائی پر نازاں ہے اس کی بدزبانی اور جلی کٹی باتیں اس کے بدمزاج ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ان کرداروں سے ساس بہو کے رشتے میں عورت کی عورت کے ہاتھوں تذلیل کی مثال بھی سامنے آتی ہے۔جو ہمارے معاشرے میں ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ان دونوں کرداروں کو اگر یکجا کیا جائے تو نسائیت کا مکمل مجسمہ بن جاتا ہے۔

نسوانی کرداروں کا مطالعہ رشتوں کے حوالے سے ثابت کرتا ہے کہ جس طرح عورت کی مختلف رشتوں سے پیوستگی کی وجہ سے پہچان ہوتی ہے۔ادب میں بھی اس طرح اس کے کردار نگاری کا غالب اور زیادہ تر رجحان ماں اور بیٹی کی حیثیت سے عورت کی وفا،محبت،ایثار کے پیکر کی روایت سے وابستہ ہے۔محبت انسانی زندگی کا لطیف ترین احساس اور حسین ترین جذبہ ہے۔یہ خوبصورت جذبہ ایک ایسے رشتے اور ایک ایسے تعلق کو جنم دیتا ہے جس میں دلچسپی،مٹھاس اور کشش کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بغیر زندگی میں کمی،محرومی اور تشنگی کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔چونکہ عورت ہی محبت،حسن اور لطافت کا مرکز سمجھی جاتی ہے اس لیے اس کی ہستی کے لیے چاہی جانے اور سراہی جانے والی کا خیال پیدا ہوا۔مرد کے لیے ہمیشہ عورت پُرکشش رہی اس لیے مرد کی رغبت اور معاشرتی واخلاقی رویوں کے باعث عورت ہمیشہ محبوبہ اور مرد عاشق جانا جاتا ہے۔

۱۹۹۳ء میں لاہور مرکز سے پیش کیے جانے والا طویل دورانیے کا کھیل الاؤ ایک نفسیاتی نوعیت کا کھیل ہے۔اس کھیل میں مستنصر حسین تارڑ ہمیں ایسی لڑکی کی کہانی بتاتے ہیں۔جو احساس تنہائی کا شکار رہتی ہے۔بظاہر اسے زندگی کی ساری سہولتیں میسر ہوتی ہیں لیکن والدین کی عدم توجہی نے اس کی زندگی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا تھا ہر شخص نوجوانی میں کسی پروا کرنے والے،کسی چاہنے والے دوست اور ہمسفر کا متلاشی ہوتا ہے۔اس خلا کو پر کرنے کا کام بیرونی عناصر سے کہیں زیادہ بہن بھائی اور والدین دیتے ہیں۔مگر بدقسمتی سے اس لڑکی کو یہ میسر نہیں۔اس لیے اس خلا کو پر کرنے کے لیے وہ متخیلہ کا سہارا لیتی ہے۔جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنا مضبوط ہو جاتا

ہے کہ اسے وہ کردار حقیقت سے زیادہ اصلی نظر آتا ہے۔اس کا تعلق اس کی سوچ و خیال کے مطابق ایک ٹی وی اداکار سے جڑتا ہے جو سکرین سے باہر آ کر اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا اور مسئلے مسائل پر گفتگو کرتا ہے اور اس کی تنہائی ختم کرتا ہے۔

یہ ساری حقیقت ایک مضبوط خیال سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔یہ کیفیت دراصل ایک نفسیاتی عارضہ ہے جو کسی بھی احساس محرومی اور احساس تنہائی کے نتیجے کے طور پر لاحق ہو سکتا ہے۔ حقیقت سے زیادہ بسا اوقات یہ خیالات مضبوط ہو جاتے ہیں اور خیالات کی یہ پختگی اور مضبوطی گمان اور وہم کو یقین میں بدل دیتی ہے۔

طویل دورانیے کا کھیل بازگشت شاہد کاظمی کی عائلی زندگی پر لکھی گئی ایک سبق آموز تحریر ہے۔اُردو ڈراموں میں بیوی کے کردار میں عورت ہمیں شوہر کی دست نگر نظر آتی ہے۔ایک بیوی کی حیثیت سے وہ شوہر کی توجہ اور محبت کی طلب گار،اس سے وفا نبھاتی، سمجھوتے کرتی اور ہر طرح کی قربانیاں دیتی نظر آتی ہے مگر ان سب کے باوجود وہ شوہر کی وفا اور گھر کی بقا کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہے۔ بعض صورتوں میں استحصال اور سخت ناانصافیوں پر مبنی رویوں کی زد میں ہے۔بیوی کا یہ ڈرامائی کردار دراصل سماج کے حقیقی کرداروں کے عکاس ہیں۔ شوہر اگر خوش قسمتی سے بیوی کو اپنا جیون ساتھی اور ہمسفر خیال کریں تو بیوی کی زندگی جنت بن جاتی ہے اور اگر وہ مجازی خدا ہی بنا رہے تو بے چاری بیوی تمام عمر آزمائشوں سے دوچار رہتی ہے۔

(ج) دوسری شادی:

ڈرامہ سیریل شام سے پہلے میں مصنفہ عذرا بابر نے ایسی بیوہ عورت کی کہانی کو موضوع قلم بنایا جو بیک وقت دو کشتیوں میں سفر کر رہی ہے۔یہ عورت ایک طرف بہت ہی حساس، شفیق اور اپنی بیٹی کو جان سے عزیز رکھنے والی ماں ہے اور دوسری طرف اپنے دل سے مجبور ایک ہم عمر مرد کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ یاسمین نامی بیوہ عورت جو آرٹسٹ ہے اور ریڈیو پر گانوں کا پروگرام کرتی ہے۔یہ عورت نہایت ہی گہری، سنجیدہ،اپنی فیملی سے بے حد پیار کرنے والی، حساس اور زندگی کی سمجھ بوجھ رکھنے والی ایک نفاست پسند اور سلیقہ مند عورت ہے۔ شادی سے پہلے اس ڈرامے کا یہ مرکزی کردار یاسمین ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تھی مگر شادی کے بعد اس وجہ سے اداکاری کو خیر باد کہہ دیتی ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی میں مشکلات پیدا نہ ہوں۔ یاسمین کی طرح اس کی بیٹی بھی حد درجہ اداکاری کا شوق رکھتی تھی۔ یہ شوق پورا کرنے کے لیے وہ اسٹیج ڈراموں میں حصّہ لیتی ہے۔یہ فن اسے وراثت میں ملا تھا۔یاسمین اپنی بیٹی کو اداکاری سکھانے میں ہر طرح سے مدد کیا کرتی تھی اور اس کی اداکاری پر تنقید و توضیح کیا کرتی تھی۔ندا اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک آفس میں نوکری بھی کیا کرتی تھی۔ جس کا مالک سلمان صاحب تھے۔

ایک دن ندا کے سٹیج ڈرامہ ختم ہونے کے بعد اس کی ماں کی ملاقات سلمان صاحب سے ہوتی ہے۔ وہ ایک ہینڈ سم اور خوبرو غیر شادی شدہ مرد ہے۔ وہ بھی یاسمین کی طرح ایک سنجیدہ، زندہ دل اور پر وقار شخصیت کا مالک ہے۔ جس نے ساری زندگی صرف اس وجہ سے شادی نہیں کی کہ اسے اپنا کوئی ہم خیال نہ مل سکا۔ حالانکہ اس نے ساری زندگی عورت اور مرد دوستوں کے ایک وسیع حلقے میں اپنا وقت گزارا مگر جیون ساتھی نہ مل سکا جس کو وہ اپنا آئیڈیل کہہ سکے۔ کاروبا میں بہت زیادہ مصروفیت نے بھی یہ خیال ذہن سے محو کر دیا تھا۔ مگر ندا کی والدہ سے ملاقات کے بعد اس کے دل کے کسی گوشے میں ہلچل سی مچلنے لگتی ہے اور اسے اب یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ شاید اب اسے مزید شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ رفتہ رفتہ یاسمین سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور دونوں کو اپنی تنہائی ختم کرنے کے لیے ایک جیون ساتھی کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ نتیجتاً دونوں شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

مصنفہ عذرا بابر نے عورت ہونے کے ناطے عورت کی مظلومیت، بے چارگی اور بے بسی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ندا کا طرز عمل اس کے ماحول اور حالات کے مطابق حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے لیے زندگی موت سے زیادہ اذیت ناک بن جاتی ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا باس سلمان صاحب اس کی والدہ یاسمین سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور اس سے بڑھ کر دکھ اس بات کا بھی ہوتا ہے کہ اس کی ماں بھی سلمان سے محبت کرنے لگی ہے۔

ندا کا اپنی والدہ سے ماں بیٹی کے رشتے کے علاوہ ایک مضبوط رشتہ دوستی کا بھی تھا مگر والدہ کے اس فعل سے وہ ماں سے ناراض ہو جاتی ہے۔ اس کا رویّہ اپنی ماں کے لیے یکسر بدل جاتا ہے۔ نہ وہ پہلے کی طرح ماں سے بات کرتی ہے نہ صحیح کھانا پینا، مختلف کام کاج میں حصّہ نہ لینا وغیرہ یہاں تک کہ اکیلی کمرے میں بند روتی رہتی تھی۔ بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر یاسمین اس کہانی کا مرکزی کردار اور بھی زیادہ پریشان ہو جاتی ہے۔ اس کی بیٹی یہ سمجھتی ہے کہ دراصل اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی ماں کو اس کے ابو سے محبت نہیں رہی۔ وہ اس کے شفیق اور محبت کرنے والے والد کو بھول گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

عمر کے کسی بھی حصّے میں مرد سے زیادہ عورت کو سہارے، چھاؤں اور دکھ درد کے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ماں اکیلی نہیں مگر تنہا تھی۔ جس کو ذہنی آسودگی اور اپنی بچّی کے لیے ایک ایسے فرد اور سہارے کی تلاش تھی جو اس کے احساسات و جذبات کا نہ صرف قدر دان ہو بلکہ اسے ہر پہلو سے سمجھ سکے اور اس کو اور اس کی جوان بیٹی کو تحفظ دے سکے۔ حقیقت میں سلمان صاحب ایسے ہی نفیس اور باوقار شخص تھے جو یاسمین سے دل سے محبت کرنے لگے تھے بلکہ ان دونوں ماں بیٹی کو ہر طرح سے تحفظ دینے کا خواہ تھے۔

یاسمین اپنی بیٹی کی ضد کے سامنے بے بس تھی۔اس نے اپنی بیٹی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنے پر آمادہ کرتی رہی ندانہ مانی۔آخر کار یاسمین کو اپنی بیٹی کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا کیونکہ اولاد کی خوشیاں اپنی خوشیوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔یاسمین اور اس کی بیٹی کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو اور بحث و مباحثہ ذیل دیا جاتا ہے۔

''ندا:(اپنی ماں کی طرف دیکھ کر) آپ کو تو ابو سے محبت تھی کیا آپ جھوٹ بولتی رہیں ان سے ساری زندگی۔

یاسمین(ندا کی والدہ):(ندا کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے)تم دو لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں بیٹا،میری بات کا یقین کرو۔مجھے تمہارے ابّو سے محبت تھی۔لیکن ندا زندگی ایک تحفہ ہے یہ سراپا عذاب نہیں۔اگر مجھے ذرا سی خوشیاں مل گئی ہیں تو میں اداسیوں میں پناہ کیوں لوں۔

ندا:(جذبات میں اٹھ کر) لوگ تو ساتھ ساری زندگیاں گزار دیتے ہیں آپنے تو تیس سال گزارے ہیں کیا آپ سب کچھ بھول گئی ہیں۔ہم سب کتنے خوش تھے ساتھ۔اب آپ ابو کی جگہ کسی اور کو دے رہی ہیں۔

یاسمین:(بیٹی کی آنکھوں میں دیکھ سمجھاتے ہوئے)سلمان ان کی جگہ آئے تو ہیں بیٹا مگر ان کی جگہ لے نہیں سکتے۔''(۱۴)

بہت سمجھانے کے باوجود بھی ندا اپنی ماں کو خوشیوں دینے پر رضامند نہیں ہوتی وہ اپنی ماں کا سارا پیار اور قربانیاں خود غرض انسان کی طرح بھول جاتی ہے اور اپنی ماں کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔یاسمین اپنی بیٹی کی خاطر سلمان صاحب کو شادی سے انکار کر دیتی ہے۔

عذرا بابر نے اس ڈرامے میں مرد اور عورت کے ایک دوسرے کے لیے مثبت خیالات پیش کیے ہیں مگر اکثر اوقات عورت ہی عورت کی مخالفت پر تیار ہو جاتی ہے اور اس سے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق چھین لیتی ہے۔یاسمین کا درد اور اس کے وجود کا سوز اسی کی طرح ایک تنہا زندگی گزارنے والی عورت ہی بہتر انداز میں سمجھ سکتی ہے۔

(د) عورت کی کم تر حیثیت:

ڈرامہ پیلا جوڑا ایک ایسے نو بیاہتا جوڑے کی کہانی ہے۔جو شادی سے پہلے مسلسل غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے بد ظن ہو جاتے ہیں۔ڈرامے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ رمیز نامی ایک نوجوان جس نے آسٹریلیا جیسے آزاد

ملک میں وقت گزارا ہوتا ہے پاکستان کے کسی باعزت گھرانے میں شادی کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی ایک جاننے والی جو کہ دراصل ڈرامے کی ہیروئن شہلا کی خالہ ہے سے رابطہ کرتا ہے۔رمیز ایک نیک شریف لڑکا ہے۔شہلا کی خالہ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شادی رمیز جیسے اچھے لڑکے سے ہو اس کے لیے وہ شہلا کو راضی کرتی ہے۔شہلا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ،خوبصورت، سنجیدہ اور سلجھی ہوئی لڑکی ہوتی ہے۔پہلے تو اس بات کے لیے اس لیے تیار نہیں ہوتی کہ آسٹریلیا جیسے ملک میں پلا بڑھا لڑکا کس مزاج کا ہوگا، کی وجہ سے انکار کا سوچتی ہے مگر جب رمیز اس کے گھر آتا ہے اور دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو اس رشتے کے لئے بخوشی راضی ہو جاتی ہے۔رمیز کو بھی یہ لڑکی شہلا بہت اچھی لگتی ہے اور شادی جلد از جلد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

شادی کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع ہوتی ہیں مگر جب شہلا رمیز سے فون پہ بات کر کے اپنے مرد یونیورسٹی فیلو کا ذکر کرتی ہے تو رمیز کے دماغ میں آسٹریلیا کا ماحول آتا ہے اور وہ شہلا جیسی معصوم لڑکی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کرتا ہے۔رمیز کا لہجہ شہلا کے لیے سخت ہو جاتا ہے۔اس کے بعد ڈرامہ ایک نیا رخ لیتا ہے۔دونوں کے درمیان غلط فہمیاں بڑھتی ہیں۔رمیز کی باتوں اور طنز کی وجہ سے شہلا بہت پریشان ہوتی ہے اور رمیز جیسے شکی مزاج اور تنگ نظر آدمی سے شادی سے انکار کرنے کا سوچتی ہے۔گھر میں چونکہ شادی کا سماں چل رہا تھا۔مہندی کی رسم تک ادا ہو گئی تھی سب مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔تو اس کی خالہ اور باقی گھر والے اس کے ارادے جان کر سخت پریشان ہوتے ہیں۔اور بہت محبت سے اسے سمجھاتے ہیں کہ ایک احمقانہ فیصلہ ہے۔خاندان میں بدنامی ہو گی۔لوگوں ہزار باتیں بنائیں گے۔اپنے گھر والوں کی عزت کی خاطر اور بدنامی سے بچنے کے لیے شہلا رمیز سے نکاح کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک آدمی کو اپنے گھر والوں کی خوشیوں کے لیے دل سے قبول کر لیتی ہے۔

عورت زندگی کے ہر موڑ پر اپنے والدین اور گھر کے لیے قربانی دیتی ہے۔وہ اپنی زندگی جہنم بنا کر لوگوں کے لیے سکھ کا سامان بنتی ہے۔جیسے بھی حالات ہوں صبر و برداشت سے کام لیتی ہے۔اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ کر دوسروں کے لیے باعث مسرت بنتی ہے مگر ان کے حقوق و مسائل سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ان کے جائز حقوق تک ان کو نہیں دیئے جاتے۔جس طرح رمیز شہلا جیسی معصوم لڑکی کے کردار پر بلا سوچے سمجھے شک کرتا ہے اور غلط باتیں کرتا ہے تو شہلا کو بھی مکمل طور پر اپنی زندگی گزارنے کا حق دیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی اور اسی طریقہ کار سے شہلا بھی رمیز جیسے آزاد ملک میں رہنے والے شخص کے بارے میں آزادانہ رائے رکھنے کا حق رکھتی تو حالات کچھ اور ہوتے مگر مشرقی لڑکیوں کو یہ حقوق حاصل نہیں اور اس کے ہر فیصلے کا حق اس کے بڑے کرتے ہیں یہاں تک اس کی زندگی کا ساتھی بھی اس کے گھر کے

بڑوں کی مرضی سے چنا جاتا ہے۔ جس میں لڑکی کی مرضی اور فیصلے کا حق نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ کبھی پیار سے اور کبھی دباؤ سے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اسے اتنا مجبور کیا جاتا ہے کہ شادی جیسا بڑا فیصلہ بھی گھر والوں کی مرضی سے کرتی ہے۔

عورت کی افتادِ طبع، نفسیات، جذبات و خیالات اور اس کی گھریلو زندگی سے متعلق امور پر ان کی رائے کی اہمیت اور صداقت سے انکار مشکل ہے۔ عورت جب پیدا ہوتی ہے تو اس کی ولادت کو ہی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ پھر اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اگر خوش قسمتی سے وہ کسی یونیورسٹی جیسی جگہ تک تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جیسا کے شہلا، تو اس کو مخلوط تعلیم کے طعنے دیئے جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کی زندگی جہنم بنا دی جاتی ہے کہ وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھے۔

جب لڑکی کام کاج کرنے کے قابل ہو جاتی ہے تو ہوش سنبھالتے ہی سارا گھر اس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ جب جوان ہو جاتی ہے تو اس کے والی وارث اپنی مرضی سے اسے بیاہتے ہیں۔ بیوی بنتے ہی شوہر کا سارا گھر اسے سنبھالنا پڑتا ہے۔ ماں بننے کے بعد بھی وہ قابل تسلیم نہیں کی جاتی کہ اسے اہمیت دی جائے۔ اس کے نصیب میں سوائے اس کے کہ وہ ساری عمر دوسروں کی مرضی کی متابعت کرتی ہوئی اس آباد و مامور دنیا سے ارمانوں بھرا دل لے کر چل بسے۔ اسے کوئی خوشی و آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔ ڈراما پیلا جوڑا میں مصنف محمد احمد نے عورت کے صبر و استقامت اور قوتِ برداشت کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ شہلا جیسی معصوم لڑکی خنداں پیشانی، حوصلہ اور ضبط و تحمل سے گھر والوں کا فیصلہ قبول کرتی ہے اور سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ محمد احمد نے مشرقی لڑکیوں کی بے بسی، اداسی اور عجز کی بھرپور عکاسی کی ہے ان کے ہاں نوجوان لڑکی اس احساس کے زیر اثر ہے کہ لڑکیوں کا اپنی تقدیر پر کوئی بس نہیں۔ ماں باپ جہاں چاہیں بیاہ دیں۔ انہیں مجبور ہو کر اپنے گھر جانا پڑتا ہے۔

ڈراما بازگشت کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ارشد نامی آدمی ایک مصور/پینٹر ہوتا ہے جو اس کا شوق ہونے کے ساتھ اس کی کمائی کا بھی ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کی بیوی ایک عام گھریلو عورت ہے جو نہایت حساس اور اچھی عورت ہوتی ہے۔ اس کا ایک بیٹا جمال ہے جو ایک ذہین لڑکا ہوتا ہے وہ اپنے والدین سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔

ارشد جس دفتر میں کام کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس کے بوس کی بیٹی سونی جو لندن سے اپنے شوہر سے طلاق لے کر آئی تھی، اپنے والد کے دفتر میں میٹنگ میں شریک ہوتی ہے۔ وہاں ارشد اور سونی کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں اور بات شادی تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسری شادی سے پہلے ارشد کا اپنی پہلی بیوی کے ساتھ جھگڑوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ

اس کا پہلی بیوی کے ساتھ اب دل نہیں لگتا اور نتیجتاً دوسری شادی کر لیتا ہے۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو اپنے بیٹے کے ساتھ گھر میں چھوڑ کر خود دوسری بیوی کے ساتھ یعنی باس کے گھر میں رہنا شروع کرتا ہے۔

دوسری بیوی کے نخرے اور رویہ سے ارشد بہت جلد اکتا جاتا ہے اور اس کو اپنی پہلی بیوی، بیٹے اور گھر کی یادیں ہر وقت بے چین رکھتی ہیں۔ ارشد جب دوسری بیوی کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور بوس کی ہر بات کا تابع فرمان نہیں ہوتا تو وہ لوگ ارشد کو پاکستان میں چھوڑ کر خود باپ بیٹی لندن شفٹ ہو جاتے ہیں۔

ارشد دوبارہ اپنی پہلی بیوی کے دامن میں پناہ لینے جاتا ہے مگر وہ اپنے شوہر سے بات تک نہیں کرتی۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر دوسری بیوی کے گھر آتا ہے مگر اس کا بیٹا بھی اپنے باپ کو وہاں اکیلے چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس واپس چلا آتا ہے۔

اس ڈرامے میں عورت سے متعلقہ مختلف مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عورت اگر زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہو اور مرد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور جدید ترین زندگی گزارتا ہو تو اس کو گھریلو سلیقہ مند بیوی میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ ایک گھریلو عورت اپنے بناؤ سنگار سے زیادہ وقت اپنے گھر اور گھر والوں کو دیتی ہے۔ اپنی صحت تک ہار کے اپنے شوہر اور بچوں کی صحت کے لیے فکر مند رہتی ہے مگر یہ سب بالائے طاق رکھ کر اس کا شوہر اسے ظاہری لحاظ سے ہر وقت ایک شوپیس کی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر وقت اپنی خواہش اور مرضی پر چلانا چاہتا ہے۔ ایک انسان سے زیادہ اسے ایک مشین متصور کیا جاتا ہے۔ اس کی خواہشات و جذبات کا احترام نہیں کیا جاتا۔ بلکہ شوہر اپنے آپ کو مجازی خدا بنا کر اس سے اپنی پرستش کرواتا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ ڈراما بازگشت میں ارشد کی بیوی بھی کچھ ایسا ہی کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ جو ہر وقت اپنے شوہر کے تابع فرمان رہتی ہے مگر سب کا خیال رکھتے ہوئے اکثر اپنے آپ کو بھولی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح ارشد جب اپنے بوس کی ماڈرن بیٹی کو دیکھتا ہے تو وہ اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کے ساتھ جا کر رہنے لگتا ہے۔ مگر جلد ہی احساس ہو جاتا ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اور اس کا دل دوسری بیوی سے اکتا جاتا ہے۔

پہلی بیوی بے چاری اپنے بیٹے کے ساتھ دل میں یہ غم لے کر اکیلے رہنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہے مگر دوسری شادی کا سن کر اس کا دل ہمیشہ کے لیے اس سے خفا ہو جاتا ہے۔ اب اس کے دل میں اس کے شوہر کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی کیونکہ وہ اندر سے ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔ اس کا شوہر دوبارہ بھی اس کے پاس جاتا ہے مگر وہ اس کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکی ہوتی ہے۔ اس ڈرامے میں عورت بیوی کے روپ میں ناقدری، بے چارگی اور عدم اعتماد کے کرب سے دوچار نظر آتی ہے۔ اس کے حالات ایک عورت یا نسل کی عورت کے

حالات نہیں بلکہ یہ ایک پورے سماج کی عورت کی بے بسی کی داستان ہے۔ارشد کی بیوی ایک بے بس بیوی ہے۔اس کا کردار پاکستانی معاشرے کی ہر عورت اور ہر طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔

بیوی سے وفا کی خواہش،اسے اپنا تابع فرمان کر کے اس کی ہر بات کو نظر انداز کر دینا اور خود نت نئے راستوں پر چل کر محبت کی تلاش میں پھرنا،ہر مشرقی مرد کے اجتماعی معاشرتی رویے کا سب سے غالب پہلو ہے۔بطور رفیق بیوی نے ہمیشہ مرد کی محبت و رفاقت کی نذر کی ہے اور مرد کا رویہ اس کی ہر خواہش کے راستے میں دیوار ہوتا ہے۔رشتے کے اس دوغلے معیار کو بیشتر عورتیں سہہ لیتی ہیں اور جو برداشت نہیں کر پاتیں وہ اکثر یا تو گھٹن کا شکار ہو جاتی ہیں یا پھر خود سری پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ڈرامہ نگاروں نے دونوں قسم کی عورتوں کے کرداروں کو اپنے ڈراموں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔کچھ ڈراموں میں طنز کا عنصر غالب ہے اور کچھ میں انتہائی سنجیدگی سے عورت کے استحصال کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں۔

بشریٰ انصاری کا لکھا ہوا ڈرامہ انوکھا لاڈلا بظاہر تو ایک مزاحیہ ڈرامہ ہے مگر دراصل وہ اس ڈرامے کے ذریعے قارئین کی توجہ عورتوں کے مسائل کی طرف دلانا چاہتی ہے۔ڈرامہ انوکھا لاڈلا جیسے کے نام سے ظاہر ہے ایک ایسے لاڈلے لڑکے کی کہانی ہے جو پانچ بہنوں کے بعد پیدا ہوتا ہے اور پانچ بہنوں اور ماں کی قربت میں زیادہ تر وقت گزارنے اور بہت لاڈ پیار کی وجہ سے اس کی عادتیں لڑکیوں کی طرح ہو جاتی ہیں۔وہ بڑا ہو کر ملبوسات کی ڈیزائننگ شروع کرتا ہے اور بہنوں کے ساتھ مل کر بوتیک چلاتا ہے۔وہ عورتوں کے جدید ترین ملبوسات میں اتنا ماہر ہوتا ہے کہ اس کی بہنیں اپنے لڑکی نما بھائی کے بغیر کچھ بھی نہیں بنا سکتی تھیں۔یہ انوکھا لاڈلا جس کا نام ٹیپو ہوتا ہے کو ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے جس کی عادتیں لباس اٹھنا بیٹھنا وغیرہ لڑکوں کی طرح ہوتا ہے۔دونوں کورٹ میرج کرتے ہیں۔جس پر ٹیپو کی ماں اور بہنیں اس سے بہت خفہ ہوتی ہیں مگر یہ دونوں شادی کر کے بہت خوش رہتے ہیں۔

بیٹے کی شادی اور پسند کی بہو کا مسئلہ پاکستانی معاشرے کا ایک بہت بڑا ناسور ہے۔ہر ماں اور بہنوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بیٹے،بھائی کی شادی اس کی مرضی اور پسند سے ہو جو کہ سراسر غلط ہے۔آنے والی بہو میں بیٹے کی زیادہ تر پسند شامل نہ ہو ورنہ گھر والوں کو بہو بھابھی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔اس ڈرامے میں عورتوں کی نفسیات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ٹیپو بے چارہ اپنی پسند سے شادی کا فیصلہ کر کے اپنی ماں اور بہنوں کو ناراض کرتا ہے۔جس پر سب گھر والے اس کی بہت زیادہ مخالفت کرتے ہیں اور اس کی بیوی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ٹیپو کی دوسری بڑی غلطی اس کے گھر والوں کا نظریہ ہوتی ہے کہ وہ جس لڑکی سے بیاہ کرتا ہے اس کی عادتیں زیادہ تر مردانہ ہوتی ہے جو ہمارے سماج کے لیے ناقابل قبول ہے کیونکہ لڑکی کا زیادہ پُر اعتماد ہونا اس کی خودسری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔لڑکی جتنی چپ،دبی ہوئی اور

خاموش ہوتی ہے۔ سسرال والوں کے لیے اچھی ہوتی ہے تاکہ وہ ان کے کسی بھی قسم کے ظلم و زیادتی پر اف تک نہ کرے جب کہ ٹیپو کی بیوی شمی کی عادتیں مشرقی لڑکیوں کے متضاد ہوتی ہیں جس پر اس کے گھر والے ٹیپو کو بہت برا بھلا سناتے ہیں مگر ٹیپو شمی کو اپنا کر بہت خوش رہتا ہے۔ اس کی بیوی بھی اس پر جان چھڑکتی ہے۔ اس ڈرامے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرد ہی مرد کا دشمن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر عورتیں ہی عورتوں کے حقوق سلب کرتی ہیں۔ عورت کی آزادی اور روشن خیالی کی دشمن عورت ہی ہے۔ جب کہ بعض دفعہ مرد حضرات عورتوں ہی کی پیروی کر کے عورت کی عادتوں اور آزادی کے مخالف ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ٹیپو گھر والے اس کی بیوی کے دشمن بنے ہوتے ہیں۔

شمی کے برعکس ٹیپو میں بھی عورتانہ پن زیادہ نظر آتا ہے جو اس کی بہنوں اور ماں کے لیے کوئی عیب نہیں رکھتا بلکہ وہ اس کا لاڈلا پن ہے۔

(و) خاندانی دشمنی:

۱۹۸۲ء میں گھریلو زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے طویل دورانیے کا کھیل امجد اسلام امجد نے ''بازدید'' کے نام سے لکھا۔ یہ ڈراما ایک ایسی غلط فہمی پر مبنی ہے جو اس ڈرامے کے مرکزی کردار امجد کی زندگی کو مختلف النوع قسم کی مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ہمارے سماج میں والدین کو عموماً ان کی عزت و احترام کے پیش نظر اس قدر مقدس نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کہ ان کی ذات ہر غلطی سے مبرا نظر آتی ہے۔ اس ڈرامے میں ناصر کا بھی اپنے والد کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے جو ایک جرم کے پاداش میں جیل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ لیکن ناصر اپنے والد کو بے گناہ سمجھتا ہے۔

اتفاق سے ناصر کی شادی اس آدمی کی بیٹی سے ہو جاتی ہے جس کے باپ کی بدولت اس کا باپ یعنی ناصر کا باپ جیل گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ واقعی بے گناہ تھا۔ بہر حال ناصر کے اپنے والد کے بارے میں مثبت خیالات کے پیش نظر وہ اپنی بیوی پر اس سوچ کے تحت ظلم و زیادتی کرتا ہے کہ روبینہ (بیوی) کا والد اس کے باپ کی اس حالت کا ذمہ دار اور گناہ گار ہے مگر آخر میں جب ناصر پر حقیقت آشکارہ ہوتی ہے تو وہ بہت شرمندہ ہوتا ہے اور اس کے لیے اس شرمندگی کو چھپانا ناممکن ہوتا ہے۔

> ''ناصر: مجھے مت چھوؤ۔ میرا گندہ وجود اس قابل نہیں کہ اسے تمہارے ہاتھ چھوئیں۔ میں ایک ظالم درندہ ہوں۔ میرے سائے سے جس قدر ہو سکے دور چلی جاؤ۔ میں گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لا سکتا۔ مگر اس ظلم کو تو ختم کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں۔۔۔۔۔

روبینہ: (جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) نہیں ناصر۔ایک غلطی کا علاج
دوسری غلطی نہیں ہوا کرتی۔ میں آپ کی جگہ ہوتی تو شاید یہی کرتی۔''(۱۵)

منقولہ مکالمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کس قدر احمقانہ کام پر خطا کا ازالہ دوسری غلطی سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو گھریلو زندگی تباہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔روبینہ کے کردار میں ڈرامہ نگار نے ایک بیوی کی اپنے شوہر کے لیے محبت، خلوص، صبر واستقامت جیسے اوصاف کو بیان کیا ہے۔عورت اپنے شوہر کا ہر ظلم برداشت کر سکتی ہے مگر وہ اسے طلاق دے دے کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ خود سے اونچا اور بالاتر رکھ کر سوچتی ہے۔

(ہ) بیوگی اور طلاق کے بعد شادی کا مسئلہ:

گھریلو زندگی کے اچھوتے المیے کو یونس جاوید نے سکرین پر لانے کے لیے ایک طویل دورانیے کا کھیل ساون روپ پیش کیا۔یہ ایک انفرادی نوعیت کا ڈرامہ ہے۔سیّد حسن اور عذرا کی بیٹی بھری جوانی میں ہی بیوگی کے غم کو گلے لگاتی ہے۔اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔وہ ایک بچی (سائرہ) کی ماں ہے۔عائشہ کی ماں اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہوئے کہ اس کی جوان بیٹی اپنی پہاڑ جیسی زندگی اکیلی کیسے گزارے گی، پھر سے شادی کرنے کی فکر کرتی ہے۔اس کے لیے وہ سائرہ کی اپنی بیٹی کے طور پر پرورش کرنے لگتی ہے اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ عائشہ کنواری ہے۔بیٹی عائشہ کو نواسی سائرہ کی بہن بنا کر وہ اس کا رشتہ طے کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔لیکن ماں کی مامتا زیادہ دیر تک بیٹی کو بہن بنا کر بہن کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔

''آپ کیسی ماں ہیں۔میری بات نہیں سمجھتیں۔پانی سامنے ہے اور میں پیاسی ہوں۔ندی ہے پر لب خشک ہیں۔ماں کہنے والی موجود ہے۔ماں نہیں کہہ سکتی۔تسلیم نہیں کر سکتی مجھے۔گلے سے نہیں لگا سکتی۔آخر یہ کیسا انصاف ہے۔(سسک کر) میں مر جانا چاہتی ہوں۔مر جانا چاہتی ہوں۔''(۱۶)

عائشہ اس غم کو زیادہ دیر تک نہیں چھپا پاتی۔راز کھل جاتا ہے۔نتیجے کے طور پر سب کی زندگیوں میں طوفان برپا ہوتا ہے۔عائشہ کا شوہر (عامر) اس حقیقت کو جان کر انتہائی غصّہ ہوتا ہے وہ اس کو ہضم نہیں کر پاتا۔سائرہ اپنی جگہ پریشان ہوتی ہے اس کے لیے بھی یہ خبر کسی صدمہ سے کم نہیں ہوتی۔عائشہ بے چاری بے گناہ ہونے کے باوجود دونوں کی نظر میں گر جاتی ہے۔اس حقیقت کو کالعدم قرار دینا آخر میں ممکن نہیں ہوتا اور وہ ایک دوسرے میں دوبارہ پناہ تلاش کرتے ہیں۔

یہ کہانی ہر اس عورت کی کہانی ہے جس کو شادی کے بعد کسی وجہ سے ایک دو اولاد ہونے کے بعد طلاق ہو جاتی ہے یا بے چاری بیوہ ہو جاتی ہے۔ تو اس صورت حال میں اس کے لیے دوبارہ شادی کرنا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ اول تو ایسی عورتوں کی کسی اچھی جگہ پر شادیاں نہیں ہوتیں اگر کوئی ان عورتوں سے شادی کرنے کے لیے تیار بھی ہو جائے تو ان کی اولاد کو قبول نہیں کیا جاتا اور اکثر اسی شرط کے ساتھ شادی طے کی جاتی ہے کہ ان کا ان کی اولاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ بہت ساری عورتیں اپنی اولاد کی خاطر شادیاں نہیں کرتیں۔ اور محنت مزدوری کر کے ان کو پالتی ہیں۔ ان کی زندگیاں اپنی اولاد کی خاطر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسی عورتیں بد قسمتی سے معاشرے کے لیے ایک بوجھ بن جاتی ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال تک نہیں ہوتا۔

(ی) عورت کا بانجھ پن:

اصغر ندیم سیّد کی عورت کی بحیثیت ماں اور بیوی کے کردار پر ایک دل سوز تحریر " گل پھینکے ہیں " ہے۔ اس ڈرامے میں انسان کی حقیقی خوشیوں کے مبداء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں اولاد زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے اور یہ حقیقی خوشی دینے والی عورت کی مقدس ذات ہے۔ عورت ماں ہو، بیوی ہو یا بیٹی ہر حیثیت میں قابل احترام ہے۔ اس ڈرامے میں کئی ایک اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں اولاد ایک نعمت، کثرت اولاد، اولاد کی محبت، زبردستی کی شادی اور عورتوں کا اپنے پیشے یا کاموں کے ساتھ مخلصانہ رویّہ شامل ہیں۔ ڈرامے میں کئی کردار ہیں جن میں رب نواز اور اس کی بیٹی زرینہ، کونسلر، سدرہ یٰسین، سکندر خاں اور اس کی بیوی ڈاکٹر جہاں آراء کا کردار اہم ہے۔

ڈرامے کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ لیڈی ڈاکٹر جہاں آرا جو کہ شہر کے بڑے ہسپتال میں ڈاکٹر ہوتی ہے اور ان کا شوہر بھی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا ہے مگر ان کے ہاں بچے نہیں ہوتے ہیں۔ جہاں آراء ایک محنتی اور اپنے پیشے سے بہت ایماندار ہوتی ہے مگر بد قسمتی سے ایک دفعہ ہسپتال میں ان کی غیر موجودگی سے زچہ بچہ کیس میں ماں کی فوتگی ہو جاتی ہے جس کا ذمہ دار جہاں آراء خود کو ٹھہراتی ہے اور ہسپتال سے استعفیٰ دے دیتی ہے۔

اس ڈرامے میں شیر انامی ایک مختصر مگر اہم کردار ہوتا ہے وہ ایک اشتہاری ڈاکو ہوتا ہے۔ اسے ایک غریب شخص کی بیٹی زرینہ سے محبت ہو جاتی ہے اور اس سے زبردستی شادی کر لیتا ہے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد پولیس مقابلے میں مارا جاتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو ایک خوبصورت بیٹی کی ماں بناتا ہے مگر اس کا نانا اسے ڈاکو کی اولاد سمجھ کر یتیم خانے میں ڈال دیتا ہے۔ اور بیٹی کو یہ بتاتا ہے کہ پیدائش کے وقت بچی کی موت ہو گئی تھی۔

جہاں آراء اور اس کا شوہر یتیم خانے سے اس بچی کو گود لیتے ہیں۔ دونوں کی زندگیوں میں بچی کے آنے سے بہار آتی ہے اور وہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

زرینہ کا والد اسے دوسری شادی کے لیے آمادہ کرتا ہے مگر ماں کی مامتا کی تڑپ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کو کہیں سے اپنی بیٹی کے زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے اور وہ بیٹی کو تلاش کرتے کرتے آخر کار جہاں آراء کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ وہ وہاں اپنی بیٹی کو اچھی حالت میں پا کر اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہے۔ اور اس کو جہاں آراء کی گود میں بے بسی کے ساتھ چھوڑ کر دوسری شادی کر لیتی ہے اور کچھ عرصہ بعد بیٹے کی پیدائش سے ماں کی مامتا کو صبر آجاتا ہے۔

اس ڈرامے میں عورتوں کے اولاد کے لیے احساسات و جذبات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس ڈرامے میں دو ایسی عورتوں کی مامتا کی تڑپ دکھائی گئی ہے جن کا دکھ دیکھنے سے زیادہ محسوسات سے تعلق رکھتا ہے۔ زرینہ غریب ہے اور ایک بد معاش آدمی زبردستی اس سے شادی کرتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک عام المیہ ہے۔ ایک غریب آدمی کی بیٹی کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ جنگلی جانوروں جیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ والدین کے گھر میں ان کے زیر تسلط سارے دکھ سہتی ہے۔ شادی کے بعد اس کا شوہر اس کا آقا بن جاتا ہے۔ زرینہ کا کردار ایسی ہی ایک لڑکی کا کردار ہے۔ جس سے ایک اشتہاری ڈاکو زبردستی شادی کر لیتا ہے۔ مگر بے بسی اور ڈر سے وہ خاموش رہتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو اس کے لیے قابل نفرت ہے۔ مگر اس کی آواز سننے والا اور ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کشور ناہید خواب عورت خواب اور خاک کے درمیان میں لکھتی ہے کہ

> ''جنگوں اور لڑائیوں کے دوران کبھی مال غنیمت کے طور پر، کبھی لونڈیوں کی شکل میں کبھی مفتوحہ قوم کی زیر دست عورتوں کی شکل میں، عورتوں کو یرغمال بنا کر، عصمت دری کرنا اور مردانگی کے جھنڈے گاڑنا، تاریخ کا وہ حصّہ ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا ہے۔''(۱۷)

زرینہ کے ساتھ زبردستی کی شادی رچا کر اس کو جیسے ہمیشہ کے لیے یرغمال بنا دیا گیا۔ مگر وہ حالات کے سامنے بے بس تھی۔ بے چاری کے ساتھ ایک دوسرا بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شوہر کی وفات کے بعد اس کی بچی کی پیدائش ہوتی ہے۔ اور غربت، ذمہ داری اور ایک ڈاکو کی بیٹی ہونے کے ناطے اس کا باپ اسے یتیم خانے میں چھوڑ دیتا ہے۔ زرینہ پر جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے۔ وہ بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ وہ دن رات اپنی مامتا کی تڑپ میں زار و قطار روتی ہے اور جب اسے اپنی بچی کے زندہ ہونے کی خبر ملتی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں ہوتی اور روز و شب اس کی صحت و حفاظت کے لیے دعائیں کرتی ہے۔ جو عورت ایک ناجائز بچے کو جنم دیتی ہے اسے بھی اپنے وجود سے پیدا ہونے

والے نومولود سے محبت ہوتی ہے اگرچہ معاشرتی اصول و ضابطے ایسی ماں کو عزت نہیں بلکہ ذلت و بدنامی کا طوق عطا کرتے ہیں۔ جب کہ زرینہ کے بطن سے پیدا ہونے والی بچی اس کی جائز اولاد تھی وہ کیسے اپنی بچی کو بھلا سکتی تھی۔ وہ ایک ایسی نامعلوم منزل کی طرف بیٹی کی تلاش میں چل نکلتی ہے جس کا اسے کوئی اتہ پتہ نہیں ہوتا مگر اس کی تڑپ اور لگن اسے اپنی کھوئی ہوئی بچی سے ملا دیتی ہے۔

شادی اور ماں بننا، مرد کے مقابلے میں عورت کی زندگی کا ماحصل تصور کئے جاتے ہیں۔ عورت سے وابستہ سب سے بہترین اور معتبر رشتہ ماں کا ہے۔ مختلف تہذیبوں اور مذاہب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ماں کے روپ میں عورت کو عزت و تکریم دی۔ کبھی ماں کو دھرتی سے تعبیر کیا تو کبھی ماں کو دیوی ماتا قرار دیا۔ نسل انسانی کی بقا عورت کی قوت تخلیق سے وابستہ ہے۔ سماجی رسم و رواج عورت کو بحیثیت ماں عزت و احترام کا اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ اس طرح عورت کا ماں بننا اس کی فطری خواہش اور اس کی ازدواجی زندگی کی کامیابی کی کلید تصور کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عابدہ علی لکھتی ہے کہ:

> ''پاکستانی عورتوں کی زندگی میں ان کے مادرانہ کردار کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ عورت کے ماں بننے کو ایک نعمت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے سہاگن اور پھر حاملہ ہونے کو نعمت خیال کیا جاتا ہے۔''(۱۸)

جہاں آراء چونکہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی اس لیے اس کی اولاد کے لیے پیاس و تڑپ بہت زیادہ تھی۔ ہر قسم کی مادی سہولیات و آرام کے باوجود اس کی زندگی میں خوشی نہیں تھی اور اس کی بڑی وجہ اولاد کی کمی تھی۔ وہ ہر وقت اس نعمت کے لیے دعا کرتی اور چھپ چھپ کر روتی تھی۔ یتیم خانے سے بچی گود لینے کے بعد اس کی زندگی گل و گلزار ہو جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان بہت بڑا ناشکرا ہے۔ زندگی بھر اصل خوشیوں اور نعمتوں کی قدر نہیں کرتا۔ زرینہ کے پاس اولاد کی دولت ہے مگر غربت میں اسے اس نعمت کی قدر نہیں۔ جہاں آراء کے پاس بہت سارا روپیہ پیسہ عیش و آرام ہے جب کہ اولاد جیسی نعمت کی کمی ہے تو اسے کسی بھی چیز میں سکھ دکھائی نہیں دیتا۔ غریب اور ان پڑھ لڑکی کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور ایک پڑھی لکھی خود مختار پیشہ ور عورت کے کیا مسئلے مسائل ہوتے ہیں ڈرامہ نگار نے ان کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

باب سوم میں بیان کردہ ڈراموں اور عورتوں کے مسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کو ہمارے ہاں ایک انسانی جانور سے مشابہ قرار دیا گیا ہے کہ جس کے کان ہیں مگر وہ سماعت سے محروم ہے، وہ ذہن و فکر رکھتی ہے مگر وہاں دانش معدوم ہے، وہ آنکھوں سے آشنا ہے مگر بصارت سے کوسوں دور ہے، وہ قدرتی لب اور زبان سے فیض یاب ہے مگر اظہار و

بیان سے بے علم ہے، یہ عورت ہاتھ پاؤں رکھتی ہے مگر حرکت و قدم لینے سے معذور ہے۔ کیا یہ وطیرہ درست ہے کہ عورت کو ہم لوگ غلام بنت غلام تصور کریں اور اس کو اپنے کاموں اور بیگاروں کے لیے نام و بناوٹ کے مقاموں سے یاد کریں۔ بے شک عورت کے ارد گرد ایک پورا ہجوم موجود ہے اور وہ صرف ایک کردار کا نام ہے۔ مگر کیا وہ وقتی و عارضی چیز ہے، نہیں ایسا ہر گز نہیں ہے بلکہ وہ ایک آفاقی و عالمگیر ہستی ہے جس کو قطعاً قدرتی، پیدائشی اور سماجی حقوق سے بے بہرہ نہیں رکھا جا سکتا۔ عورت ہے تو پورا سماج اور انسانیت ہے۔ کیا ایک عورت کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ کم از کم پوری زندگی اور مکمل عمر گزارنے کے لیے اپنی پسند کا اظہار کریں۔ وہ اس فکر و نظر کو سامنے لائیں جس نے اس کی حیات کو پورا تحفظ حاصل ہو اور وہ ایک ایسے ساتھی کا انتخاب کریں جس سے اس کی کیون کو ہمیشہ کا سکھ ملے۔ پسند کی شادی اور اپنی مرضی کا اظہار کیا ایک عورت کا حق نہیں ہے، کیا قدرتی اور قانونی طور پر یہ قبیح عمل ہے، ہر گز نہیں بلکہ یہ مشاورت، انصاف اور مساوات کا تقاضا ہے کہ عورت خود اپنی پسند سے اور بڑوں کی مشاورت سے اپنی زندگی و شادی کا فیصلہ کریں۔ عورت سے منسلک مسائل مثلاً پسند کی شادی، مرضی کی شادی اور دوسری شادی وغیرہ کو انا کا مسئلہ بنانا ایک غیر انسانی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں روایتی شادی کے نام پر بھی عورتوں کے ساتھ یک طرفہ فیصلے رواں دواں ہیں۔ ایک عورت کو بولنے اور بات کرنے سے محروم رکھنے اور صرف ہاں میں ہاں ملانے کا رواج برسوں سے جاری ہے اور یوں ایک عورت کو ہر طرح سے غلام بنایا جاتا ہے۔ عورت کا ایک گناہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بیٹی، بہن اور ماں وغیرہ کیوں ہے۔ زیادہ تر اس انسان کو ''عورت'' ہونے پر بھی کم حیثیت بلکہ بدترین مرتبے سے نوازا جاتا ہے۔ اگر یہی عورت اولاد کی نعمت سے محروم ہو اور بانجھ پن کا شکار ہو تو اور بھی عذابوں اور تکلیفوں سے دوچار ہوتی ہے۔ ڈراماؤں، دور جنوں، کانچ کا پل، دروازہ، چٹان پر گھونسلا، دھوپ دیوار، شام سے پہلے، پیلا جوڑا، بازدید، ساون روپ اور آلاؤ میں عورت کو جہاں اور مسائل میں گر، فتار، ن ھ ک دکھایا گیا ہے وہاں اولاد، بیٹی کی پیدائش، روایتی شادی، پسند کی شادی بانجھ پنا اور عورت کی کم تر حیثیت وغیرہ کو بھی بہترین ڈرامائی تشکیل اور کردار نگاری سے ظہور دیا گیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک عورت کو آزاد بشر مانا جائے، اس کی حیثیت و اہمیت کو سر خم تسلیم کیا جائے، اس کو گھر تا سماج ہر سطح پر محفل مشاورت کا ابدی رکن بنایا جائے، انفرادی و اجتماعی فیصلوں میں ان کی رائے سنی جائے، اُس کو بنیادی حقوق کے ساتھ سماجی سہولیات فراہم کی جائے اور اُس کو اس مقام خاص پر فائز کیا جائے کہ اس کا آسمانی، سماجی اور زمینی حق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلمان بھٹی محمد، پاکستان ٹیلی وژن ڈراموں میں سماجی حقیقتیں، یونیورسل بک ہاوس، لاہور، ص۹۷

۲۔ منوبھائی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، دروازہ، www.youtube.com، ۲۶ جنوری، ۲۰۱۷ء، 2:00pm

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ بانو قدسیہ، فٹ پاتھ کی گھاس، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۸۹ء، ص۵۷، ۵۸

۸۔ انور مقصود، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، اماں، www.yputube.com، ۱۹جولائی، ۲۰۱۸، 4:00pm

۹۔ عارفہ سید، ڈاکٹر، خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے، مشمولہ عورت زبان خلق سے زبان حال تک، (مرتبہ) کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۱۰۸

۱۰۔ یونس جاوید، کانچ کا پل، لاہور یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء، ص۸۹

۱۱۔ صفدر میر، مشمولہ، کانچ کا پل از یونس جاوید، لاہور، یونیورسل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص۱۵

۱۲۔ یونس جاوید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، دھوپ دیوار، www.youtube.com . ۱۲اپریل، ۲۰۲۰ء، 1:00pm

۱۳۔ امجد اسلام امجد، اپنے لوگ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۵۷، ۵۸

۱۴۔ عذرا بابر، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، شام سے پہلے، www.youtube.com، ۱۲اکتوبر، ۲۰۱۷ء، 11:30am

۱۵۔ امجد اسلام امجد، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، باز دید، www.youtube.com, ۱۸اپریل، ۲۰۱۸ء، 1:00pm

۱۶۔ یونس جاوید، ساون روپ، مملوکہ سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی، لاہور مرکز، ۱۹۸۴ء

۱۷۔ کشور ناہید، عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۵۶

۱۸۔ عابدہ علی، پروفیسر، ڈاکٹر، عورت قرآن و سنت اور تاریخ کے آئینے میں، قرآن منزل، لاہور، اشاعتسوم، س۔ن، ص۹۱۱

باب چہارم:

پی ٹی وی کے طویل دورانیے کے ڈراموں میں عورتوں کی معاشی حیثیت

ڈرامہ خواہ طنزیہ ،مزاحیہ ہو یا سیاسی اور تاریخی ، بڑوں کے لیے پیش کیا گیا ہو یا بچوں کے لیے ہر طرح سے معاشرتی رویے اور رجحانات کی تنسیخ یا تبلیغ کرتا ہے۔جب سے پاکستان میں ٹیلی وژن کا آغاز ہوا تو اس حقیقت کا ادراک روزاوّل ہی کر لیا گیا کہ ڈراما معاشرے کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے لیے جس حد تک کار گر و مفید ثابت ہو سکتا ہے کوئی اور ذریعہ نہیں کر سکتا۔اسی وجہ سے ہندوستان کے بر عکس ٹی وی کا آغاز پاکستان سے ہوا تو پہلے دن سے ہی ڈراما ایک نا قابل فراموش حصّہ بن گیا۔پی ٹی وی کے اُردو ڈراموں میں زیادہ تر معاشرتی موضوعات ہی حاوی رہے ہیں۔ان موضوعات میں زیادہ تر نفسیاتی الجھنوں پر مبنی ڈرامے، گھریلو زندگی کے موضوعات، جرم و سزا سے متعلق ڈرامے، جاگیر درانہ نظام اور اس کی خامیوں کو اجاگر کرنے والے ڈرامے، نوجوان نسل کے مسائل و مشکلات پر مبنی ڈرامے ،ارباب اختیار کی ریشہ دوانیوں اور حقائق کا پردہ چاک کرنے والے ڈرامے ، گویا ہر معاشرتی طرز کے بہترین ڈرامے شامل ہیں۔پی ٹی وی پر دکھائے جانے والے ڈراموں میں زیادہ تر ڈرامے معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ان میں خانگی زندگی، خونی رشتوں میں پڑنے والی دراڑوں، رشتے ناتوں کی نزاکتوں، نسلی تفاوت اور ایسے بہت سارے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

(ا) میل سنٹر پرابلم/ مرد مرکزی مسئلہ:

نوجوان نسل اور جرم و سزا جیسے معاشرتی سطح پر پیش کیے جانے والے اُردو ٹی وی ڈراموں کا ایک موضوع سرمایہ درانہ نظام پر تنقید بھی رہا ہے۔چند طبقوں نے قیام پاکستان کے بعد ملک کو کچھ اس طرح لپیٹ میں لے لیا کہ اس چنگل سے آج تک ہم آزاد نہیں ہو پائے۔ان لوگوں کے لیے، قانون ،اصول اور ضابطہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ان کے نزدیک قوانین وضوابط بنتے ہی توڑنے کے لیے ہیں اور یہ قوانین وضابطے اس صورت میں بے معنی ہیں اگر ان سے اس طبقے کو فائدہ نہ ہو۔ استحصالی طبقے کی تصویر کشی کرنے کی ایک کوشش ڈرامہ سٹیٹس ہے بحیثیت ماں، بیٹی، بیوی، محبوبہ خواہ کوئی بھی کردار ہو، مختلف حربوں سے ظلم و تشدد کا نشانہ بنی۔ان کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں۔اس ڈرامے کا ایک پہلو سرمایہ درانہ نظام میں مردوں کی منفی سوچ ہے۔اس ڈرامے کا آغاز ناصر اور ساجدہ (میاں ،بیوی) کے جھگڑے سے ہوتا ہے۔جس میں ناصر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تمہارے میکے والوں کے لیے جائیداد کا مقدمہ میں نے لڑا ساری مشکلات کا سامنا میں نے کیا۔مگر جب جائیداد کی قیمت لگی، بیچی تو سارے پیسے جیب میں ڈال لیئے۔ناصر اپنی بیوی کو بہت بُرا بھلا کہتا ہے۔بے رحم اور ظالم عورت کا طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم اپنے میکے والوں کو زیادہ چاہتی ہو تمہاری زندگی میں میری

کوئی حیثیت نہیں۔ وہ اپنی بیوی کو دھمکی دیتا ہے کہ آج ہی جاؤ اور اپنے والدین سے میرا حصّہ مانگ کر لاؤ ورنہ سزا دونگا۔ ساجدہ بے بسی کی تصویر بن کر کھڑی ساری باتیں سنتی ہے۔ اس کی زندگی کے بارہ سال اس آدمی کے ساتھ گزری مگر ایک دن بھی نہ گھر جا سکی تھی کیونکہ اولاد کے لیے ماں ہر دکھ برداشت کر لیتی ہے۔ اگلے دن جب ناصر اپنی بیوی سے پوچھتا ہے کہ تم میکے گئی تھیں تو انھوں نے کیا جواب دیا۔ اس کی بیوی اس کے سامنے اس دفعہ ڈٹ جاتی ہے کہ انھوں نے کوئی حصّہ نہیں دیا تو ناصر بھڑک اُٹھتا ہے کہ تم ایک جاہل عورت ہو، تمہیں بات کرنا بھی نہیں آتا۔ تمہاری شکل بہت بد صورت ہے، تم ایک کوڑ مغز عورت ہو، ایک جانور سے بھی بد تر ہو، اس پر اس کی بیوی اسے اپنی سابقہ حیثیت یاد دلاتی ہے کہ تم ایک غریب لڑکے تھے، میرے والدین نے تمہیں پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ آج تم تن کر کھڑے ہو تو جواب میں اسے بد صورت کا طعنہ دیتا ہے کہ اس کے بدلے مجھے تم جیسی بد صورت عورت سے شادی کرنی پڑی۔ مجبور ہو کر اور تنگ آکر ساجدہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ جاتے جاتے وہ اسے یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ تمہارے جانے سے کوئی کام نہیں رُکے گا بلکہ ملازمہ تم سے بہتر کام کر سکتی ہے۔

وقت ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہراتا ہے اس کا بیٹا احسن روزانہ اپنے والدین کے جھگڑے دیکھتا اور اندر ہی اندر دل میں روتا رہتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ بھی اپنے والد کی ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ ایک معزز، شریف اور امیر آدمی جبار نامی آفیسر کے دفتر میں مکر و فریب سے ایک اچھے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔ احسن چونکہ اپنے والد کے ساتھ رہتا تھا، اس لیے اس کے تمام شوق اپنے والد کی طرح ہیں جھوٹ، مکر، فریب، دولت کی ہوس اور نام نہاد سٹیٹس ان کی اولین ترجیحات ہیں۔ اس خود غرض احسن کی شادی چابلوسیوں کے تحت اپنے آفیسر جبّار کی معذور بیٹی سے ہو جاتی ہے۔ اس کی معذور بیوی ساحرہ جو ایک انتہائی ذہین اور سمجھدار لڑکی ہے، سے شادی کر کے اس کے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ وقت گزرتا گیا احسن اب دو بچوں کا باپ بن گیا تھا مگر وہ روزانہ اپنی معذور، بے ضرر اور معصوم بیوی سے لڑتا جھگڑتا ہے اور اس کے باپ سے چھپ کر آفس میں میں ناجائز اور حرام کی دولت جمع کرتا ہے۔ ساحرہ شوہر کی خاطر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی، اور اپنے گھر اور بچوں کے لیے شوہر کے کرتوتوں پر پردے ڈالتی رہی۔ ساحرہ کو جب اس کا والد احسن کے ناجائز کاموں کی فائل دکھاتا ہے تو وہ اور بھی دکھی اور پریشان ہوتی ہے۔ اپنے والد سے کہتی ہے کہ ایک طرف آپ اور آپ کے اصول اور دوسری طرف میں اور میرا گھر۔ کیا کروں میں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

احسن ترقی کرتے کرتے کمپنی کا چیئرمین بن جاتا ہے مگر یہ ترقی عارضی ہوتی ہے وہ سارے کام روپے کے بل بوتے پر اور چابلوسیوں سے کرواتا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے سسر جبار نے اس کے خلاف سارے ثبوت و

شواہد اکٹھے کر لیے ہیں تو بد حواس ہو کر گھر آتا ہے اور اپنی بیوی ساحرہ کو کھری کھری سناتا ہے احسن اور اس کی بیوی کے مابین گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''احسن: (گھر کا دروازہ زور سے بد حواسی میں کھولتا ہے) کہاں ہے وہ کہاں ہے۔

ساحرہ: وہ کون؟

احسن: تمہارا باپ۔

ساحرہ: (وہیل چیئر پر بیٹھی ہوتی ہے) کیا کہہ رہے ہو تم۔

احسن: فائلیں دکھا دکھا کر ڈراتا ہے مجھے، خوفزدہ کرتا ہے مجھے۔ اس لیے کہ میری ترقی اس کی موت ہے۔

ساحرہ: (رو رو کر اور سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے کانوں کو پکڑتی ہے) یہ کیا ہے سب۔

احسن: (تکبر سے سر اُٹھا کر) چیئر مین بنا ہوں تو فائلیں وجود میں آگئی ہیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے اوروں کے ساتھ مل کر کرے مقدمہ مجھ پر۔ ٹھیک ہے ہمت ہے تو جیت لے (گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) لیکن وہ ہے کہاں میں اس کا خون۔۔۔۔۔۔

ساحرہ: محسن ہیں وہ تمہارے۔

احسن: محسن، محسن۔ محسن۔۔۔۔۔۔ تنگ آگیا ہوں میں اس لفظ سے تم سوچتی ہو کہ ہر ترقی پانے والے شخص کے پیچھے کسی بد صورت، بیمار اور اپاہج لڑکی کے باپ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (غصہ سے) تم لوگ اندر باہر سے اپاہج ہو بیمار ہو۔''(۱)

یہ تمام گفتگو احسن کے سسر بھی سن لیتے ہیں اور جب وہ فائل احسن کو دکھاتے ہیں تو وہ فائل چھین کر اپنے سسر جبار کو دھکا دے کر گھر سے بھاگ جاتا ہے اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر ایئر پورٹ کی طرف گاڑی تیز تیز دوڑانے لگتا ہے۔

اس ڈرامے کو پیش کرتے ہوئے مصنف یونس جاوید نے ساحرہ جیسی خاموش طبع معذور عورت کو بیوی کی حیثیت میں ایک جاندار کردار بنایا ہے۔ یہ کردار عورت کے گہرے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے جو اسے کسی مطالعے سے نہیں زندگی کی ریاضت سے حاصل ہوا ہے۔ یونس جاوید نے عورت کی ذہنی نفسیات و کیفیات کا تجزیہ بھی کیا ہے ڈرامے کا ایک کردار شاہینہ جس کو احسن دفتر میں اس کی ذاتی سیکرٹری کا عہدہ دیتا ہے دراصل احسن کی محبوبہ ہے جس کو احسن دولت و جائیداد کا لالچ دے کر اسے کسی طرح پھنسانا چاہتا ہے۔ مرد مرکزی نظام میں عورت ہمیشہ محکوم ہی رہتی ہے۔ شاہینہ جیسی خوددار اور حساس لڑکی احسن جیسے آدمی سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ دراصل اس کو نفسیاتی طور پر بیمار سمجھتی ہے۔ شاہینہ کا کردار جدید دور کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے، تعلیم و خود مختاری کے

حصول ،زندگی کے سفر میں تمام تر جدو جہد اور شمولیت کے باوجود روایتی قدروں کی حامل مشرقی عورت کا کردار ہے۔معاشرتی روایات کے بنائے ہوئے سانچے میں محبت ،وفا،خود سپردگی،خاندان ،رواجوں اور قربانی کے معیارات عورت کے لیے مقرر ہیں،یہ کردار اس پر پورا اترتا ہے اور انفرادی شخصیت اور نسائی شعور کا اظہار بھی کرتا ہے۔

احسن جب اسے اپنے پاکستان سے فرار ہونے پر سبز باغ دکھاتا ہے تو شاہینہ اسے ایک ایسے سٹیٹس کا طعنہ دیتی ہے جو اس کا محض تصور ہے۔احسن اور شاہنہ کے مابین مکالمہ توجہ طلب ہے۔

''احسن: یہ شادی نہیں جبر تھا۔میں نے اپنے اوپر خود کیا تھا۔لیکن میں اب سارے رشتے توڑ کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔

شاہینہ: یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

احسن :تم جس منزل پر کھڑی ہو اگر لوگ دیکھیں تمھیں تو رشک سے آنکھیں پھٹ جائیں ان کی۔

شاہینہ :میں اب بھی نہیں سمجھ سکی۔

احسن: تم بہت سادہ ہو بہت سادہ۔اس لیے پسند ہو مجھے۔میری عزت،میری شہرت، یورپ کے بینکوں کا سرمایہ تمہارے لیے صرف تمہارے لیے۔کسی لالچی عورت کی خواہش سے بھی زیاد ہجواہرات کا ڈھیر ہے ایک ڈھیر ہے جس کو اٹھانے کے لیے تمہیں جھکنا بھی نہیں پڑے گا۔اور ساتھ میں۔۔۔اور ساتھ میں میری چاہت بھی ہے۔اگر میں چاہوں تو دنیا کی کسی عورت سے بھی شادی کر سکتا ہوں کسی بھی عورت سے۔اور اس کو فخر محسوس ہو گا مجھ پر۔

شاہینہ :گاڑی روک دیجیے سر گاڑی روکیں۔

احسن:(حواس باختہ ہو کر گاڑی سے ایئرپورٹ پر اترتا ہے اور شاہینہ کا ہاتھ پکڑتا ہے)لگتا ہے میری باتوں پر یقین نہیں آرہا کسی بھی عورت کی طرح، نہیں آرہا نہ یقین مجھ پر۔ایک سیکنڈ تمہیں پاسپورٹ دکھاتا ہوں۔ابھی دکھاتا ہوں۔تم اپنی زندگی کو خواب ناک بنانے لگی ہو،چلو، جلدی کرو،چلو، پولیس اور حاسد ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور خوشیاں ہماری منتظر ہیں۔چلو آؤ چلو جلدی کرو چلو۔تم ادنی تمناؤں کی حد بتاؤ ok,allrightٹھیک ہے بعد میں بتادینا،ہم پیرس جائیں گے پھر سوئیزرلینڈ پھر

ویانا۔یہی وہ خواب ہے وہ منظر ہے جو ہر آدمی ادنی آنکھوں میں پُروئے پھرتا ہے۔تم نے بھی اس طرح کے منظر اور خواب دیکھے ہونگے۔

شاہینہ: سوری سر۔

احسن: اوہو مجھے یہ سر سر نہ کہو یہ کوئی دفتر نہیں ہے نہ یہاں کوئی ملازم نہیں ہم سب برابر ہیں۔اور تم اوپر ہواؤں میں اڑو گی۔اب تم دیکھنا، دیکھنا،

شاہینہ: آپ کے اندازے غلط ہیں سر میرے کوئی خواب نہیں ہیں۔

احسن: کوئی خواب نہیں ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

شاہینہ: میں اپنے چھوٹے سے گھر میں خوش ہوں گھر اور محبت دونوں میرے پاس ہیں۔ یہی میری خواہش ہے۔کسی بھیعورت کی خواہش۔

احسن: جب تم اپنے آپ کو زیورات میں لدھا دیکھو گی تو تمہاری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی۔ جیتا جیتا لہو تمہارے انگ انگ میں گلے گا۔تم صرف حکم چلاؤ گی صرف حکم اور خواب دیکھو گی۔

شاہینہ: سر زیور و جواہر بہت شہرت اور عیاشی یہ سب بہت چھوٹے لوگوں کے خواب ہیں۔جن کا کوئیسٹیٹس نہیں ہوتا۔مرد جب عورت کو سمجھ نہیں سکتا تو سونے اور سکوں میں تولنے لگتا ہے۔

احسن: تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔

شاہینہ: میری خوشیاں اس زمین پر ہیں جس پر میں کھڑی ہوں آپ کھڑے ہے۔اس مٹی کی خوشبو سے میری سانس مہکتی ہے۔یہ میں نہیں چھوڑوں گی۔پلیز سر مجھے گھر لے جایئے۔"(۲)

مشرقی عورت جتنی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے کتنی بھی جدید کیوں نہ ہو جائے۔زندگی کا محور و مرکز شوہر کی محبت اور گھر ہوتا ہے۔احسن شاہینہ کو ملکہ بننے کے خواب دکھاتا ہے مگر شاہینہ اس کے ساتھ جاننے سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ اس کی نظر میں دولت جائیداد و عیاشی بہت چھوٹے لوگوں کے خواب ہیں۔پر سکون، مضبوط اور توانا شخصیت کی حامل لڑکی اندر سے صدیوں پرانے نظام کے حاکم مرد کی دی ہوئی سزا نہیں کاٹنا چاہتی۔یہ کردار مثبت قدروں کے فروغ کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ زندگی کی کامیابی کا دار و مدار اس کے ازدواجی رشتے کے قیام اور دوام پر ہے۔خواہ وہ معاشی طور پر کتنی ہی خود مختار عورت یا خاتون یا خاتوں خانہ ہو۔بقول احمد طارق کے۔

''ہندوستانی تہذیب کی پروردہ ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ایک گھر ہو، محبت کرنے والا شوہر ہو، بچے ہوں اور وہ اپنے بھرے پرے گھر کی بلا شرکت غیر مالک ہو۔''(۳)

مردوں کی طرح عورتیں بھی بہت ذہین، بہتر اور اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک، اور علوم وفنون کی ماہر ہوتی ہیں۔ مختلف شعبوں میں شاندار ترقی کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں جان سٹورٹ کا کہنا ہے کہ :

''تجربہ اور عام سمجھ بوجھ برابر ہو تو عورت مرد سے زیادہ ہوہ حالات سمجھتی ہے جو اس کے سامنے ہوں۔''(۴)

عورت کے دائرہ عمل کو پاکستانی معاشرے میں گھر کی چار دیواری تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ عورت کے گھر سے باہر کام کرنے کے بارے میں معاشرتی قبولیت کا رویہ شرح تعلیم میں اضافے اور عورتوں کی تعلیم کی افادیت کے تشہیری اقدامات کے باوجود عام نظر نہیں آتا۔ زیادہ تر خواتین کسی مجبوری کے باعث گھر سے ملازمت یا مشقت کے ذریعے کمانے کے لیے نکلتی ہے۔ متوسط گھرانے کی خواتین اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کے اظہار، قابلیت کے اعتراف اور معاشی خود مختاری کے حصول کے لیے مختلف پیشوں سے وابستگی اختیار کرتی ہیں۔ اس صورت حال کے بارے میں ارشاد احمد پنجابی لکھتے ہیں کہ :

''اب ہر طرف تعلیم حاصل کرنا، نوکری کا رجحان روز افزوں ہے۔ اکثر مہنگائی سے تنگ آکر ضرورت کے تحت اور کبھی شوقیہ بھی نوکری کی جاتی ہے۔ متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین ملازمت کی طرف راغب دکھائی دیتی ہیں۔ ہاں مگر گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے والی عورتیں ملازمت پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں اور گھر داری کا کام عمدہ ڈھنگ سے نبھاتی ہیں۔''(۵)

کام کرنے والی خواتین کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گھر اور ملازمت سے وابستہ کاموں کے علاوہ گھر سے باہر مردوں کا منفی رویہ خواتین کے مصائب ومشکلات میں اضافہ کا موجب بنتا ہے۔ عورت کو خود سے آگے بڑھنے کا تصور مرد کے ذہن میں نہیں ہے۔ وہ اسے ہتک خیال کرتے ہیں۔ ڈرامہ نگار مصنفین نے کام کرنے والی خواتین کے بیشتر مسائل ڈراموں میں اس کے پیشہ ورانہ کرداروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ڈرامہ میری سادگی دیکھ اسی سلسلے کا ایک طویل دورانیے کا ڈرامہ ہے۔ جس میں آفس میں کام کرنے والی لڑکی ثمرن کی ذہنی کیفیات اور جذباتی مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہانی کچھ اس طرح ہے کہ منصور نامی ایک ایماندار اور ذہین شخص ایک کمپنی کا جنرل منیجر ہوتا ہے۔ وہ انتہائی محنتی اور دل لگی سے کام کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ جب کہ اسی آفس میں اس کا ماتحت کامران نہایت ہی چلاک اور تیز کردار ہے۔ بظاہر وہ منصور صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوتا ہے مگر دراصل وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور کسی منصوبے کے تحت منصور کو اس کے عہدے سے ہٹا کر خود کرسی پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ ثمرن نامی لڑکی جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے اور اسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ کامران اس کو منصور کی بربادی کے لیے بھیجتا ہے۔ چونکہ ثمرن کامران کو پسند کرتی ہے اس لیے وہ اس کام کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔ ثمرن ایک ذہین اور خوبصورت لڑکی ہوتی ہے۔ وہ منصور صاحب کے ساتھ چونکہ ذاتی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہے اس لیے ہر وقت اس کے قریب رہتی ہے منصور صاحب اس کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اس پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور ہر کام میں اس سے مشورہ لیتے ہیں۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور منصور صاحب کی دلچسپی اور محبت ثمرن میں مزید بڑھتی جاتی ہے۔ یہی حال ثمرن کا بھی ہوا جاتا ہے اور وہ کامران جیسے خود غرض اور لالچی شخص کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے منصور صاحب کی ہو جاتی ہے۔ کمپنی کا عہدہ کامران چالاکیوں سے چھین کر خود کمپنی کا جنرل منیجر بن جاتا ہے مگر ثمرن کو کھو دیتا ہے۔ ایک نئی صبح کامران کے دفتر میں ایک دوسری نئی لڑکی آتی ہے کامران اس سے آنکھیں چار کرتا ہے اور ڈرامہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

ڈرامہ میری سادگی دیکھ میں ثمرن کے کردار میں عورت کے ذاتی خوبیوں اور خامیوں کے آئینے میں ماحول اور معاشرے کا عکس دکھانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ فاخرہ تحریم کا کہنا ہے کہ:

> ''عورت کسی گھر میں ملازمت کر رہی ہو، کھیتوں میں کام کرنے کے لیے نکلے، دفتر میں کسی کی سیکرٹری ہو، فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہو، ہسپتال میں نرس ہو یا ڈاکٹر، ائیر ہوسٹس ہو، کہیں بھی اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔ کبھی اسے الفاظ کے ذریعے، کبھی اشاروں سے اور کبھی چھو کر اسے ایک الگ مخلوق ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ جو خواتین مردوں کے ساتھ دیر تک کام کرتی ہیں وہاں خواتین کو مختلف طریقوں سے ورغلانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان سے کئی خواتین جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنتی ہیں۔''(۶)

عورت سے تعلق رکھنے والے رومانوی تصورات کے برعکس عورت ہمیشہ محبوبہ نہیں بھی ہوتی ہے۔ عورت مرد سے محبت کرنے میں برابر کی شریک بھی ہوتی ہے۔ کامران اور ثمرن شروع میں ایک دوسرے کے بہت گرویدہ ہوتے ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثمرن جیسی حقیقت پسند ملنسار اور ذہین لڑکی پر کامران جیسے لالچی شخص کی اصلیت

اور مکر و فریب کا دروازہ کھلتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور دور اندیشی سے کامران کے ارادے بھانپ لیتی ہے۔ اس پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ کامران جیسا دھوکے باز شخص اس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے اس کے دل میں کسی عورت کی عزت احترام جیسا کوئی جذبہ موجود نہیں بلکہ وہ عورت کو ایک نمائشی شے اور دل بہلانے کے لیے کھلونا سمجھتا ہے۔ ثمرن جب اس سے شادی، بچوں اور گھر بسانے کے حوالے سے بات کرتی ہے تو کامران کو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگتی اور وہ اسے اس کا ایک احمقانہ خیال تصور کرتا ہے۔ اس کا مقصد صرف اور صرف دولت کا حصول اور عیاشی کی زندگی بسر کرنا ہے۔ ثمرن دور جدید سے تعلق رکھنے والی لڑکی ضرور ہے مگر اس کے ساتھ وہ ایک شریف باحیا مشرقی لڑکی بھی ہے جو جاب تو کرتی ہے اور مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتی مگر اس کے خیالات نہایت معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ وہ ایک ایسے ایماندار اور شریف شخص سے نکاح کی خواہش مند ہوتی ہے جو اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے والا ہو اور اس کو عزت و احترام دینے والا ہو۔ وہ اس کو بہت تحفظ بھی دیتا ہو اور ساتھ محبت بھی عطا کرتا ہو۔

وقت اسے منصور جیسے شخص سے متعارف کرواتا ہے۔ ایک ہی آفس میں کام کرنے کی وجہ سے منصور اور ثمرن کو ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ وقت ملتا ہے۔ ثمرن کامران کے کہنے پر منصور کو برباد کرنے آئی تھی مگر اپنی تربیت کی بنا پر وہ منصور جیسے باکردار شخص کے بہت قریب آجاتی ہے۔ ثمرن اور منصور کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ محبت کسی لالچ یا غرض کا غماز نہ تھی بلکہ وہ ایک دوسرے کے لیے واقعی مخلص تھے اور دل و جان سے ایک دوسرے کو اپنانا چاہتے تھے۔ وہ کامران جیسے شخص کے فریب کی بھینٹ چڑھ جانے سے بچ جاتی ہے۔ اس ڈرامہ میں ہمارے معاشرے کے ہر اس کردار کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں خواتین مختلف مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور مردوں کی گندی نظروں، اشاروں اور باتوں کے علاوہ ان عورتوں اور لڑکیوں کو نفسیاتی اور ذہنی چابلوسیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ہر قدم کو نہایت احتیاط سے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا ناسور بن چکا ہے۔

عورت کی مکمل ہستی اور زندہ وجود کی عدم موجودگی کے حوالے سے ادب میں عورت کے سماجی مسائل کے حوالے سے بنیادی اعتراض اُٹھایا جاتا ہے۔ عورت کو نرم خو، اور نازک اندام حسینہ یا پھر ایثار اور قربانی کا سنگی مجسمہ بنا کر ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے۔ وفا، صبر، عزت، غیرت، مامتا، رشتے، تقدس، اور ایثار کے دھاگوں میں الجھا کر عورت کو بے رحمی اور بے جان پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچانے کا شوق سماج اور ادیب دونوں کو ہی رہا ہے۔ دیکھا جائے تو ایک

عورت مرد کی طرح ہی زندگی کے مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔اس کا تدبر،اس کی ذہانت اس کا حوصلہ اور اخلاقی جرأت اس کے کردار کا حصّہ ہے۔انسانی حیثیت کی بحالی اسی کے ذکر سے ممکن ہے۔خالدہ حسین لکھتی ہے کہ :

''دراصل ہماری شکایت یہی ہے کہ ادب میں عورت کا غلط اور غیر حقیقی اور نامکمل کردار پیش کیا گیا ہے۔اس کے ذہن،احساس اور روح کی طرف کسی ادیب کی نظر نہیں گئی۔''(۷)

اس صورت حال کی ذمہ دار نسیم انجم بھٹی کے خیال میں معاشرے اور ادب میں مرد کی کارفرمانہ مردانہ سوچ ہے۔ڈراموں میں عورتوں کی معاشرتی حالت کی ہو بہو تصویر نظر آتی ہے۔وہ لکھتی ہے۔

''جو مراعات مرد کے لیے ہیں ،وہ عورت کے لیے نہیں ہیں ۔بس جب عورت human نہیں رہی تو اس کا کردار بھی کم انسانی ہوا۔''(۸)

عورت کارگہ حیات میں آج مساوی حصّہ کی اہل ہے اور اپنے کردار کے حوالے سے ادب میں اپنی آزاد ہستی کے ساتھ زندگی بسر کرتی نظر آتی ہے۔

(ب) مسئلہ شکل وشباہت:

مرزا اطہر بیگ کا لکھا ہوا ڈرامہ کیٹ واک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی محنتی،بلا کی ذہین،اعلیٰ تعلیم یافتہ سلیقہ مند،خوش اخلاق تخلیق نگار مگر ظاہری لحاظ سے بدصورت شکل والی ملازمت پیشہ لڑکی کی کرب ناک کہانی ہے۔ڈرامے کا مرکزی کردار یہی بدصورت لڑکی سارا ہے جس کے والدین خود تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں انتہائی محنت کے ساتھ انھوں نے سارا کی تعلیم و تربیت کی۔یہ ایک انتہائی سنجیدہ اور سلجھا ہوا گھرانہ ہے۔سارا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔اس کی پھوپھی بھی ایک ادھیڑ عمر تعلیم یافتہ، غیر شادی شدہ،بدصورت اور نفسیاتی مرض میں مبتلا عورت ہے جو ان کے ساتھ گھر میں ہر وقت ایک کمرے میں بند رہتی ہے۔سارا ایک اچھی جگہ پر ملازمت کرتی ہے۔اس کا باس اسے اس کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے بہت پسند کرتا ہے اور اس کو بہت آگے لے کر جانا چاہتا ہے۔مگر اس کی دوست جو اس کے باس فرحان کی منگیتر بھی ہے اس سے بہت حسد کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ یہ بدصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مکار لڑکی ہے جو فرحان کو اپنی جال میں پھنسا کر اس کو چھین لینا چاہتی ہے۔

سارا کے والدین اپنی بیٹی کے شادی کے لیے پریشان ہوتے ہیں اور اس کے لیے کسی اچھے بڑے اور پڑھے لکھے خاندان میں رشتہ کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ رشتہ کرانے والی خواتین کو بھی پیسے دیتے ہیں کہ وہ

کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ کر لائے مگر قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ یہی مسئلہ اس کی پھوپھی کو نفسیاتی مریضہ بنا کر ایک کمرے میں ہمیشہ کے لیے بند کر گیا تھا۔ اور اسی غم کے ساتھ وہ کنواری دنیا سے چلی جاتی ہے۔

لوگ جب بھی سارا کی قابلیت اور کمائی کا سنتے ہیں تو فوراً اُن کے گھر سارا کو دیکھنے آتے ہیں مگر بُرا بھلا کہہ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس سارا کی بدصورتی کے ساتھ اس کی دوسری بڑی خامی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے والدین امیر کبیر نہیں ہیں اور وہ لوگ ایک بہت ہی پرانے محلے میں رہتے ہیں۔ ہر وقت لوگوں کا سارا کو دیکھنے آنا اور ان کے سامنے مذاق بن جانا سارا کو بہت بُرا لگتا ہے۔ اب وہ اپنی والدہ کے سامنے ڈٹ جاتی ہے کہ اب وہ لوگوں کے سامنے مزید کیٹ واک کر کے تماشہ نہیں بنے گی بلکہ اپنی زندگی اپنی مرضی اور خوشی سے گزارے گی۔

اس ڈرامے میں ملازمت پیشہ عورت سے وابستہ مختلف مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ عورت اگر خوبصورت ہے اور ملازمت پیشہ بھی ہے تو اس کا رشتہ ہونے میں اتنے مسائل نہیں ہوتے اور جلد ہی اس کی شادی ہو جاتی ہے اس طرح متوسط گھرانوں والی، کم تعلیم یافتہ مگر خوش شکل لڑکیوں کے رشتے بھی بھاری جہیز کے ساتھ جلدی ہو جاتے ہیں۔ مگر انتہائی ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکیاں معمولی شکل کے ساتھ ہمیشہ کنواری رہتی ہیں۔ سارا ایک خود اعتماد لڑکی ہوتی ہے اس کا علمی شعور اسے اس کی پھوپھی کی طرح نفسیاتی مریض نہیں بننے دیتا بلکہ وہ حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں پیار اور من چاہے مرد کی جگہ ضرور ہے مگر وہ سوچتی ہے کہ زندگی صرف اس پر ختم نہیں ہوتی۔ وہ اپنا راستہ خود چنتی ہے اور اپنے والدین سے کہتی ہے کہ وہ پھوپھی جان کی طرح پاگلوں کی طرح مایوسی کی زندگی نہیں گزارے گی۔ بلکہ اس کا روشن مستقبل اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ خود اپنی منزل تک پہنچنے کا ارادہ کرتی ہے۔

جدید اُردو ڈراموں نے فرد کے باطن کو قابل توجہ بنایا ہے اب ہر ڈرامہ نگار سماجی حقائق اور سیاسی، معاشی اور تہذیبی آویزش کے نتیجے میں متاثر ہونے والے فرد کی خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ باطنی مسائل کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ صنعتی ترقی کے اور سائنسی ایجادات کی صورت میں انسان نے تنہائی، بے چینی، تشکیک کے نت نئے رنگ و روپ سمیٹے ہیں۔ خارج اور باطن کی سطح پر آج کا انسان ایک گنجلک اور پیچیدہ زندگی سے نبرد آزما ہے۔ انسان اور اس کے خیالات و احساسات کی بھرپور عکاسی ان ڈراموں میں کی گئی ہے۔ انسان کی تفہیم کی اس کوشش نے کبھی نفسیاتی الجھنوں، مادی ضرورتوں اور کبھی باطن کی پیچیدہ کیفیات کو ہمارے سامنے لانے کے لیے تگ و دو کیا ہے۔

(ج) وراثت کا مسئلہ:

مختیار احمد کی لکھی ہوئی تحریر طویل دورانیے کا کھیل حقدار میں عورتوں سے وابستہ مسائل جن میں خاص طور پر میل سنٹر پرابلم، ملازمت اور وراثت میں حصہ شامل ہیں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

ڈرامے کے کرداروں میں ایک بوڑھی عورت اماں اور اس کے تین بیٹے نثار، گلزار اور نیاز اور ان کی بیویاں ہیں۔ اس کے علاوہ تنویر (پوتا) طوبیٰ (پوتی) رحمو (نوکر) اور مرکزی کردار روزینہ (اماں یعنی بڑی بیگم صاحبہ کی خاص خدمت گار) شامل ہیں۔

بڑی اماں کے تین بیٹے نثار، گلزار اور نیاز اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ان کے والد فوت ہو چکے ہوتے ہیں جب کہ والدہ نیم نفسیاتی مریضہ بن کر زندگی کے آخری ایام گزارتی نظر آتی ہے۔اماں ایک بہت بڑی جائیداد کی مالک خاتون ہوتی ہے۔اس کی بہوئیں نہایت برے اخلاق وعادات رکھنے والی خواتین ہوتی ہیں جو اپنی ساس کو منہ نہیں لگاتی۔اور اس کی خدمت کیا،اس کے پاس کمرے میں اس وجہ سے جانا پسند نہیں کرتیں کہ اماں کی بیماری کے جراثیم لگ جائیں گے اور اس طرح وہ بھی بیمار پڑ جائیں گی۔یہاں تک کے اپنے شوہروں اور بچوں کو بھی اماں کے پاس جانے سے سختی سے منع کرتی ہیں۔

اماں کا بڑا بیٹا نثار بیوی کے ساتھ مل کر اس کی خدمت کے لیے ایک روزینہ نامی عورت کا بندوبست کرتا ہے تاکہ ان کی جان اماں سے چھوٹ جائے اور نوکرانی ہی اماں کی خدمت کرے۔روزینہ نامی لڑکی ملازمہ،ایک میٹرک پاس اچھی شکل و صورت رکھنے والی ایک ذہین خاتون ہوتی ہے۔وہ اماں کی دل سے خدمت کرتی ہے۔اماں کے گھر والے اسے تیسرے بیٹے جو لندن میں رہتا ہے کے پاس علاج کے بہانے سے بھیج دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کو چھٹکارا مل جائے۔مگر اماں اپنا ملک نہ چھوڑنے پر بضد ہے۔ایک دن بڑی اماں وکیل کو بلا کر جائیداد کا بٹوارہ کرتی ہے جس میں جائیداد کا 1/8 فیصد حصہ رحمو نوکر اور روزینہ نوکرانی کے نام کیا جاتا ہے۔باقی 7/8 فیصد جائیداد اماں ریاست کے لیے وقف کرتی ہے۔اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی حصہ مقرر نہیں کرتی۔جب اماں اپنے بچوں سے ان کے باپ کی تمام جائیداد حرام کی کمائی کا ذکر کرتی ہے تو رحمو اور روزینہ یہ کہہ کر اپنا حصہ واپس کر دیتے ہیں کہ اس کی اس حرام کی کمائی پر کوئی حق نہیں ہے۔

گھریلو ملازماؤں،ماماؤں اور گورنسوں کے کردار اُردو کے ڈراموں میں مختلف انداز اور زاویوں سے اظہار پاتے ہیں۔یہ کردار خاندانی نوکروں کی روایتی وفاداری کے حامل ہیں۔ایسے ہی مخلص اور وفادار کرداروں میں ایک کردار ڈرامہ حقدار کی روزینہ خدمت گار ہے۔وہ بڑی اماں کی آنکھوں میں دیکھتی تھی اگر وہ بہو کو نہ پسند کرتی تو وہ بھی اسے اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی اور جو چیزیں یا لوگ اماں کو پسند تھے اس کے لیے روزینہ کی جان بھی حاضر تھی۔اس ڈرامے میں مختیار احمد امیر اور غریب طبقے کے مسائل کو پیش کرتے ہیں ایک طرف روزینہ کا گھر ہے جس میں وہ اپنی بیوہ خالہ کے ساتھ شوہر سے طلاق لے کر کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتی ہے۔جبکہ دوسری طرف بڑی اماں کا عالیشان گھر ہے جس میں وہ اور اس کی اولاد نہایت عیش و آرام سے رہتے ہیں۔مگر دونوں گھرانوں کی عورتوں کے مسائل ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

روزینہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنی خالہ کا پیٹ پالتی ہے۔ نوکری کی غرض سے جب اماں کی بہو اور بیٹا اس سے انٹرویو لیتے ہیں تو اسے نہایت حقیر جان کر سوال وجواب کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ روزینہ کی خواہش اور پسند نہ پسند کو بالائے طاق رکھ کر اس کو نوکری کے لیے بلایا جاتا ہے۔ روزینہ نثار اور اس کی بیوی سے مل کر ان کو بہت ناپسند کرتی ہے مگر مجبوری کی وجہ سے ان کے گھر نوکری کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔ شروع میں بڑی اماں کا رویہ بھی روزینہ کے ساتھ بہت سخت ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ اماں روزینہ کے کام، ذہانت، وفاداری اور رویے سے بہت متاثر ہوتی ہے اور اس کی صحبت میں رہ کر بہت حد تک خود کو بہتر سمجھتی ہے۔ اماں کے سب گھر والے روزینہ کو بہت ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ اماں کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہے اور سب کی سوچ وفکر کے مطابق بروقت جواب دیتی ہے۔ اس کا دوسرا بڑا قصور ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہونا ہوتا ہے اور ہمارے سماج میں ایک لڑکی یا عورت چاہے کتنی بھی محنتی اور اخلاقی کیوں نہ ہو اگر وہ محنت مزدوری کرتی ہے تو اس کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

روزینہ کے ساتھ دوسرا مسئلہ اس کی خالہ کا روزینہ کا کسی شادی شدہ بوڑھے ویگن ڈرائیور سے اس کی غیر موجودگی میں پیسوں کے عوض اس کا رشتہ طے کرنا تھا۔ اس کی خالہ ایک مکار اور لالچی عورت ہوتی ہے جو روزینہ کو پیسے کمانے اور لانے کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس کا رویہ بھی روزینہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اس کو طنزیہ فقروں کے ساتھ نت نئے زخم دیتی ہے مگر وہ حالات اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے خاموش رہتی ہے اور جو بھی کما کر لاتی ہے ، خالہ کے ہاتھوں میں رکھ دیتی ہے۔ ایک دن جب اس کی خالہ کا پسند کیا ہوا منگیتر روزینہ سے شادی کی بات کرتا ہے تو وہ بے چاری آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ اور ویگن ڈرائیور اور خالہ دونوں سے خوب جھگڑتی ہے۔ اور بعد میں اپنی بے بسی پر خوب روتی ہے مگر اس کا غم گسار اور درمان کوئی نہیں ہوتا۔ مرد مرکز نظام میں عورت کی کوئی پسند ناپسند نہیں ہوتی۔ اس کی تقدیر کا مالک مرد ہی گردانا جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں ڈرامہ نگار کی عورت و مرد کی نفسیات پر بڑی گہری نگاہ ہے۔ اس ڈرامے کے کردار کے لیے مصنف کوئی شعوری کاوش نہیں کرتے بلکہ کرداروں کے مکالمے ان کی نفسی کیفیات کے پوشیدہ پہلو اس طرح کھولتا ہے کہ انسانی فطرت کے مختلف گوشے خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہم اپنی دیکھی بھالی دنیا کے مانوس اور جانے پہچانے کردار سے پہچان اور اعتبار کا گہرا رشتے قائم کر لیتے ہیں۔

اس ڈرامے میں ایک مسئلہ وراثت کا بھی ہے۔ اماں جس کے نام ایک بہت بڑی جائیداد ہے اور وہ اس جائیداد کی اکلوتی وارث ہوتی ہے، کو اپنے لیے دوزخ جانے کا ایک وسیلہ سمجھتی ہے۔ اس ڈرامے میں مختیار احمد نے قیام پاکستان کے بعد ایک ایسے گھرانے کا المیہ پیش کیا ہے جس نے فسادات میں گرے ہوئے حالات کا فائدہ اٹھا کر کئی حرام طریقوں سے مال و دولت لوٹی اور آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کی مگر کسی کو پتہ تک نہیں چلا کہ یہ حرام کی دولت کہاں سے آئی۔

بڑی اماں کے شوہر نے تمام جائیداد کا مالک و وارث اپنی بیوی کو بنایا تھا تاکہ اگر احتساب بھی ہو جائے تو اس کے نام کوئی جائیداد نہ ہو اور وہ بری الذمہ ہو۔ اماں کی سادگی اور لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر اس طرح اس کا شوہر جائیداد بناتا رہا اور اماں کے نام کرتا رہا۔ اس کی دیکھا دیکھی حرام کی کمائی سے پلے بڑھے بیٹے بھی ہمیشہ باپ کے نقش قدم پر چلتے رہے اور حرام کی کما کر خود اور اپنی اولاد کو کھلاتے رہے جس پر اماں انھیں بہت ٹوکتی منع کرتی مگر ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مرد کی نسبت عورت میں ایمانداری، سچائی جیسے اوصاف زیادہ ہوتے ہیں۔ اماں اپنی اولاد کی حرکتیں دیکھتی ان کی کمائی کے ذرائع دیکھتی تو اپنے شوہر اور خود کو قصوروار ٹھہراتی اور ہر وقت روتی رہتی۔ اس صورت حال کی وجہ سے اماں نیم نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی اور آخر میں اسی میں اپنا اور اپنے بچوں کا بھلا سمجھتی ہے کہ ساری جائیداد اس کے اصل حقدار کو دے دینی چاہیے جو اس کے ملک کا غریب طبقہ ہے جو اصل میں محنتی اور پر خلوص پاکستانی ہیں جو اس کی ریاست اور ملک کا حق ہے۔

(د) ملازمت سے منسلک مسائل:

ڈرامہ کچا گھڑا ایک ایسی ملازمت پیشہ عورت کی کہانی ہے جو بخوشی بیک وقت دوہری ذمہ داریاں سنبھالتی ہے۔ ایک طرف اس کا گھر بچی اور شوہر سے وابستہ کام ہیں اور دوسری طرف وہ ایک ایماندار اور ذمہ دار فرد کی طرح آفس میں کام کرتی ہے مگر اس کے لیے یہ ذمہ داریاں کوئی بوجھ نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس میں اپنا سکون اور خوشیاں تلاش کرتی ہے۔ اپنے گوناگوں مسائل اور سماجی دباؤ کے نتیجے میں ملازمت پیشہ خواتین بہت سے معاملات میں نارمل نفسیاتی رویوں کا اظہار نہیں کر پاتیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار لبنیٰ بھی کچھ ایسے ہی مسئلے مسائل کا شکار رہتی تھی مگر بہت حد اس نے ہر کام کے لیے وقت مختص کیا تھا اور وہ سختی سے اس کی پابندی کرتی تاکہ زندگی پُر سکون رہے۔

ڈرامے کے اہم کرداروں میں صارم (آرکیٹیکچر) اس کی بیوی لبنیٰ اور بیٹیا شامل ہیں جبکہ ڈرامے کے ضمنی کردار نوری (غائب فرد) اس کی بیٹی زہرا اور ایک دور کی رشتہ دار خالہ ہیں۔

ظفر معراج کی لکھی ہوئی تحریر کچا گھڑا جیسا کے نام سے ظاہر ہے ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے جو کچے گھڑے سے مشابہت رکھتا ہے اور کسی ضرب سے کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے اور یہ گھڑا ہر عورت کی ازدواجی زندگی کی کہانی پیش کرتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ تمام رشتوں میں مضبوط ترین رشتہ بھی ہے مگر اس کے برعکس یہ کسی کچے دھاگے سے بھی کمزور ہو سکتا ہے۔ لبنیٰ نامی عورت جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، سلجھی ہوئی، روشن خیال نوکری پیشہ شہری خاتون ہے۔ اس کا شوہر جو ایک دیہات سے تعلق رکھتا تھا مگر شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہر ہیکا ہو کر رہ جاتا ہے اور لبنیٰ جیسی عورت کو زندگی بنا کر اپنی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے۔ لبنیٰ اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے اس کی ایک بیٹی بھی ہے جو اسکول جاتی ہے۔ لبنیٰ بہت محنتی عورت اور پیار کرنے والی بیوی ہوتی ہے۔ ایک دن

اس کے شوہر کی دور کی خالہ جو بہت بیمار ہوتی ہے اپنی پوتی کے ساتھ شہر علاج کے لے آتے ہیں۔ صارم کی بیوی لبنیٰ شوہر کی مصروفیت کی وجہ سے خود جا کر اس کو سٹیشن سے گھر لے آتی ہے۔ اور اس کی بہت خاطر تواضع کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر صارم کی خالہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہے۔ اور اس کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہے۔ صارم کو نوری، جو اب فوت ہو چکی تھی اور اس کی بیٹی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ صارم کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی بیوی سے دوسری شادی کا کہتا ہے۔ جس پر لبنیٰ اس سے بہت ناراض ہوتی ہے اور گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مگر جب صارم کو زہرا کی منگنی کا پتہ چلتا ہے تو واپس اپنی بیوی کے پاس جا کر اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہے مگر وہ اسے معاف نہیں کرتی مگر بیٹی کے اصرار پر صارم بیوی کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں جن پابندیوں کے زیر اثر عورت زندگی گزارتی ہے وہ اس سے بنیادی انسانی حقوق اور جذباتی اظہار و خیال کے وسیلے بھی بہت حد تک چھین لیتے ہیں۔ عورت جب گھر سے باہر ملازمت کے لیے جاتی ہے تو دوہرے عتاب اور دوہری ذمہ داریوں میں پھنس جاتی ہے۔ بے اختیاری کا ملال اور کچھ نہ کر سکنے کا احساس بہت سے نفسیاتی رویوں کو جنم دیتا ہے۔ ان کا گہرا احساس ڈرامہ نگار مصنفین کے ہاں نظر آتا ہے۔ معاشرتی پابندیاں، محدود امکانات اور محبوس زندگی جیسے عوامل عورتوں کی نفسیات پر جو اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایک خط میں فیض احمد فیض نے ان کے متعلق معنی خیز نکتہ پیش کیا ہے۔ قیدی اور عورت کی نفسیات کی جو مماثلت اس اقتباس میں نظر آتی ہے۔ اس سے مشرقی عورت کی زندگی کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

> ''قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے۔ یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی، گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائیدینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلق، کینہ پروری، بد مزاجی، کبھی خود سری، کبھی خاک بوسی، کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔''(۸)

ڈرامہ کچا گھڑا میں عورت کے یہ سارے روپ اپنے سماجی و اقتصادی پس منظر میں ابھرتے نظر آتے ہیں۔ اور عورت کے مسائل اور زبوں حالی کو لبنیٰ کے کردار میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بیوی ہونے کے ناطے اس نے اپنے گھر اور شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھا، صبح سویرے اٹھنا، پھر مشین کی طرح کام کرنا، سب کا خیال رکھنا اس کا روزانہ کا شیڈول تھا۔ اپنے شوہر کے لیے کوئی بھی کام نہ چھوڑنا اس کی ہر چیز کا خیال اور پسند ناپسند تک خیال رکھنا لبنیٰ اپنا فرض اولین

سمجھتی تھی، لبنیٰ بیوی سے زیادہ صارم کی دوست بھی تھی۔ مگر جب صارم کو اپنی بیٹی کی عمر جتنی لڑکی سے شادی کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ تو لبنیٰ کا دل کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ اور شوہر پر سے اس کا اعتماد ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

لبنیٰ بے چاری کی بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ شوہر کو ہر وقت اس بات پر ٹوکتی کہ وہ وقت کا ضیاع نہ کرے۔ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور نبھانے کی کوشش کرے۔ اور بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے جس کی ایک وجہ اس کی آفس میں ملازمت تھی، کی وجہ سے زیادہ وقت شوہر کو نہیں دے پا رہی تھی۔ صارم اس کی روزانہ کی مصروفیت سے اس سے آہستہ آہستہ بیزار ہو رہا تھا جس کا نتیجہ اس کی دوسری شادی کا فیصلہ کرنا تھا۔

متوسط طبقے کی ملازمت پیشہ عورت کے کردار میں مصنف نے لبنیٰ کے ذریعے ذات نسائی کے وہ مسائل اور پہلو ہمارے سامنے پیش کیے ہیں جو اکثر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس ڈرامے میں عورت کی آگہی اور شعور کے متنوع عکس ملتے ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ سیدہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

> ''تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں جہاں معاش، ضرورت اور وسیلوں کے درمیان زندگی مستقل کشاکش میں گری کھڑی ہے۔ عورت کیا ہے؟ کہاں ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ اسے کیا کرنا پڑتا ہے؟ وہ اپنے تجربوں کو کس طرح محسوس کرتی ہے؟ وہ خود کو زندگی سے کس طرح نبرد آزما دیکھتی ہے؟ وہ زندگی کی پیکار میں کس طرح شرکت کا کیا مفہوم جانتی ہے؟ امن اور جنگ دونوں حالتوں میں معاشرے میں اور خاص طور پر ان معاشروں میں جو معاشی طور پر ناآسودہ ہیں اور جہاں زندگی کا قافیہ تنگ رہتا ہے وہاں عورت کا ردعمل کیا ہے؟ وہ کس کس انداز سے زندگی کو برتتی ہے اور اس کا حوصلہ کس صورت سے رشتہ جاں کو استوار رکھتا ہے؟ وہ محبت سے کیوں کر تقویت پاتی ہے؟ بے عزتی اس کے احساس کو کس طرح پامال کرتی ہے اور غم برداشت کر لینے میں اس کی ہمت کتنی ہے؟ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کس طرح اس کے دل کو سیراب کر دیتی ہیں؟ اس کے خواب کیا ہیں؟ وہ اپنے گردوپیش سے کیا تعلق رکھتی ہے یہ اور اسی جیسے ہزاروں سوال ہیں جو اپنا جواب کہانی کے روپ میں پاتے ہیں۔''(۹)

عورت مرد کے ساتھ مل کر معاشی بوجھ اٹھاتے ہوئے قدم قدم پر رکاوٹوں، منفی سوچوں اور رویوں کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کا وجود ایک کھلونے سے بڑھ کر مرد کے لیے حیثیت نہیں رکھتا اور ہر لمحہ اس کی خواہشوں اور خوشیوں کا گھلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

عورت اپنی ذات کا اظہار اور فیصلے کی آزادی چاہتی ہے۔ کبھی وہ زندگی کو قبول کر کے اور ہر غم سہہ کر اس کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے اور روایتوں، رسموں سے متصادم قدم اٹھا کر اپنی سوچ اور ذہنیت کے مطابق ڈرامہ پنجرے کے پرندے کی مرکزی کردار مہرالنساء کی طرح اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی کے لیے کچھ کرنے کی خواہاں نظر آتی ہے۔ طویل دورانیے کے اس کھیل میں نورالھدیٰ شاہ نے نسوانی کرداروں کو عورت کی حسیات اور شعور سے بھرپور زبان دی ہے۔

(و) جاگیردرانہ نظام کے مسائل:

مہرالنساء ایک تعلیم یافتہ جوان لڑکی، ایک بہت بڑے جاگیر دار کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے جس کو اس کا باپ اپنے یتیم بھتیجے جس کی عمر تقریباً سات سال ہوتی ہے، جائیداد کے بٹوارے سے بچنے کی خاطر شادی کر دیتا ہے۔ اس کی بیٹی مہرالنساء اپنے والدین کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر نصیر خان کا ہر لحاظ سے خیال رکھتی ہے۔ اور اس کو پڑھا لکھا کر انجینئر بنا لیتی ہے۔ نصیر خان مہرالنساء کی بہت عزت کرتا ہے اور اپنی ہر بات اور مسئلہ اسے بتاتا ہے۔ نصیر خان جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو شہر میں ایک عنبرین نامی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کو اس کی تصویر دکھاتا ہے۔ جس پر وہ اس کو شادی کا مشورہ دیتی ہے مگر نصیر خان اسے چچا چچی کی ناراضگی کا بتاتا ہے جس پر مہر واسے اس کا ساتھ دینے کو کہتی ہے اور اس سے ہر قسم کا تعاون کرنے کا کہتی ہے۔ نصیر خان اپنی بیوی سے بہت خوش ہوتا ہے ۔ صبح دونوں مہرالنساء کے والدین کے ساتھ بیٹھ کر شہر کی لڑکی کا ذکر کرتے ہیں تو چچا بہت غصّہ ہوتا ہے نصیر خان، مہر واور اس کے والدین کے مابین ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

> ''مہرالنساء کے والد: (سخت غصّے کی حالت میں نصیر خان کی طرف دیکھ کر) میری لاش پر سے گزر کر تم دوسری شادی کرو گے۔ اپنی ساری دولت اس شہر والی چھوکری پر لٹانا چاہتے ہو۔ نہیں۔۔۔۔۔ نصیر خان۔۔ نہیں۔ (مزید غصّہ ہو کر) میں کسی بھی قیمت پر یہ نہیں ہونے دونگا۔ مہرو ہے تمہاری بیوی۔ اس کے علاوہ تمہاری زندگی میں کوئی نہیں آئے گا۔ بس۔۔۔۔ کیا اس دن کے لیے اپنی بیٹی دی تھی تمہیں کہ اس پر کوئی دوسری عورت لے آؤ۔۔۔ وہ بھی باہر کی۔ غور سے سن لو نصیر خان، ہم خالص نسل کے لوگ ہیں۔ اپنے خون میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے۔ باہر کی عورت نہیں آئے گی۔
>
> مہرالنساء: نصیر خان کو شادی کی اجازت میں نے دی ہے بابا سائیں۔ نصیر خان کی شادی وہیں ہو گی جہاں اس کا دل چاہے گا۔
>
> مہرالنساء کی والدہ: تو ہوش میں تو ہے مہرالنساء۔

مہرالنساء:(ماں کی طرف دیکھ کر)ہاں اماں میں ہوش میں ہی ہوں۔ہوش میں تو میں تب نہیں تھی جب آپ نے ہم دونوں کو دولت اور نسل پر قربان کر دیا تھا۔

مہرو کے والد:(طیش میں آکر)مہرالنساء یہ تو بول رہی ہے میرے سامنے۔

مہرالنساء: یہ میں بول رہی ہوں بابا سائیں(ذرا تحمل سے)جب تک نصیر کمزور تھا میں خاموش تھی۔مگر آج نصیر جوان ہے مضبوط ہے ۔آج میں بول سکتی ہوں بابا سائیں۔خالص نسل والے لوگوں کے بچے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔بابا سائیں۔۔۔گھوڑے نہیں ہوتے۔صرف نسل بچانے کے لیے آپ اسے انسانوں جیسی زندگی گزارنے نہیں دیتے۔انسان ہوتے ہوئے بھی اسے گھوڑوں کی طرح اصطبل میں باندھ لیں گے۔بابا سائیں،نصیر خان انسان ہے بابا سائیں۔۔۔اسے انسان کی طرح زندگی گزارنے دیں۔یہ اس کا حق بھی ہے۔اور میرے ہوتے ہوئے اس سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو یہ اسے شہر میں رکھے گا۔

مہرو کے والد: اور تو۔۔۔۔۔۔تیرا کیا ہوگا مہرالنساء

مہرالنساء:(انتہائی دکھی لہجے میں)مجھے جتنی زندگی گزارنی تھی وہ میں گزار چکی ہوں۔"(۱۰)

مہرو صبح نصیر خان کی دوسری بیوی کے لیے خریدی گئی چیزیں، کپڑے اور اپنی شادی کے زیورات نصیر خان کے بیگ میں رکھ دیتی ہے اور شہر کی طرف روانہ کر دیتی ہے۔ نصیر خان چلا جاتا ہے مگر وہ ایک تعلیم یافتہ اچھی تربیت کے ساتھ زندگی گزارنے کے سبب مہرو کے دکھ کو سمجھ جاتا ہے اور واپس آکر دوسری شادی کا خیال ترک کر کے اس کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

اس ڈرامے میں عورت کی مظلومیت اور بے چارگی کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔مہرو کا طرز عمل اس کے ماحول اور حالات کے مطابق حقیقت پر مبنی ہے۔زندگی اس کے لیے موت سے زیادہ اذیت ناک ہے۔عورت کو مرد کی رفیقِ زندگی کی حیثیت سے مختلف رویوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مہرو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے مگر جاگیردرانہ طرز معاشرت میں عورت کے وجود اس کے جذبات کی کوئی قدر کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور کبھی اسے قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے اور کبھی سورہ اور ونی کی صورت میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ڈرامہ پنجرے کے پرندے میں پہلے عورت ہونے کے ناطے اس کے بنیادی حقوق جس میں عورت کی شادی کے وقت پسند ناپسند یا اس کی مرضی کا تعین کرنا ہے،مہرو کو نہیں دیا گیا بلکہ اس سے پوچھے بغیر اس کی شادی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔اس کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس کے

خاندان میں اس کی عمر کا کوئی چچازاد نہیں تھااور وہ اکیلی جائیداد کی وارث اور نسل کی خاطر ایک 7 سال کے بچے سے بیاہ دی جاتی ہے۔اس طرح اس کو ہمیشہ کے لیے ایک پنجرے کا پرندہ بنا کر اس کے پر ہمیشہ کے لیے کاٹ دیے جاتے ہیں۔اس کے ارمانوں اور خواہشوں کا جیتے جی خون کر دیا جاتا ہے مگر جاگیر درانہ معاشرے میں کسی عورت کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بزرگوں کے فیصلے سے انکار کرے۔بلکہ اس کے لیے اپنے بڑوں کا ہر فیصلہ حرف آخر ہوتا ہے۔اس ڈرامے میں مہرو کے والد کا کردار یا رویہ منفی قدروں کے فروغ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عورت کے لیے مرد کی تخلیق کردہ اقدار کی گرفت اتنی مضبوط اور سخت ہے کہ عورت کتنی بھی تعلیم یافتہ،ذہین اور باشعور کیوں نہ ہو اسے اپنی پسند یا اپنی مرضی سے جینے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔جاگیر درانہ نظام معاشرت نے کبھی عورت کی انفرادی حیثیت کو قبول نہیں کیا۔وہ اپنی ذات کے لیے اکیلی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔

یونس جاوید کی لکھی ہوئی تحریر طویل دورانیے کا ڈرامہ تکمیل بھی جاگیر درانہ سماج میں عورت کی سماجی حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ان کا ادبی مطالعہ،سماجی شعور اور نفسیاتی آگاہی کا اظہار و ابلاغ ان کے کرداروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ان کے جاگیر درانہ نظام پر لکھے ڈرامے پاکستانی عورت کے کردار کی داخلی کیفیات اور خارجی مسائل کا متوازی اظہار عورت اور خواتین کے استحصال کے شدید احساس کو جنم دیتا ہے۔ڈرامہ تکمیل کا مرکزی کردار راجوہ ایک ایسی عورت ہے جو مردانہ استحصال کے ساتھ عورت پر عورت کے ظلم و ذہنی تشدد کو فروغ دینے والی قدروں پر استوار معاشرے کے منفی رویوں کا شکار ہو جاتی ہے۔اس ڈرامے میں عورتوں اور مردوں کے کئی بدلتے روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ڈرامے کے کردار نواب قادر اور اس کی بیوی،اکلوتا بیٹا نواب بدر اس کی اکلوتی بیٹی اور مرکزی کردار راجوہ کے علاوہ نوکر اور نوکرانیاں شامل ہیں۔نواب قادر کے بیٹے نواب بدر کو کالج کے زمانے میں متوسط گھرانے کی ایک لڑکی جو کے اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی ہے،سے محبت ہو جاتی ہے۔وہ گھر آکر والدین سے اس سے شادی کا ذکر کرتا ہے اول تو گھر والے بہت ناراض ہو جاتے ہیں مگر بیٹے کی ضد کے سامنے مجبور ہو کر اس کی شادی راجوہ سے طے کرتے ہیں۔اس کے والدین راجوہ نواب بدر کی دلہن کو شروع ہی سے بالکل پسند نہیں کرتے اور ہر وقت اس کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔وقت گزرتا جاتا ہے اس کے ہاں تین سال تک اولاد نہیں ہوتی۔بدر کی ماں ہر وقت راجوہ کو بے اولادی کے طعنے دیتی ہے۔حالات کی سنگینی اور مصلحت کے تحت وہ اپنے شوہر کی دوسری شادی اس کی چچا کی بیٹی جو ایک بہت ہی مغرور لڑکی ہوتی ہے اس کے والدین کی مرضی سے کرواتی ہے جو شادی کے بعد بیماری سے بانجھ ہو جاتی ہے۔راجوہ کو اس کے صبر کی صورت میں اللہ اولاد کی نعمت سے نوازتا ہے۔اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگتی ہے۔

راجوہ کا کردار خالص نسائی کردار ہے جس سے شاید ہی کوئی متوسط گھرانے کی مشرقی لڑکی ہو نہ گزری ہو۔ وہ ایک وفادار بیوی ہے جو سسرال کے مظالم اور شوہر کی بے التفاتی ایک باشعور اور مظلوم لڑکی کی طرح میکے والوں سے چھپاتی ہے۔ وہ کسی سے بھی اپنے مسائل نہیں بیان کرتی بلکہ حالات سے نمٹ کر اس کا بخوبی حل نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ گھر اور گھر والوں کے لیے کسی بھی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہے تو اپنے جذبات پر قابو رکھ کر اپنے شوہر کو خود ہی دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ جب بدر دوسری شادی کرتا ہے تو اس کی دوسری بیوی کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کا حکم بجالانا بھی اپنا فرض سمجھتی ہے تاکہ گھر میں سکھ و آرام رہے کسی کو اس کی ذات سے کوئی شکوہ نہ ہو مگر یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی اس کی سوکن اس سے نفرت کرتی ہے اور اس کی ہر طرح سے تذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہاں تک کے بدر کو بھی اس کے پاس جانے اور بات کرنے سے منع کرتی ہے مگر راجوہ یہ سب غم برداشت کرتی ہے۔ اور کوئی بھی شکوہ زبان پر نہیں لاتی۔

ہمارے معاشرے کی زیادہتر عورتوں کی سماجی حیثت کو دیکھا جائے تو ہر عورت میں راجوہ کا عکس نظر آتا ہے۔ شادی کے بعد زیادہتر عورتوں کے لیے سسرال کسی جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ جہاں پر مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس کو ہر طرح سے تشدد کا نشانہ بناتی ہیں۔ ذہنی تشدد کا نشانہ بننا تو تقریباً ہر عورت کے حصے میں آتا ہے۔ راجوہ کا سب سے بڑا قصور کہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی جس کا نوابوں کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس کی دوسری بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ تین سال تک اپنے گھر والوں کے لیے کوئی اولاد نہ دے سکی۔ اس کی دن رات گھر اور گھر والوں کی خدمت، ان کا ہر حکم بجالانا، ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس کے ہاں اولاد نہیں اور وہ اپنے گھر کے لئے کوئی ولی وارث پیدا نہیں کرتی۔ اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سسرال والوں کے نزدیک ایک انسان سے زیادہ ایک عورت ہے جس کی معاشرہ میں مرد کے سامنے کوئی حیثیت نہیں وہ بچے پیدا کرنے والی ایک مشین یا ذریعہ ہے۔ ایک انسان کی طرح زندگی گزارنے، سوچنے سمجھنے اور بولنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں۔ مرد مرکزی نظام میں اس کے شوہر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کا شوہر بھی دوسری شادی کا فیصلہ کرتا ہے تو اس میں اس کے گھر والوں کی پسند ناپسند کے علاوہ اس کی بیوی کو کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کی مرضی، اس کی رائے کا کوئی احترام ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا مشرقی عورتیں صاحب اولاد ہونے کے بعد سماج اور شوہر کے گھر تھوڑا بہت مستحکم ہو جاتی ہیں۔ راجوہ بھی ماں بننے کی خبر کے ساتھ سسرال میں جگہ پاتی ہے۔ اور اس کی زندگی میں خوشی کے دن آتے ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس عورت کا اپنا وجود ان کے اپنے احساسات و جذبات مرد مرکزی نظام میں کوئی معنی نہیں رکھتے؟ کیا جب بھی یا کہیں بھی جس فرد کا دل چاہے اس کی زندگی اور جذبات سے کھیلتا رہے اور اس کا ہر طرح سے

استحصال کرتا رہے۔ شادی کے بعد بے اولاد عورتوں کو بنیادی حقوق نہ دینے کے علاوہ معاشی حقوق دینے پر بھی کوئی آمادہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی گھریلو حیثیت بہت کمزور ہوتی ہے اور اس کو قابل قدر اور قابل احترام نہیں جانا جاتا ہے وہ اپنے گھر والوں کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ ان کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان تک ہار دے۔ اور اپنی ہر خواہش اور ہر تمنا کا گلا گھونٹ دے۔

(ہ) جسمانی استحصال:

اسلام آباد مرکز سے نشر ہونے والا ڈرامہ دھندلے راستے، حسینہ معین دورِ جدید میں شہری زندگی سے متعلقہ مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ مشرقی عورت جتنی بھی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس کی زندگی کا محور و مرکز شوہر کی محبت اور گھر ہوتا ہے۔ آج کی ماڈرن اور امیر لڑکی بھی جب محبت کرتی ہے تو پوری وفا اور سپردگی سے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے۔ حسینہ معین کی لکھی ہوئی تحریر دھندلے راستے بھی ایک ایسی ہی وفا شعار لڑکی کی کہانی ہے۔

اس ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں ایلیاء ہیروئین اور اس کے والدین، جنید جمشید اور اس کا میوزیکل گروپ شامل ہیں۔

ایلیاء کالج میں پڑھنے والی ایک ماڈرن آزاد خیال شہری لڑکی ہے۔ جو ایک پروگرام میں جنید جمشید کو گاتے ہوئے دیکھ کر بہت متاثر ہوتی ہے۔ آٹو گراف کے بہانے دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ جنید کی خوشی اور کامیابی کے لیے اپنے والد، جو ایک بہت بڑے بزنس مین ہیں اور اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر اس کے لیے بہت کچھ کرنے کو تیار ہوتے ہیں، سے کہہ کر جنید کے لیے ایک پروگرام بناتی ہے جس سے اس کو بہت ساری شہرت اور کامیابیاں ملتی ہیں۔ اس کامیابی سے ایلیاء اور جنید ایک دوسرے کے مزید قریب آجاتے ہیں۔ دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ایلیاء ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہوتی ہے اور جنید کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے۔

ایک دن جنید کے گروپ کے لیے امریکہ سے دعوت نامہ آتا ہے جس پر سب بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایلیاء چاہتی ہے کہ امریکہ جانے سے پہلے جنید اس سے شادی کرلے جس پر جنید اسے دھتکارتا ہے۔ ایلیاء کے لیے جنید کا اسے چھوڑ کر جانا ناقابل برداشت ہوتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

حسینہ معین کے زیادہتر ڈراموں میں عورت کے مسائل اور اس کے استحصال کے حوالے سے نسوانی کرداروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ ایلیاء مطلب کی آڑ میں رشتوں کے استعمال اور جذباتی استحصال کا شکار ہے۔ پڑھی لکھی شہری لڑکی کی سادگی، محبت اور رشتوں پر اعتبار اس کردار کا اثاثہ ہے۔ مگر اس لڑکی کے کردار میں ایک تعلیم یافتہ، خوش حال اور آزاد خیال عورت کی آخری حد بھی مرد کے اختیار میں نظر آتی ہے۔ وہ فیصلے کے لیے مرد کی محتاج ہے۔ جنید ایلیا کو تب تک

بہت چاہتا ہے جب تک وہ کامیاب نہیں ہوا تھا اور پیسے کا محتاج تھا مگر مشہور ہونے پر وہ ایلیاء کو یکسر نظر انداز کرتا ہے وہ اس کی ذات اور محبت کی نفی کرتے ہوئے اسے کامیابی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔اس کے پاس اس کے احساسات وجذبات کوئی معنی نہیں رکھتے۔اس کی ذات جنید کے لیے ایک کھلونا ہوتی ہے۔پس پردہ وہ اور اس کے گروپ کے دوسرے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر ایلیاء بے چاری اپنی محبت پر اندھا اعتماد کرنے کی وجہ سے ان سب باتوں سے بے خبر رہتی ہے۔یہ کردار ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے۔اس طرح بہت ساری معصوم لڑکیوں کے جذبات سے کھیل کر ظالم مرد ان کا استحصال کرتے ہیں۔ مگر ان کے ضمیر انہیں ملامت نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا کوئی ہوتا ہے۔اور لڑکیاں بے چاری بے وفائی کا غم گلے لگا کر اکثر خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔

''ایک تھی صفیہ ''انور مقصود کا لکھا ہوا طویل دورانیے کا ڈراما ایک شوہر پرست بیوی کی کہانی ہے۔یہ کردار اپنے عہد کے مسائل ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد کے انسان کے نفسیاتی ،سماجی آشوب اور ظاہر و باطن کے متضاد پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔اس ڈرامے کا مرکزی کردار صفیہ ایک نیک شریف اور خوبصورت لڑکی ہوتی ہے جس کا باپ ایک دفتر میں چوکیدار ہوتا ہے مگر انتہائی شریف اور پانچ وقت نماز کا پابند ہوتا ہے۔اس نے اپنی بیٹی کی تربیت اسلامی طرز و طور پر کی ہوتی ہے۔بدقسمتی سے صفیہ کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو جاتی ہے جو نہایت بے غیرت اور لالچی شخص ہوتا ہے۔وہ اپنی بیوی کو ماڈل بنا کر اسے معاش کا ذریعہ بناتا ہے۔صفیہ کی مرضی کے خلاف اس سے ہر قسم کے غلط کام کروانا اپنا حق سمجھتا ہے۔کاروبار کے سلسلے میں اپنی بیوی کا جنسی استعمال کرتا ہے اسے ہوٹلوں میں غیر مردوں کے پاس بھجواتا ہے جس پر صفیہ اف تک نہیں کر سکتی تھی۔اس کی بیٹی مینا جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس کا شوہر عبداللہ اس کو بھی اس کام کی طرف لانا چاہتا ہے مگر بیٹی کا سن کر صفیہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور بیٹی کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے شوہر کو چھوڑ کر اپنے بوڑھے والد کے پاس چلی جاتی ہے۔

عورت تعلیم یافتہ ہونے اور آدرش رکھنے کے باوجود اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔عورت کے لیے اپنے ارادے سے کچھ اختیار کرنا تو درکنار کچھ ترک کرنا بھی ممکن نہیں مگر زندگی میں سمجھوتہ کرنے اور اسے نبھانے کی ہمت اور حوصلہ اس میں مرد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔مرد مرکزی نظام میں عورت پر اس کی مرضی کے خلاف ہر حکم و فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔شادی سے پہلے عورت باپ اور بھائیوں کی دست نگر ہوتی ہے اور وہی اس کی تقدیر کے مالک ہوتے ہیں۔شادی کے بعد اس کی زندگی کا اختیار اس کے شوہر کو ہوتا ہے۔صفیہ کسی اور کو پسند کرتی تھی مگر باپ نے اس کا رشتہ اس کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے مرد سے طے کر دیا جس پر وہ خاموش رہی۔شوہر کے گھر آتی ہے تو اس کو یہ بات آتے ہی سمجھائی جاتی ہے کہ اب اس کا مجازی خدا اس کا شوہر ہے جس کی وہ ہمیشہ تابع فرمان رہے گیا ور کبھی بھی اس

کے فیصلے کی خلاف ورزی یا حکم عدولی ایک بہت بڑا گناہ سمجھا جائے گا۔ صفیہ بے چاری شوہر کے حکم پر ماڈل بنتی ہے اور یہاں سے اس کا ذہنی و جسمانی استحصال شروع ہوتا ہے۔ اس کا ہر دن ہر شب کسی اور کی بانہوں میں گزرتا مگر اس کے شوہر کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ اس طرح وہ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ پیسے وصول کرتا اور اپنے کاروبار کو وسعت دیتا۔ اس کی بیوی ہر وقت اداس رہتی اور اپنے آپ سے نفرت سی کرنے لگی تھی۔ مگر وہ بے بس تھی کیونکہ اگر وہ کبھی اس کام سے انکار کرتی تو اس کا شوہر اسے چھوڑ دیتا۔ بے سہارا ہونے کے ڈر سے اس نے اپنی زبان کو تالا لگایا ہوا تھا۔ ہر وقت اس کے جذبات اور احساسات کا خون ہوتا تھا۔ مگر شوہر کی خوشنودی کے لیے اس کا ہر حکم بجالاتی۔

عورت کی کمتر سماجی حیثیت اور اس کے وجود کی نفی کا احساس وقت کے ساتھ بڑھتا معلوم ہوتا ہے۔ انور مقصود کے ڈراموں میں عورت معاشی مسائل یا خاندان اور شوہر کی حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرتی نظر آتی ہے۔ ایک تھی صفیہ ڈرامے میں عورتوں کے مسائل بڑے اہم سوالوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ صفیہ کا کردار بڑے اہم تضادات کو ابھارنے لگتا ہے۔ حبس زدہ ماحول، بے بسی اور بے چارگی عورت ہی کے لیے کیوں ہے؟ اس کے وجود کو نظر انداز کرنے اور اس کے بنیادی حقوق سے پہلو تہی کے رویوں کا فروغ کیوں ہے؟ سمجھوتے اور مصلحت سے کام لیتا اور اکیلی دکھ سہتی عورت ہی کی ذات کیوں ہے؟ غیرت، عزت، حسد اور رقابت کا نشانہ عورت ہی کی حیات کیوں ہے؟ عورت سے جوانی، جذبوں، محبت اور زندگی کی قربانی کیوں طلب کی جاتی ہے؟ یہ اور اس جیسے سینکڑوں سوال ڈرامہ ایک تھی صفیہ کو دیکھ کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

جہد حیات میں برابر کا بوجھ اٹھانے والی عورت زندگی کے ہر شعبے میں برسرپیکار نظر آتی ہے۔ گھر اور باہر کی دنیاؤں میں سخت مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔ ورکنگ ویمن کے کردار نرس، ٹائپسٹ، صحافی، ٹیچرز، ماڈل، ایکٹر اور ڈانسر کے روپ میں ڈرامے میں ایک جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ ڈرامہ نگار مصنفین نے ملازمت کرنے والی اور دوسری اہم پیشوں سے منسلک عورتوں کے کرداروں کو ان کی ذاتی زندگی، سماجی حیثیت اور معاشرتی اقدار کے تناظر میں دیکھنے کی کاوش کی ہے۔

اصغر ندیم سّید کی لکھی ہوئی تحریر طویل دورانیے کا کھیل ''ملکہ عالم'' اسی کاوش کی کڑی ہے۔ جس میں گھر سے بھاگی ہوئی ایک ان پڑھ خوبصورت لڑکی کی زندگی سے وابستہ مسائل کو ناظرین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامہ دو مرکزی کرداروں روشن آراء، تصور شیخ اور بہت سے ضمنی کرداروں پر مشتمل ہے۔ یہ ڈرامہ ہاسپٹل کے ایک منظر سے شروع ہوتا ہے جہاں ماضی کی ایک مشہور فلمی اداکارہ روشن آراء فالج زدہ اور نیم نفسیاتی مریضہ بن کر گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے ایک صحافی تصّور صاحب، جو کبھی روشن آراء بیگم کا عاشق ہوا کرتا تھا، ملنے آتا ہے۔ وہ اصل میں اس کی

زندگی کی اصل کہانی اور حالات وواقعات جاننا چاہتا ہے۔ روشن آراء کی نظر چونکہ کمزور ہو چکی ہوتی ہے اس لیے وہ تصور کو اس کی شکل سے پہچان نہیں پاتی۔ مگر اس کی آواز سے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگاتی۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور تصور باتوں باتوں میں روشن آراء کی زندگی کے بند باب کے اوراق کھولتا جاتا ہے۔ دراصل روشن آراء بیگم اپنے پہلے شوہر جس کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ برقعہ پہن کر اور نقاب اوڑھ کر ایک سٹوڈیو میں گانے کا ایڈیشن دینے آتی ہے۔ آپ ماضی میں ایک خوبصورت خاتون تھی۔ گاتے وقت ایک آدمی اسے نقاب اٹھانے کو کہتا ہے اور جب وہ اس کا چہرہ دیکھتا ہے تو اسے فلم میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی وقت اس کا شوہر اس سے پوچھے بغیر اس دعوت کو قبول کرتا ہے۔ روشن آراء کی پہلی فلم ہٹ ہو کر اسے صف اول کی ہیروئین بنا دیتا ہے۔ اور پھر تو جیسے روشن آراء کی زندگی میں پیسوں کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے انتہا کی شہرت اس کو ملکہ بنا دیتی ہے۔ ہر وقت صحافیوں اور دوسرے پرستاروں کا جھمگٹا ہر وقت ایک سیلابی ریلے کی شکل میں موجود رہتا ہے۔

اس کے بعد روشن آراء بیگم مختلف پیشوں سے منسلک افراد جن میں بینکرز، پولیس آفیسرز، بزنس مین، انکم ٹیکس آفیسرز، سیاستدان اور جاگیر دار شامل ہوتے ہیں کا ذکر کرتی ہے۔ یہ لوگ روپے بیگوں اور بوریوں میں بھر بھر کر روشن آراء کو خریدنے آتے تھے۔ مگر وہ انکار کرتی جاتی۔ کیونکہ وہ روپیہ سے زیادہ انسان کی قدر و قیمت کی خواہ تھی۔

سب سے پہلے روشن آراء کسی بٹ صاحب کا ذکر کرتی ہے جو ایک پولیس آفیسر تھا اور روشن آراء بیگم نے اپنے ایک بے گناہ اسسٹنٹ کو چھڑانے کے لیے اس کو سفارش کی تھی۔ روشن آراء بیگم اور پولیس انسپکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''پولیس: آپ کی سفارش پر میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

روشن آراء بیگم: بہت شکریہ، وہ غریب بے قصور تھا۔

پولیس: (روشن آراء کی طرف دیکھ کر) اگر آپ حکم کریں تو ہم جیل کے سارے دروازے کھول دیں۔

روشن آراء: آپ بادشاہ ہیں کر سکتے ہیں۔

پولیس: (سونے کے سیٹ کا ڈبہ کھولتے ہوئے) یہ ایک قیمتی سیٹ میں آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔

روشن آراء: ہم تو نقلی زیور پہننے کے عادی ہیں اسے آپ اپنی بیگم کے لیے لے جائیں۔

پولیس:(روشن آراء کی نظروں سے نظریں ملا کر)اسے میں نے آپ کے لیے خریدا ہے۔

روشن آراء:(تعجب سے اس کو دیکھ کر)آپ یہ خرید سکتے ہیں کیا تنخواہ ہے آپ کی؟

پولیس: چھوڑیے جی، کون دیتا ہے تنخواہ۔(آہستہ سے)وہ تو شاید میرے دھوبی کے بل کے برابر نہ ہو۔

روشن آراء:(پولیس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھ کر)تو آپ رشوت لیتے ہیں۔

پولیس: کیا خیال ہے آپ کا اگر میں رشوت نہیں لونگا تو کوئی اور میری جگہ لے گا جس طرح اگر آپ یہ سیٹ قبول نہیں کرتیں تو کوئی اور قبول کر لے گا۔اسے تو بہر حال میرے ہاتھ سے جانا ہے۔

روشن آراء:(پولیس کو طنز بھری نگاہوں سے دیکھ کر)اچھی لگیں ہمیں آپ کی باتیں، کم از کم آپ سچ تو بولتے ہیں۔"(۱۱)

اس طرح روشن آراء بیگم اس سیٹ کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اور ایک پولیس کے ہاتھوں بکنے، ذلیل ہونے اور جسمانی استحصال سے خود کو بچاتی ہے۔

روشن آراء بیگم تصور سے ان رئیس زادوں کا بھی ذکر کرتی ہے جو اس سے شادی رچانے کے خواہشمند تھے۔ ایک دن ایک چودھری منصف علی اپنے نوکر کے ہاتھ ایک قیمتی گاڑی کی چابیاں روشن آراء کو تحفے کے طور پر بھجواتا ہے۔ جس کو روشن آراء لینے سے انکار کرتی ہے۔اس کے بعد ادھیڑ عمر شخص چودھری منصف علی آپ سے ملنے خود آتا ہے اور روشن آراء کو شادی کا پیغام دیتا ہے۔دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ذیل میں دی جاتی ہے۔

"چودھری منصف علی: لو جی ہم خود ہی درخواست لے کر حاضر ہوئے۔

روشن آراء بیگم:(طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) تشریف رکھیے اور بتایئے کہ ہم کسلائق ہیں۔

چودھری منصف علی: آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ہم خود کبھی منسٹر نہیں بنے۔ مگر کئی بالکے منسٹرز لگے ہوئے ہیں اور اپنا تو شوق ہے کہ۔۔۔

روشن آراء بیگم: آپ کا تو شوق کتوں اور گھوڑوں کا ہو گا۔

چودھری منصف علی:(روشن آراء کی طرف جذباتی لہجے میں مخاطب ہو کر)او نئی جی ہم تو شادی کی خواہش رکھتے ہیں۔

روشن آراء بیگم: (چودھری کی طرف گہری اور نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر) ہم م م م۔۔۔اب ہم سمجھے۔آپ تو ہمارے کیا سب کے سردار ہیں۔

چودھری منصف علی: نئ جی ہم تو پرستانِ حسن آراء ہیں بلکہ پرستانِ حسن آراء کے صدر ہیں۔

روشن آراء: (کرخت لہجے میں) آپ یقیناً ہمیں دوسری یا تیسری بنانے آئے ہیں۔(سر کو آہستہ آہستہ اثبات میں ہلاتے ہوئے) کاش آپ ہمیں پہلی بیوی بنانے آتے۔

چودھری منصف علی: پھر آپ یوں سمجھیے پہلی پہلی شادی ہے ہماری، مربعے، باغات، حویلیاں سب کے لیے۔

روشن آراء بیگم: آپ کا وقت بہت قیمتی ہے (طنز بھرا لہجہ) آپ نے ملیں لگانی ہونگی، قرضے لینے ہوں گے۔آپ تشریف لے جایئے۔

چودھری منصف علی: ہم نے بہت لگالی ملیں۔فیکٹریاں۔اب آپ لگائیں۔

روشن آراء: ہم فنکار لوگ ہیں ہمیں اس سے کیا آپ جائیں جائیدادیں بنائیں۔"(۱۲)

اس طرح اس عیاش چودھری کو روشن آراء بیگم شادی کرنے سے انکار کرتی ہے اور اس طرح ہمارے معاشرے کے ان تمام بظاہر معصوم اور پاک دامن رکھنے والے رئیس زادوں کے منفی کرداروں کو ہمارے سامنے لاتی ہے جو بظاہر عورت کے تحفظ اور حقوق کے لیے بڑے بڑے جلسے جلوس نکالتے ہیں اور کاغذی کاروائیاں کرتے ہیں مگر اصل میں ان کے دل میں کسی عورت کے لیے کوئی احترام نہیں ہوتا۔اور ان کی ناپاک نظریں اور غلیظ نگاہیں عورت کو جسم فروشی پر مجبور کرتی ہیں۔یہ رئیس زادے مختلف حربوں سے ان مجبور عورتوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کرتے ہیں اور پھر ان عورتوں کو یا تو مروا دیا جاتا ہے یا پھر اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ معاشرے میں کسی کو اپنا دکھ بتا سکیں اور ایک صحت مند زندگی گزار سکیں۔ان مظلوم اور معصوم عورتوں کو ہر طرح سے برباد کر دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک بیوروکریٹ جس کی عمر پینسٹھ سال کے لگ بھگ ہوتی ہے روشن آراء بیگم کو کلب بلاتا ہے۔اس کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں ایک کھلونے کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف پارٹیز میں امیر بزنس مینوں کے دل جیت کر اس کے لیے ترقی کی راہیں کھولے۔اس کے علاوہ مختلف صنعت کار، جلد از جلد امیر بننے والے اور بہت سے لالچی لوگ روشن آراء بیگم سے شادی کر کے اسے استعمال کرنے کے خواہشمند تھے جس کو وہ ان کے گندے ارادے بھانپ کر شادی کرنے سے انکار کرتی جاتی ہے۔

اس کے بعد روشن آراء بیگم ایک صحافی کا بھی ذکر کرتی ہے جس نے اس کو بدنام کرنے کی باقاعدہ ایک مہم شروع کر دی تھی اور فلم انڈسٹری میں اس کو ہر حد تک گرانے کی کوشش کی مگر روشن آراء اس کو جانتی تک نہیں تھی۔ دراصل وہ یہی تصور شیخ صاحب تھے یہ سن کر وہ تذبذب کا شکار ہوتے ہے اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہے۔

فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے اس کردار کے ذریعے ان عورتوں کے مسائل سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دراصل ایک فنکار کی زندگی کن مسائل سے بھرپور ہوتی ہے اور ہمارے معاشرے کے غلیظ سوچ رکھنے والے کس طرح سے ان عورتوں کا استحصال کرتے ہیں اور ان کو اپنی مرضی سے جینے کے تمام حقوق سلب کیے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کو جانوروں سے بھی بدتر بنادیا جاتا ہے۔

روشن آراء تصور سے کہتی ہے کہ پہلی بار ہمیں انگریز نے لوٹا اور دوسری بار انگریزی نے۔ روشن آراء بیگم اپنے دوسرے شوہر جن سے اس نے اس کی میٹھی باتوں اور انگریزی سے متاثر ہو کر شادی کی تھی کے بارے میں بتاتی ہے۔ جو بعد میں اس کی ایک بیٹی کا باپ بنا۔ بظاہر یہ آدمی روشن آراء کی شہرت اور دولت کی وجہ سے اس سے بہت محبت کرتا تھا مگر جب وہ فلموں میں کام کم کرنا شروع کرتی ہے تو روز اس سے لڑنا جھگڑنا شروع کرتا ہے۔ حتیٰ کے بات طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ روشن آراء نے اپنے لالچی شوہر کے ڈر سے اپنی جائیداد اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر دی تھی جو ابھی کم سن تھی۔ اس کا لالچی شوہر اپنی بیٹی کو روشن آراء کے صبح اٹھنے سے پہلے گھر سے لے جاتا ہے۔ روشن آراء زار و قطار روتی ہے مگر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہیں ہوتا۔ وہ عدالت میں اپنے شوہر پر مقدمہ کرتی ہے مگر اس کا شوہر اس کو بدکردار اور بدچلن ثابت کر کے مقدمہ جیت جاتا ہے اور اس طرح روشن آراء بیگم بیٹی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد روشن آراء خودکشی بھی کرتی ہے مگر زندہ بچ جاتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ روشن آراء کے مسائل میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے اور سماج کے مختلف منفی سوچ کے حامل افراد اس کی حیات کو مشکل سے مشکل بنانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اور اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے جاتے ہیں۔ اپنی آخری فلم ''ملکہ نور جہاں'' کے بعد روشن آراء بیگم ہمیشہ کے لیے فلم انڈسٹری کو خیر باد کہہ دیتی ہے اور ایک کرائے کے مکان میں روپوش ہو کر گمنامی کی زندگی گزارتی ہے۔ وہاں ایک شائستہ نامی خوبصورت لڑکی جو اس کی ہمسایہ تھی روز ملنے آتی ہے۔ چونکہ اس کی کوئی سہیلی نہیں ہوتی اس لیے وہ روشن آراء سے عمروں کے تضاد کے باوجود دوستی کر لیتی ہے وہ اسے دل کی ہر بات بتاتی ہے۔ دونوں کے درمیان ایک راہ چلتے لڑکے پر گفتگو ذیل دی جاتی ہے۔

''روشن آراء: (چارپائی پے نیم لیٹی ہوئی ہے) کیا بات ہے شائستہ بیٹا۔

شائستہ :(روشن آراء کی ٹانگوں کو پیار سے دباتے ہوئے)وہ نہ آنٹی ایک لڑکا ہے۔مجھے پسند کرتا ہے۔وہ کالج جاتے ہوئے مجھے دیکھا کرتا تھا۔

روشن آراء بیگم: اوہ، یہ تو بہت بُری حرکت ہے۔

شائستہ: مگر آنٹی وہ بہت اچھا ہے۔اس نے مجھے خط بھی لکھے ہیں۔

روشن آراء بیگم :بیٹا، جو لڑکے ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔وہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔تم اس کے کسی خط کا جواب نہ دینا۔

شائستہ: مگر آنٹی وہ کہتا ہے میں مر جاؤں گا۔

روشن آراء بیگم:(پیار سے سمجھاتے ہوئے)بیٹی،ایسے لڑکوں پر اعتبار نہیں کرتے۔سب جھوٹ ہے فریب ہے۔جو مرد عورتوں کے لیے خوبصورت جال بُنتے ہیں وہ شکاری ہوتے ہیں۔اس کی باتوں میں نہ آنا۔

شائستہ: مگر وہ تو قسمیں کھاتا ہے۔

روشن آراء بیگم: اسی لیے تو میں کہتی ہوں وہ جھوٹا ہے۔(آنکھوں میں آنسو لے کر) کچھ لوگ انگریزی بول کر فریب دیتے ہیں۔کچھ لوگ قسمیں کھا کر۔

شائستہ: وہ مجھے کہتا ہے میرے ساتھ گھر سے نکلو۔

روشن آراء بیگم :(یکدم بستر پر بیٹھ کر اور شائستہ کے چہرے کو چھو کر پریشانی سے)شائستہ بیٹا ایسا کبھی نہ کرنا۔اپنے گھر کی دہلیز کبھی نہ چھوڑنا۔یہ زمین اگر ایک بار چھوٹ جائے تو عورت برباد ہو جاتی ہے۔اپنے ماں باپ کا گھر کبھی نہ چھوڑنا ،نہیں تو ماری جاؤ گی۔''(۱۳)

اس طرح اپنی زندگی کے تجربے سے سیکھ کر روشن آراء بیگم ایک معصوم لڑکی کو کسی ظالم مرد کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچاتی ہے۔

روشن آراء ہاسپٹل میں آئے ہوئے جس تصور شیخ سے بات کرتی ہے دراصل اس کا ایک تصور ہوتا ہے جس سے وہ لاشعوری طور پر اپنے زندگی کے مختلف واقعات بیان کرتی جاتی ہے۔اور جب اسے ہوش آتا ہے تو زور سے قہقہے لگاتی ہے اور کہتی ہے تصور بھی چلا گیا۔یہ کہانی ہر اس عورت کی کہانی ہے جس کی زندگی کسی نہ کسی پیشے سے وابستہ ہے ہمارے سماج کی سیکڑوں عورتیں جب گھر سے مجبور ہو کر نکلتی ہے تو وہ مرد کے ہاتھوں کھلونا بن جاتی ہے اور برباد ہو جاتی ہے۔

نورالھدیٰ شاہ کی تحریر اور سلطانہ صدیقی کے ہدایات پر مبنی ڈراما "زرا سی عورت" اپنی جگہ پر عورت کی زندگی اور کردار کا صحیح عکس ہے۔

افسوس اس وقت بہت ہوتا ہے جب ایک عورت۔ایک مرد،ایک گھرانے اور سرزمین کی وحدت، عزت اور تعظیم کی خاطر ہر قسم کی قربانی دیتی ہے مگر پھر ایسی عورت کو کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ہمارا ماحول اور سماج اس عظیم عورت کو اپنی بے حسی اور غیر ذمہ داری سے احساس دیتا ہے کہ تم بس ذرا سی عورت ہو۔

ایک عورت کاغذات، تجاویز اور تقاریر میں تو فقید المثال اور عدیم النظیر گردانی جاتی ہے مگر ایک نسل و خاندان سے لے کر قانون اور وطن تک اس پر عملی لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ تم ذرا سی عورت ہو۔اس کو بتایا جاتا ہے کہ معاشرے کے ہاں جس قدر رسومات، روایات، اعمال، اقدامات، الفامات، حاملات، قواعد، نتائج اور سفارشات ہیں تو ان میں آپ کا صحیح رتبہ اور حقیقت ایک ذرا سی عورت کا ہے۔

اس ڈرامے میں دو مرکزی کردار قدسیہ بیگم اور اسد اللہ پہلے ظہور پاتے ہیں اور پھر ایک اور کردار امجد بھی نمودار ہوتا ہے۔قدسیہ بیگم اپنے شوہر پر دل و جان سے فدا ہوتی ہے مگر اس کے پاس وقت نہیں ہوتا اور وہ پیار و محبت کے لمحات کو ترستی رہتی ہے۔یہ جو ہمارا میل سینٹر پرابلم ہے اور ایک عورت اس سے بری طرح متاثر ہے تو شروع کے مناظر میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ ایک عورت کی حیثیت ایک خاتون کی ہے اور یہاں پر مرد کو واضح برتری حاصل ہے جو اپنے دیگر امور میں تو دن رات مشغول رہتا ہے مگر گھر اور گھر داری کو توجہ اور وقت نہیں دیتا اور یوں ڈرامہ نگار بتانا چاہتا ہے کہ ایک شوہر کس طرح اپنے عمل سے دکھاتا ہے کہ بس قدسیہ بیگم ایک ذرا سی عورت ہی تو ہے۔

جب قدسیہ بیگم لاکھ محنت اور ریاضت سے ایک تحقیقی مضمون اور آرٹیکل لکھتی ہے تو صحافت سے منسلکہ ایک مدیر و مالک اس کو خبردار کرتا ہے کہ اس طرح حساس معاملات اور موضوعات پر لکھنا ممنوع ہے اور تم کو سوچ سمجھ کر لکھنا اور چھاپنا چاہیے چاہے سچ و حق ہو اور لاکھ صداقت اور حقیقت پر مبنی خیالات ہوں یہ آپ کا کام نہیں ہے اور اس طرح بغیر پوچھے اور اجازت کے اس طرح نہیں کر سکتی۔قدسیہ بیگم اس بڑے آدمی اور شریف شکل مرد کو سمجھاتی ہے کہ یہ حق ہے اور سچ ہے مگر وہ نہیں مانتا اور اپنی ساکھ اور رسالے کی اشاعت وغیرہ کی شہرت کا کہہ کر قدسیہ بیگم کی رائے اور بات کو رد کرتا ہے۔یہاں پر اس عورت کو باور کرایا جاتا ہے کہ تم ذرا سی عورت ہو اور آپ کا رتبہ بہت کمزور اور حقیر ہے۔مدیر اور قدسیہ بیگم کے دوران ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

"قدسیہ بیگم: آپ نے بلایا سر۔

مدیر: آپ ہر روز لیٹ ہو جاتی ہیں اور آپ کو پتہ ہے یہاں پر ہر بات کا جواب مجھے خود دینا پڑتا ہے۔

قدسیہ بیگم: سوری سر؛ وہ گھر پر کچھ۔۔۔

مدیر: ok,ok آئندہ خیال رکھیے گا۔ i want efficient editor not a late house wife

قدسیہ بیگم: I understand

مدیر: بیٹھیے مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔(کاغذ دکھا کر) یہ آپ نے لکھا ہے؟

قدسیہ بیگم: جی۔

مدیر: کتنا عرصہ ہو گیا آپ کو تقریباً یہاں۔

قدسیہ بیگم: پانچ سال۔

مدیر: اور ابھی تک آپ اس میگزین کی پالیسی نہیں سمجھ سکیں۔

قدسیہ بیگم: دیکھیے سر کسی کاروباری وسائل کے تحت کسی بھی رسالے کو نہیں چلایا جاسکتا اور لوگ کچھ مانگتے ہیں۔ ہمیں کچھ تو دینا چاہیے کم از کم تھوڑی سی سچائی ہی سہی۔

مدیر: یہ تھوڑی سی سچائی ہے مس اسد اللہ۔ یہ اتنی بڑی سچائی ہے اتنی بڑی، جو شارک مچھلی کی طرح منہ کھولے مجھے کھانے کو آرہی ہے۔

قدسیہ بیگم: میں سمجھی نہیں سر۔

مدیر: آپ نہیں سمجھیں گی تب تک جب تک اس عمارت کو آگ نہیں لگا دی جاتی۔ جب تک مجھ پر قاتلانہ حملہ نہیں ہو جاتا۔ اور آپ For God sake مس اسد اللہ آپ ایک عورت ہیں۔(ہاتھ کے اشارے سے) اتنی سی ہوتی ہے عورت in a society۔

قدسیہ بیگم: مگر میں اتنی سی عورت نہیں ہوں۔

مدیر: آپ جتنی بھی ہوں پلیز آئندہ کوئی بھی سیاسی مضمون چھاپنے سے پہلے یہاں میرے ٹیبل پر ہونا چاہیے۔

قدسیہ بیگم: (پریشان اور غصہ ہو کر) ٹھیک ہے سر۔

مدیر: ہاں وہ اس مضمون کا بقیہ حصہ مانگا تھا میں نے آپ سے۔

قدسیہ بیگم :(التجا کے ساتھ کاغذ دیتے ہوئے)ویسے سر میں نے بڑی محنت کی تھی اس

پر۔

مدیر: مس اسد اللہ پلیز۔''(۱۴)

دوسری طرف بیٹی انیتا کو بھی والد وقت نہیں دیتا اور قدسیہ بیگم کو کمانے کا ایک ذریعہ بنایا ہوتا ہے اور یوں بیگم کو دولت کے حصول اور بیٹی کو عبث خیال کر کے ایک مرد، شوہر اور باپ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔جب قدسیہ بیٹی انیتا کی تعلیم، کتابوں اور اسکول کی بات کرتی ہے یا انیتا خود بتاتی ہے تو مرد مصروفیت کا کہہ کر معاملہ کو رفع دفع کر دیتا ہے اور یوں معصوم بیٹی کو بھی ذرا سی عورت کا احساس دلایا جاتا ہے۔

ملازمت پیشہ خواتین کو جہاں مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں مکمل ذہنی آزادی سے کام بالکل نہیں کر سکتی۔ہر جگہ پر ایک مرد براجمان نظر آتا ہے۔ہر گوشے میں ایک مرد بیٹھا ہوا ہے۔ہر طرف ایک آدمی نظر آتا ہے۔ہر قدم پر ایک فرد سے واسطہ پڑتا ہے اور ہر جانب ایک فرد سے سامنا ہوتا ہے اس لیے مکمل فکری یکسوئی اور ذہنی آزادی سے مطلوبہ اقدامات کو سر کرنا اور مقرر، مطالب کو حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اور یہی سب قدسیہ بیگم کے ساتھ ہوتا ہے یوں یہ خاتون خانہ، گھر اور باہر ایک ذرا سی عورت بنی ہوئی نظر آتی ہے۔

مہمان احمد کا آنا اور مختلف باتوں کا ہونا ایک الگ المیہ ہوتا ہے۔مہمان نوازی اور وہ بھی ایک معمولی رشتہ دار خاتون کے گھر۔یہ واقعی ایک کرخت کہانی ہوتی ہے۔شوہر اسد اللہ اور مہمان احمد کے درمیان یہ گھریلو خاتون اور بھی ذرا سی عورت بن جاتی ہے ایک طرف شوہر کا خیال رکھتی ہے اور اس کے دکھوں سے بھاگتی ہے اور دوسری طرف احمد کو بھی دیکھتی ہے۔فاصلہ رکھنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔اس طرح قدسیہ بیگم ایک گیند کی طرح اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے اور دو مردوں کے بیچ ایک کھلونے کی مانند لگتی ہے۔کیا اس عورت کے اپنے احساسات وجذبات نہیں ہیں، کیا اس کے کردار سے انکار ممکن ہے، کیا اس کے ہونے سے زندگی گلزار نہیں ہے، کیا اس کے اعمال سے سانسیں نہیں چل رہی، کیا اس کی خدمات واضح نہیں ہیں، واقعی یہ حق ہے اور سچ ہے مگر زمینی حقائق اور عارضی خداؤں نے اس عظیم عورت کو ذرا سی عورت بنا دیا ہے اور اس کو اس قدر مسائل در مسائل میں قید کیا ہے کہ اب اس کو اپنی زندگی ایک جہنم محسوس ہوتی ہے۔

جب اس عورت کو احمد محبت و مورت سے پکارتا ہے تو شوہر مہمان کو قتل کر دیتا ہے، یوں عورت کو کسی بھی مرحلے پر چاہت اور پربت کا حق حاصل نہیں۔ثابت ہوتا ہے کہ بس یہ ذرا سی عورت جوان ہو، شادی شدہ ہو، بہن ہو، والدہ ہو، چاچی ہو، مامی ہو، خالہ ہو، بیوی ہو، ماں ہو بیٹی ہو، رشتہ دار ہو یا کچھ اور، بس صرف مشین ہو اور اس کا ہر حصّہ خدمت پر معمور ہو۔

احمد قتل ہوتا ہے اور شوہر کو بچانے کے لیے قدسیہ بیگم وہ حادثہ اور قتل اپنے سر اور دم لیتی ہے اور جا کر زندان میں بیٹھتی ہے۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا جیل میں کاٹ کر پوری کرتی ہے اور شوہر دوسری شادی کر کے خوش و خرم زندگی گزارتا ہے۔ اُف کیا ہے یہ؟ کیا یہ حیوانیت نہیں ہے؟ کیا یہ سوچ جانوروں والی نہیں ہے، بے حسی کی انتہا نہیں ہے، کیا اس طرح یہ کھلے عام تذلیل انسانیت نہیں ہے؟ کیا یہ عمل مادیت پر مبنی نہیں ہے، کیا یہ ایک عورت پر سر عام بربریت کے مترادف نہیں ہے؟

واقعی شوہر اسد اللہ کی دوسری شادی کا مطلب قدسیہ بیگم کو ذرا سی عورت پکارنا اور ماننا ہے۔ آخر مردوں کا مسئلہ کیا ہے؟ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ عورتوں کو کسی مکر اور فعل کے تحت یہ ہستیاں سزا دے رہی ہیں؟ وہ ذرا سی عورت تو قربانیوں اور محبتوں کی امین ہوتی ہے، وہ تو اپنے شوہر اور مرد کو خوش رکھنے کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے مگر پھر بھی وہ بس ذرا سی عورت شمار کی جاتی ہے۔ قدسیہ بیگم شوہر کو امریکہ جانے کی تاکید کر کے اس کی سزا اپنے سر لے کر جیل جاتی ہے اور مرد بے حس ہو کر دوسری شادی رچا لیتا ہے۔ یہ کس لحاظ سے مساوات انسانیت اور عورت کے ساتھ یگانگت کا سبق ہے کہ عورت ہر لمحے اور ہر مرحلے پر قربانی دیتی جائے اور مرد و فرد اس کو انسان و انسانیت سے وابستہ مقام و مرتبہ بھی نہ دے۔

بس یہ ہمارے ہاں کھلا تضاد ہے اور چال ہے کہ جس کے ہاتھوں عورت کی شرمندگی اور ذلالت عام ملتی ہے۔ وہ قید سے آزاد ہو کر گھر آتی ہے اور ایک انجان عورت سے ملاقات ہوتی ہے جو اصل میں اسد اللہ کی دوسری عورت یعنی بیوی ہوتی ہے۔ قدسیہ بیگم اس کو دعائیں دے کر اور خود کو اسد اللہ کی رشتہ دار بتا کر ایک انجان اور نامعلوم راستے پر چلی جاتی ہے۔ پیچھے سے اسد اللہ بھاگ بھاگ کر اس کو تلاش کرتا ہے مگر وہ تو اس کی بیوی، گھر والی، زوجہ محترمہ، زندگی کیسا تھی، دکھ سکھ کی ساتھی نہیں بلکہ ایک ذرا سی عورت تھی جو بہت کمزور تھی اور اس کی حیثیت یہی تھی کہ وہ گم رہے اور معدوم ہو جائے۔ اس کی یہی سزا تھی کہ وہ ایک عورت تھی۔ ایک خاتون تھی، ایک بیوی تھی، ایک ماں تھی مگر اصل میں ایک ذرا سی عورت تھی جو آخر کار معدوم ہو گئی۔

واقعی اس ڈرامے میں ایک جیتے جاگتے انسان اور خاتون کو ذرا سی عورت بنا کر خواتین کو اشرف المخلوقات کے نام و مقام پر نیچے دکھا کر بلکہ بہت نیچے دکھا کر اور مان کر تمام مادہ پرست اور دولت پسند افراد و سماج کے منہ پر تمانچہ رسید کیا گیا ہے۔

خالصتاً مزاح اور سنجیدہ طویل دورانیے کے ڈراموں کے علاوہ طنزیہ نوعیت کے ڈراموں میں بھی عورتوں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کراچی مرکز کا طویل دورانیے کا کھیل ''روزی'' (1992ء) اس کی عمدہ

مثال ہے۔ عمران اسلم نے طویل دورانیے کے اس ڈرامے میں شوبز کی دنیا کی عورت کے بارے میں چند منفی رویوں کو موضوع بنایا ہے۔

اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہارون ایک ناکام اداکار ہے۔اس کی صلاحیتوں کو دیکھا جائے تو وہ صف اول کے اداکاروں میں شامل ہونے کے قابل ہے مگر شوبز کے کرتا دھرتا افراد اس کی یہ پوشیدہ اور مخفی صلاحیتیں دیکھنے کی بصارت نہیں رکھتے۔ہارون فن اداکاری میں اتنا ماہر ہوتا ہے کہ وہ ہر کردار میں حقیقت کا رنگ دیکھنا چاہتا ہے مگر پروڈیوسروں کا خیال ہوتا ہے کہ ڈرامہ کو ڈرامہ سمجھ کر ہی پیش کرنا چاہیے اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ڈرامہ آگے بڑھتا ہے۔اس کی ایک دوست شاہانہ جو ایک ڈرامے میں نرس کا کردار ادا کرنے کے لیے منتخب ہوتی ہے۔ہارون اسے ڈائیلاگ بولنے کی ریہرسل کرواتا ہے۔ مگر یہ کردار شاہانہ بے چاری کے بس کا روگ نہیں۔اس موقع پر ہارون کے دل میں ایک خیال آتا ہے۔وہ عورت کا روپ دھار کر ڈرامہ کمپنی کے پاس جاتا ہے۔آڈیشن دیتا ہے اور پھر لوگ اداکار ہارون جو کہ اب مس روزی کا گیٹ اپ اپنا چکی ہے ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔روزی کے خیالات اور ناز نخروں سے متاثر ہو کر اس سے بات بڑھانا چاہتے ہیں۔ مگر مس روزی جو کہ اصل میں ہارون ہے اپنی شہرت اور ذات کی گمنامی اور روزی کی شہرت سے تنگ آکر اپنی وگ اتارتا ہے اور یوں روزی پھر سے ہارون میں بدل جاتی ہے۔مزاحیہ مکالمات اور واقعات سے زیادہ اس ڈرامے میں طنز کا عنصر ملتا ہے۔ہمارے معاشرے کے کھوکھلے تخلیقی رجحان اور عورت سے متعلق منفی رویوں اور سوچ پر لطیف پیرائے میں طنز کیا گیا ہے۔ مس روزی جب ایک چپس کے اشتہار کے لیے کام کرنے جاتی ہے تو اس سے بطور چپس بیٹھنے، کھڑے ہونے،اور گانے کی توقع کی جاتی ہے کیونکہ ڈائریکٹر کے نزدیک یہ عوام کی ڈیمانڈ ہے دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔۔

> ''ڈائریکٹر: آپ سمجھتے کیوں نہیں۔یہ کلائنٹ کی ڈیمانڈ ہے۔آپ کو بیٹھنا بھی ہوگا،اٹھنا اور ناچنا بھی ہوگا،گانا بھی ہوگا۔ہمکمرشل بنا رہے ہیں کوئی سیریس فلم نہیں۔
>
> ہارون :(جھنجھلا کر) یار آپ کے کلائنٹ کی ڈیمانڈ کی وجہ سے میں یہ بے وقوفی کے کام نہیں کر سکتا۔آپ نے کبھی دنیا میں کسی چپس کو دیکھا ہے کہ وہ خود گا گا کر کہے آؤ مجھے کھاؤ۔آؤ مجھے کھاؤ۔
>
> ہارون :سوری I can't do this،This is a bad taste یار۔(جانے کے لیے مڑتا ہے پھر ڈائریکٹر اسے بھاگ کے روکتا ہے)۔

ڈائریکٹر :(التجائیہ انداز میں)دیکھیں آپ یہ رول ادا کرلیں۔اس کے بعد ہم آپ کو ایک اچھاسا رول دیں گے۔۔۔لالی پاپ کا۔

ہارون :(بات دہراتے ہوئے)لالی پاپ کا۔۔۔۔تاکہ بچے مجھے چاٹ چاٹ کر کھا جائیں۔۔۔ایڈیٹ۔''(۱۵)

اسی طرح جب ایک جگہ شوٹنگ میں ڈاکٹر ناصر اپنے سفلی جذبات کی وجہ سے بے وجہ روزی کو چھونے کی کوشش کرتا ہے تو مس روزی اس کی پٹائی شروع کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کہتی جاتی ہے کہ :

''روزی: کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے عورت کو؟

عورت گھر سے نوکری کرنے نکلتی ہے۔

عورت مجبوری کے تحت نہیں نکلتی۔

وہ زمانہ چلا گیا جب مرد عورت کو شکار سمجھتا تھا۔آج کی عورت اپنی عزت کروانا جانتی ہے۔اگر آپ اپنی آنکھوں پر پٹی نہیں ڈال سکتے تو ہمیں بتائیں ہم ان آنکھوں کو نوچ لیں گے۔''(۱۶)

اس ڈرامے میں مصنف نے شوبز سے وابستہ خواتین کے مسائل اجاگر کیے ہیں۔اور بتایا ہے کہ کس طرح معصوم لڑکیوں اور عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کو ذلیل کیا جاتا ہے اور بعض دفعہ انتہا کی حد تک بے لباس بنا کر عریانی اور فحاشی کے کردار کروائے جاتے ہیں اور اس طرح یہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتیں اور اداکاری کے ساتھ ان کا پیشہ طوائف کے کردار میں بدل جاتا ہے جہاں ان کی زندگیاں مزید جہنم بنادی جاتی ہیں۔بہت کم لڑکیاں اس بیہودگی سے بچی رہتی ہیں۔

پی ٹی وی طویل دورانیے کے ڈراموں میں بہت کم مزاحیہ کھیل پیش کیے گئے۔ان میں معیاری ڈراموں کا تناسب بہت کم ہے۔عمران اسلم کا ڈرامہ روزی کی طرح انور مقصود کی لکھی ہوئی تحریر ''ہالف پلیٹ''(1993ء) بھی معیاری طنز و مزاح سے بھرپور ڈرامہ ہے۔مرزا خلیل الدین بریلوی،ان کی بیوی بانو بیگم،بیٹا منصور اور نوکر مولا بخش کی نوک جھونک۔مرزا صاحب کی لطیفہ گوئی اور بانو بیگم کی جلی کٹی باتوں کے درپردہ ہمارے معاشرے کی ایسی حقیقت پر طنز کیا گیا ہے۔جس میں مصنف اور ادیب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں رہی۔ہمارے آج کل کے ادیبوں کی تخلیقیت اور قدرت کلام کھوکھلی اور صرف واہ واہ کا سبب تو بن سکتی ہے لیکن پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔اس ڈرامے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہمارے ادیب و شاعر کچھ اتنے تن آسان اور فراغت پسند ہوگئے ہیں کہ وہ لفظوں سے کھیل کر لفظوں کو کھانا

چاہتے ہیں۔اس ڈرامے میں خاص کر ایک شاعرہ مسز کلیم کے ذریعے ہمارے موجودہ ادبی معیار پر بھی طنز کیا ہے۔مرد جیسی بھی شاعری کرے اس کے لیے مکمل آزادی ہے مگر ایک عورت پر یہاں بھی سماجی پابندیاں لگائی گئی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتی کیونکہ وہ معاشرتی اقدار کی پاسدار ہوتی ہے۔اس کے لکھے ہوئے الفاظ تفریح کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں اور تعصب کی بناپر مرد اس کو کم سے کم تر گردانتے ہیں۔ہمارے آج کے بہت سارے ادیب اپنے تخلیقی معیار پر غور و فکر کیے بغیر سراہے جانے کے خواہ ہوتے ہیں۔انور مقصود نے مسز کلیم اور مرزا صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے ذریعے ان تمام امور پر مزاح کے پیرائے میں تنقید کی ہے:

''(مرزا، بیگم کلیم کی اصلاح کے لیے لائی گئی غزل کا مطالعہ کرنے کے بعد بیگم کلیم سے مخاطب ہو کر)

مرزا:(کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے) بڑی ترقی کی ہے بھئی آپ کے اشعار نے۔ مگر مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ۔

بیگم کلیم:(بات کاٹتے ہوئے) کیوں؟ کیا غزل وزن سے گری ہوئی ہے؟

مرزا: جی نہیں۔یہ غزل وزن سے نہیں البتہ شرم سے گری ہوئی ہے۔

بیگم کلیم: کیا مطلب ہے مرزا صاحب؛ کیا خرابی ہے اس غزل میں؟

مرزا :(دہراتے ہوئے) کیا خرابی ہے اس غزل میں؟۔۔۔(اُٹھتے ہوئے)،ساتوں اشعار ناقابل طباعت، ناقابل سماعت، ناقابل ضمانت؛! ارے اُردو ادب میں کسی مرد نے ایسی شاعری نہیں کی جیسی آپ نے کی ہے۔ارے آپ کے اشعار کے سامنے منٹو کا سارا کام چیونٹا ہے چیونٹا۔اور فہمیدہ ریاض کی شاعری چنا! وہ بھی بھنا! ارے یہ اشعار جرأت کے منہ پر طمانچہ ہیں طمانچہ!

بیگم کلیم : لیکن مرزا صاحب ان ہی ساتوں اشعار نے تو دبئی کا مشاعرہ لوٹلیا تھا۔ سٹیج پر لوگ چیخ چیخ کر، واہ واہ کر رہے تھے۔

مرزا: سنیے! ایسے اشعار سٹیج پر بیٹھ کر نہیں مچان پر چڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔(کاغذات پکڑاتے ہوئے) یہ رکھو۔یہ رکھو۔اس سے پہلے کہ بیگم ان کو دیکھے اور میور دو غزلہ بنا دے۔ان کو اپنے پاس رکھو۔ارے ان اشعار کی اصلاح تو سرکس کے شیر کی طرح ہاتھوں میں ہنٹر مار مار کے کرنی چاہیے اور ہر شعر کے بعد شاعرہ اچک کر اسٹول پر بیٹھ جائے۔

بیگم کلیم :(غصے سے)میں جارہی ہوں مرزا صاحب۔مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی حرکات آپ کی سکنات سے بالکل مختلف ہیں۔میرے شعر گندے نہیں آپ کا مغز گندہ ہے۔معاف کیجیے ''میں آپ کہہ گئی'' تمہارا مغز گندا ہے۔(جانے کے لیے مڑتی ہے)۔

مرزا :(بڑبڑاتے ہوئے)ارے گھٹیا ہوٹلوں میں کھانے کھا کھا کر تمہاری زبان بھی گھٹیا ہوگئی ہے۔مغز سے کیا مطلب ہے؟

بیگم کلیم: خدا حافظ۔

مرزا: ٹھہرو!

(بیگم رک جاتی ہے مگر چہرہ بدستور دروازے کی طرف ہے)

بیگم کلیم: مگر کیوں؟

مرزا: میں تمہارا آخری دیدار کرنا چاہتا ہوں۔پتہ نہیں تم اس کے بعد اصلاح کے لیے آؤ یا نہ آؤ۔

بیگم کلیم :(مڑتے ہوئے)کراچی استادوں سے بھرا پڑا ہے۔(زور دے کر)استاد تاڑو!

مرزا:(سوالیہ انداز میں) تاڑو؟

بیگم کلیم : جتنا آپ مجھے دیکھتے تھے،اس سے آدھا بھی اگر آپ میری شاعری کو دیکھتے تو آج میں صف دوئم کی شاعرہ ہوتی۔اپنا یہ ادبی خلعہ اتار پھینکئے۔بڑے آن بان والے بنتے ہیں۔پلنگ کی بان کی طرح آپ کی آن میں بھی جھول آگیا ہے۔(بیگم کلیم غصّے سے پیر پٹختی باہر چلی جاتی ہے)۔''(۱۷)

مرد کا ساتھ عورت کے لیے صرف خوشیوں اور آسائشوں میں معتبر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس سہارے کی تمنا میں نامعتبری،دکھ درد اور قبولیت کے ہر رویّے کو برداشت کرتی ہے۔ظہور زیدی کا لکھا ہوا ڈرامہ ''سفید لمحے'' میں مرد مرکزی نظام میں عورت کی ازدواجی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس موجودہ تحقیقی باب کو بغور دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایک عورت بنیادی طور پر جس عذاب اور مسئلے سے دوچار ہوتی ہے وہ میل سنٹر پرابلم کا ہے۔واقعی ایسا ہی ہے کیونکہ عصر گزشتہ اور ماضی کی طرح آج کے تعلیم یافتہ زمانے میں بھی یہ چیز زوروں پر موجود ہے۔چاہے زمانہ بعید ہو یا حالیہ حالات،تو ہر گھر و چار دیواری کے اندر میل سنٹر کا نظام قائم ہے۔بے شک میل کا ہونا تحفظ اور حفاظت کی علامت ہے مگر ہر کام،ہر سطح،ہر رُخ اور ہر فیصلے میں میل سنٹر

تسلیم کرنااور ایک عورت کو پسِ پشت ڈالنا کہاں کاانصاف ہے۔ کیااس کائنات اور سماج میں ایک میل ہی سب کچھ ہے، کیا ایک گھر و ملک کو صرف ایک میل ہی چلا سکتا ہے، کیا تمام معاشرتی ذمہ داریوں اور معاشی سر گرمیوں کا مرکز واقعی ایک میل ہوتا ہے ، نہیں ہر گز نہیں بلکہ میل اور عورت گاڑی کے دو پہیے ،ایک گھر کے دو رکھوالے ،ایک بستی کے دو محافظ ،بچے بچیوں کے دو سائبان اور ایک معاشرے ،ملک کے دو بنیادی ستون ہیں اور جب تک ان دونوں کو ہر شعبہ حیات، معاشرت میں برابر برابر حیثیت واہمیت حاصل نہ ہو تب تک کوئی بھی کام ،ذمہ داری، نگرانی، ترقی، کامرانی اور خوشحالی صحیح معنوں میں حاصل نہیں ہو سکتی۔اس لیے ایک عورت کو میل سنٹر پرابلم سے نجات دینا وقت کا تقاضا بھی ہے اور حقوق بشری سے ہم آہنگ آواز بھی۔

بد صورتی اور بد شکلی سے کیا واقعی ایک عورت قصور وار ہے جب نہیں ہے تو ہمارا معاشرہ اس کو کیوں اس معاملے میں سزا کا حق دار ٹھراتا ہے۔ کیا بد صورت عورت خدا کی مخلوق نہیں ہے، کیا یہ بد صورتی مانگنے پر ملتی ہے، کیا اس صورت میں ایک عورت واقعی گناہ گار ہے، جب نہیں ہے تو پھر اس غیر انسانی سوچ کو معاشرہ سے ختم کرنا انتہائی ضروری ہے۔

جہاں عورت اور چیزوں سے باقاعدہ طور پر محروم ہے، وہاں اس کی روایتی، خاندانی، اور شخصی طور پر وراثت سے بھی دور رکھا جاتا ہے۔ وراثت اور جائیداد میں ایک عورت کو آفاقی، زمینی، قانونی اور آئینی طور پر تحفظ دیا گیا ہے مگر ہمارے ہاں عملی صورت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور یوں عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی کا یہ سلوک برسوں سے جاری ہے۔ اگر عورت ملازمت اختیار کرتی ہے تو گھر سے لے کر سماج تک اس کو اچھا خیال نہیں کیا جاتا اور مختلف حیلے حوالوں اور نظر و نظریوں سے اسے تنگ کیا جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ملازمت اختیار کرنے پر ایک بڑا گناہ کیا ہو اور تمام گھر والے اور دیگر افراد اُس عورت کو عجیب عجیب الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

ایک عورت جہاں اور فکروں سے مختلف مسائل کی شکار ہے وہاں جاگیر دارانہ نظام کے ہاتھوں بھی بہت ذلالت بھری زندگی گذارتی ہے، وہاں پر جاہلانہ رسم و رواج اور دیگر فرغونی فیصلوں سے بے چاری عورت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اور تو اور جسمانی استحصال و بدنی ظلم الگ جاری رہتا ہے۔ پاکستانی ڈراموں میں ڈراما سٹیٹس، میری سادگی دیکھ، کیٹ واک، حق دار، کچا گھڑا، پنجرے کے پرندے، تکمیل، دھندلے راستے، ایک تھی صفیہ، ملکہ عالم، مس روزی، ہالف پلیٹ اور زراسی عورت وغیرہ میں ان ہی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مصنفین اور ڈراما نگاروں نے کبھی اشاروں کنایوں اور بعض اوقات پوری تفصیل سے عورتوں کے حوالے سے ان پیش کردہ مسائل پر اظہارات درج کی ہیں۔ اُن کا حاصل کلام یہ بنتا ہے کہ عورت اس سماج اور ملک کی ایک باوقار اور باعث فخر کردار ہے اور جب تک اُس کو تمام تر معاشی اور معاشرتی حقوق فراہم نہیں کیے جاتے اور اُس کو مثبت خطوط پر مبنی تحفظ عنایت نہیں ہوتا

تب تک لازمی کامیابی و خوشحالی ممکن نہیں ہے۔یہ بہت ضروری ہے کہ عورت کو ان نام نہاد اصولوں، بے معنی روایتوں، لاحاصل قاعدوں اور خود ساختہ قوانین سے فوری طور پر اور قانونی لحاظ سے نجات دی جائے اور اس کو زندگی اور سماج سے مربوط تمام مرحلوں اور پر گراموں میں صحیح مقام و کردار ودیعت کی جائے۔تب کہیں جا کر ہمارے ہاں ٹھوس گھرانے، مضبوط بستی، دیرپا ترقی، صحیح تعلیم اور پائیدار امن قائم ہو جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ یونس جاوید، ع پی ٹی وی ڈراما، سٹیٹس www.youtube.com، ۱۸فروری، ۲۰۲۰ء، 10:30am

۲۔ ایضاً

۳۔ وقار عظیم، سیّد، فن افسانہ نگاری، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص۲۹۹، ۳۰۰

۴۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، لاہور۔ ۱۹۲۳ء، ص۱۹

۵۔ گوپی چند نارنگ۔ اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات۔ پور باکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص۳۸۱

۶۔ فاخرہ تحریم، عورت کا المیہ، تخلیقات، لاہور۔ ۹۹۹ اء، ص۵۹۔۵۸

۷۔ خالدہ حسین، بے سر کی عورت، مشمولہ خاموشی کی آواز، مدیران فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص۲۸

۸۔ نسیم انجم بھٹی، چند سوال، مشمولہ ادب کی نسائی تشکیل، صفحہ ۱۰۵

۹۔ عارفہ سیدہ، ڈاکٹر، خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے، مشہولہ عورت زبان خلق سے زبان حال تک (مرتبہ) کشور ناہید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۸ ۱۰

۱۰۔ نورالھدٰی شاہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، پنجرے کے پرندے، www.youtube.com، ۱۸مئی، ۲۰۲۰ء، 11:00am

۱۱۔ اصغر ندیم سید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، ملکہ عالم، www.youtube.com، ۲۶اکتوبر، ۲۰۲۰ء، 10:00pm

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ نورالھدٰی شاہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، ذرا سی عورت، www.youtube.com، ۵ فروری، ۲۰۲۰ء، 3:00pm

۱۵۔ عمران اسلم، روزی، (کراچی مملوکہ سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی کراچی مرکز، ۱۹۹۲ء، ص۸۹

۱۶۔ ایضاً، ۹۹

۱۷۔ انور مقصود، ہالف پلیٹ، کراچی، مملوکہ سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی، کراچی مرکز، ۱۹۹۳ء ص۹۵

باب پنجم:

ماحصل

مجموعی جائزہ، سفارشات اور نتائج

الف: مجموعی جائزہ

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ افراد کی اجتماعی صورت کا نام سماج اور یہاں پر مرکزی کردار عورت ہی ہے۔

یہ عورت فطری، جبلتی، پیدائشی اور قدرتی لحاظ سے آزاد پیدا ہوئی ہے۔ یہ حساس کردار جب سامنے آتا ہے تو پہلی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اب ماضی، حال اور مستقبل کو ٹھوس بنیادوں پر استوا کرنے کے لیے اسی کو پرکھنا اور آگے کرنا ہے۔ یہ عورت نہیں ہے بلکہ ایک فعال کائنات اور توانا کشور ہے جو خود بھی ایک مقام رکھتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی ایک سایہ سے بڑھ کر چھاؤں اور سائبان ثابت ہوتا ہے۔ یہ عورت ایک جیتا جاگتا اور انتہائی اہم فطری اور سماجی انسان ہوتا ہے جو باقاعدہ طور پر ایک مضبوط نظم اور معیاری نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ اگر مقدم ہے تو مقدس بھی ہے۔ اگر اس کو ذمہ داریوں کا آسمان کہا جائے تو یہ بھی اقرار ہو کہ یہی وہ سرمایہ ہے جو انسان وانسانیت کے لیے جلا ہے۔

بد قسمتی سے بعض اشرافیہ اس کی اہمیت کو جانتے نہیں یا اس کو اصل اساس تسلیم نہیں کرتے اور دوسری طرف کچھ روایات کے ماننے والے یا لکیر کی فقیر ہستیاں اس بچی، بیٹی، ماں، بھابھی اور بہن کی حیثیت کو قبول ہی نہیں کرتے۔ یہ عورت پردے، حیا اور تقدس کا اصل نام ہے۔ یہ اپنے فرائض سے خوب آگاہ ہے مگر وہ حقوق کے نام تک سے واقف نہیں ہے۔ ایک فرد سے لے کر قوم تک کو صراط مستقیم اور روشن راہوں سے پیوستہ صحیح کامرانیوں اور خوشیوں کے لیے یہی عورت ریڑھ کی ہڈی جیسا کردار ادا کرتی ہے۔

حالتِ حقیقی یہ ہے کہ عورت کو اب بھی مقام خاص حاصل نہیں ہے اور نہ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ بچی ہے تو صحیح توجہ سے محروم، اگر یہ لڑکی ہے تو پیار بھری نظروں سے دور، اگر یہ جوان ہے تو لاکھوں پردوں اور روایتوں میں قید اگر یہ بہن ہے تو خدمت در خدمت پر معمور، اگر یہ بھابھی ہے تو چشم احترام سے نامانوس، اگر یہ ضعیف اور کمزور ہے تو علاج معالجے اور غم گساری سے نابلد، اگر یہ بیوی ہے تو لاکھ پابندیوں میں اسیر اور اگر یہ ماں ہے تو اکثر دولتِ محبت اور گنج مودت کو پانے میں ناکام۔ ایسا کیوں ہے کیوں کہ اسی عورت کو ہم لوگ صرف ایک مخلوق دیکھتے

ہیں اور اس کے ہونے کو محض ایک خانہ پری سمجھتے ہیں۔ یہی وہ المیہ عظیم ہے جس سے ایک عورت ساری حیات دوچار ہوتی ہے اور اس بے حسی اور غیر انسانی رویے سے وہ ان گنت حقوق سے محروم اور لاتعداد مسائل کا شکار ہے یہ عورت کام کرتی ہے، بچوں اور تمام افراد کی خدمت کرتی ہے، گھر کو خوب سنبھالتی ہے، بچے بچیوں کو پالتی ہے، شوہر اور سب خاندان کو خوش رکھنے میں پیش پیش رہتی ہے۔ ملازمت اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے حوالے سے ہر وقت دوڑتی بھاگتی ہے، اپنے گھر والوں کی حفاظت میں بے مثال ہوتی ہے، قربانیوں کے سلسلے میں دن رات آگے ہوتی ہے، چار دیواری کے تقدس کے لیے ساری عمر جاگتی رہتی ہے، اپنے مکان اور دیواروں کو بنانے اور سنوارنے میں آئے روز لگی رہتی ہے اور خاص کر تربیت کے تقاضوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے زندگی تک کو داؤ پر لگاتی ہے مگر اس فقید المثال کردار اور روش صورت عملی عورت کو اکثر لوگ فراموش کرتے ہیں۔ یہ بنیادی حقوق سے ناآشنا ہوتی ہے اور تعلیم و تعلم سے لے کر صحت و خدمت تک کے تمام مرحلوں میں زیادہ تر تنہا سفر کرتی ہے۔ کیا یہ بڑا سانحہ اور انسانی حادثہ نہیں ہے کہ جو ہستی انسان و انسانیت کے لیے اپنی تمام تر خوشیوں، آزادیوں، رنگوں اور محبتوں کو قربان کرتی ہے تو وہ معاشرے میں ظلم و ستم، بے حسی و بے کاریِ، بربادی و تباہی، محرومیوں، شرمندگی، انانیت و حیوانیت اور کم ظرفی و ناامیدی کی شکار ہے۔

حاصل بحث یہ کہ ضروری ہے کہ ہم عورت کی حیثیت اور اہمیت کو جان بھی لیں۔ اور دل سے تسلیم بھی کریں۔ اگر ان سے فرائض کی تکمیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ تو ان کو قدرتی اور معاشرتی حقوق بھی بروقت برقرار رہے اور فرد سے لے کر پورا سماج آباد و خوشحال رہے۔

اگر کسی جگہ و مقام پر ایک خاص تعداد اور لوگوں کی موجودگی ثابت ہو تو ان کی اجتماعی حیثیت کو سماج اور شمار کو آبادی کہتے ہیں۔ اس کل شکل جسم اور مجموعی صورت کو مختلف ناموں اور اسموں سے پکارا جاتا ہے۔ چاہے اس کو معاشرہ کہا جائے، خاندانوں کا اجتماع پکارا جائے، سماج کے نام سے جانا جائے یا مختلف افراد کی بڑی ٹولی یا گروہوں کی جمع قرار دی جائے بس یہ حقیقت طے ہے کہ جہاں زیادہ تر ایک رجحان، ایک تحریک، ایک نظریے، ایک عقیدے اور ایک اجتماعی سوچ کار فرما ہوتی ہے تو وہ سماج یا معاشرہ کہلاتا ہے۔ عام اور عوامی فکر کے مطابق یہاں کے باسی و باشندے پیدائش تا ممات ایک خاص طریق کار کے تابع ہوتے ہیں بے شک بعض گھرانے ایک الگ سوچ و فکر کے مالک ہوتے ہیں اور زندگی گزارنے کے لیے جداگانہ اسلوب اور ڈھنگ پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر ایسا بہت کم اور خال خال ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں افراد کی تعداد کثرت سے ہوتی ہے اور مختلف الخیال لوگوں کی بسر اوقات ہوتی ہے تو پھر زندگی اور اس سے منسلک مراحل میں مد و جزر اور اونچ نیچ آتی رہتی ہے اور یہاں ایک جم غفیر نظر آتا ہے جس کو عام طور پر سماج بولا جاتا ہے۔ یہ سماج مختلف روایتوں، رواجوں، رجحانوں، تحریکوں، نظریوں اور عقیدوں کی امین ہوتی ہے۔ اس مملکت یا الگ

جہاں میں ہر طبقے اور ہر نسل کے لوگ اور گروہ زندگی بسر کرتے اور صبح شام کرتے نظر آتے ہیں۔اس اجتماع میں گھر، تعلیم، تربیت، اعمال، افعال، مناظر، نتائج، مجموعی صورت حال، سفارشات اور حاصلات کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اس گوشے میں قربت کی باتیں عام ملتی ہیں اور تنہائی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔افراد کی اس جماعت میں بے شک الگ الگ رہنے والے عام و خاص ٹولیاں دور سے پہچان رکھتی ہیں اور خود دکھائی دیتی ہیں مگر نزدیک جانے اور تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پر بہت مشترکہ مفادات، فوائد اور مقاصد صاف صورت میں فعال نظر آتے ہیں، سماج انسانوں سے منسلک اور افراد سے پیوستہ ایک بڑی تعداد ہوتی ہے جس میں بود و باش، کام کاج، روزگار و کفالت، جینے مرنے، زندگی گزارنے، مختلف کرداروں کے نقش و کارنامے، گھروں و چار دیواریوں کے اندر رہائشوں کے اوقات و اطوار اور بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں، دوستوں، محلے داروں اور گاؤں والوں کی حیات کو اچھی طرح پرکھا اور دیکھا جاسکتا ہے۔اس گروہ اور بڑی جماعت میں ہر کردار اپنے کام سے ایک شناخت رکھتا ہے۔عام و خاص کے طریق ہائے حیات کچھ کہانیوں اور کرداروں پر مبنی ہوتی ہیں اور اشرافیہ و شہری لوگ کچھ اور خاصیتوں اور چہروں سے جانے جاتے ہیں۔اسی طرح زبان، ادب، شناخت، تعظیم، احساسفرض، سچ، عبادت اور عمل کی ایک اور بستی بھی قائم ہوتی ہے۔یہاں کے باسی اور رہائشی مختلف رشتوں، حوالوں، باتوں، کاموں، نقوشوں اور صورتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔یوں سمجھیے کہ یہ افراد ایک دوسرے کے بغیر ادھورے اور کمزور ہوتے ہیں۔

بچے بڑے اور جوان بوڑھے گھروں، راستوں، حجروں، مسجدوں، بیٹھکوں، محفلوں، مجلسوں، میلوں، بازاروں، سڑکوں، گلستانوں، میدانوں، گاڑیوں، شادیوں، غموں، اسکولوں، درسگاہوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، مکتبوں، کمروں، چار دیواریوں، دکانوں، انتظار گاہوں، جنازہ گاہوں، مقبروں اور خانقاہوں وغیرہ میں وصال کرتے ہیں۔اسی طرح سیکھنے سکھانے اور لینے دینے کا ایک طویل سلسلہ قائم دائم رہتا ہے اور یوں ان گنت حاصلات، نتائج، سفارشات، مقاصد اور خلاصہ جات کے ساتھ زندگی آگے رواں دواں ہوتی ہے۔ان تمام گزارشات اور ملفوظات کا حاصل یہ بنتا ہے کہ کائنات کے بعد کسی بھی قوم و نسل کی ترقی اور کامیابی کا اصل زینہ ایک سماج ہوتا ہے جہاں مل جل کر زندگی گزارنے کے تمام سلسلے اور مرحلے فعال صورت میں موجود ہوتے ہیں اور مشترکہ مفادات اور فوائد کے حصول سے لے کر ہر قسم حادثات اور حالات کو دیکھا جاسکتا ہے اور زندگی کو حیات جاوداں بنانے میں یہی سماج ریڑھ کی ہڈی جیسا کردار نبھاتا جاتا ہے۔

سچ ہے کہ سماج میں مختلف الفکر اور امتیاز کے ساتھ لوگوں کی آبادی ہوتی ہے اور ان افراد کو سماج ہی ایک پناہ گاہ اور محفوظ سائبان لگتا ہے۔ایک طرف افراد اور دوسری طرف سماج، یوں ان دونوں کا رشتہ بہت مضبوط اور پکا ہے۔اگر غور کیا جائے تو عورت ہی وہ ہستی ہے جو سماج کو اصل بنیادیں اور دائمی چیزیں فراہم کرتی ہے۔

عورت اور سماج کا رشتہ بہت پرانا اور قدیم ہے۔ اگر سماج کے کرتا دھرتا ایک عورت کی اہمیت اور حیثیت کو صحیح مقام اور اعلیٰ مرتبے پر فائز کریں تو پھر تشنگی اور بگاڑ کی تمام صورتیں خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ اصل میں جس طرح ایک عورت سماج کے اندر اپنا کردار نبھاتی ہے اور ہر قسم ایثار کے لیے تیار رہتی ہے، وہ واقعی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ مگر اسی سماج کی اس قدر عظیم ہستی اور بے مثال مخلوق کے لیے صحیح نگہداشت، بہتر تعلیم و تربیت، مثبت علاج معالجہ، ٹھیک روزگار و ملازمت، مضبوط گھر و چار دیواری اور درست خطوط پر مبنی توقیر و تعظیم نہیں ہے۔ یہاں کے باسی اور باشندے اس بنیادی کردار کو محض ایک خام مواد سمجھتے ہیں جو دن رات محنت کرتی ہے اور آخر میں ایک کونے میں رہ رہ کر مر جاتی ہے۔ اس میں دوسری سخن اور رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ عورت اور سماج ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور بے معنی ہے مگر ضروری یہ ہے کہ دونوں کا رشتہ اور تعلق جس طرح کتابوں اور تحریروں میں ہے، اب اگر ان دونوں کے مابین توازن اور مساوات قائم نہ ہو تو پھر خطرہ یہ لاحق ہوتا ہے کہ بندھن اور ناطہ ٹوٹ جائے گا اور نتیجے کے طور پر ترازو کے دونوں پلڑے مکمل طور پر مٹ جائیں گے۔

دیکھئے سماج کے اندر مختلف لوگ رہتے بستے ہیں اور کچھ عام و خاص امور سرانجام دینے اور اپنا کام دھندہ کرتے جاتے ہیں۔ اب اسی کو عام آواز میں معاشرہ کہتے ہیں مگر یہ کام اور پیٹ کا ایندھن بھرنے کے امور تو جانور بھی کرتے ہیں۔ بس بھاگ دوڑ، بچے پیدا کرنا اور شکم بھر لینا پھر انسان اور حیوان میں کیا امتیاز رہ جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک سماج کے ہاں ایسے لوگ اور اس طرح کی رول ماڈل ہستیاں ہونی چاہیے جو اس کے بطن سے لے کر پوری جسامت تک کو ہر قسم خطرات اور منفی اثرات سے محفوظ کریں اور جہاں جہاں غیر انسانی افعال اور انسانیت سے متصادم اعمال موجود ہوں ان کا بر وقت قلع قمع کرے اور یوں اس سماج کو حیوانیت و مکروہیت کے جالوں اور طغیانیوں سے آزاد کر کے یہاں انسانیت اور انصاف کے قوانین و قواعد کو لاگو کرے۔ اب ان افراد میں اعلیٰ حیثیت واقعی ایک عورت کی ہوتی ہے۔ یہ عورت بحیثیت معصوم بچی، جوان لڑکی، بڑی بیٹی، حساس بہن، ذمہ دار بیوی اور سب سے بڑھ کر ایک سایہ ماں اور چھاؤں والدہ واقعی ایک نمونہ ہوتی ہے۔ گھر تا وطن وہ کونسی جائے ہے جہاں اس عورت کے ہونے اور کردار نبھانے سے انکار کیا جا سکتا ہے، وہ کون سا شعبہ زندگی ہے جہاں اس عورت کے دم سے آبادی اور خوشحالی کا دور دورہ نہیں ہے، وہ کون سی قربانی ہے جس میں عورت کا کردار مثالی نہیں ہے، وہ کون سا موقع ہے جہاں عورت آگے کی صفوں میں موجود نہیں ہوتی، وہ کیا کیا مراحل ہیں جہاں عورت کی محنت اور مشقت عیاں نہیں ہے۔ واقعی ایک سماج میں عورت کے ہونے اور موجودگی سے ہر گوشہ آباد اور ہر کونہ خوشحال ہوتا ہے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس قدر بڑی اور بڑھیا شخصیت کو حقیقی طور پر اس حیثیت میں قبولیت نہیں ملتی جو اس کا قدرتی اور سماجی حق ہے۔ عورت کے ساتھ امتیازات کا یہ غیر انسانی فعل برسوں سے جاری ہے دنیا کے جس معاشرے میں جایا جائے اور جہاں جہاں عورت کے نقوش پڑتے ہیں تو انسانی عقل و شعور دنگ رہ جاتی ہے کہ اس قدر خوبصورت اور خوب سیرت ہستی کو قطعاً مقام ابد نہیں حاصل ہے۔ مطلب یہ کہ ہر جگہ فرق و امتیاز کا رویہ، سلوک اور رد عمل اسی عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ انسانی حقوق سے دور ہونا یا ان سے انکار کر دینا ایک تعلیم یافتہ ماحول میں ممکن نہیں ہوتا اور سب جگہوں پر اس قاعدے کو درست اور راست تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر عورت کے حوالے سے کافی کمی بیشی موجود ہے اور دنیا کے قوانین اس سلسلے میں خاصے فعال ہیں۔ مگر افسوس کہ ایسا صرف وقتی، عارضی، کاغذی اور اضطراری طور پر ہوتا ہے اور ان اصولوں اور قاعدوں کا سماجی اور عملی دنیا سے بہت کم جوڑ ہوتا ہے۔

الغرض یہ کہ تاریخ کے اوراق اور علوم سماجیات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سماج جہاں اور لوگوں و کرداروں کے حوالے سے باقاعدہ ایک تنظیم اور انسانی ادارے کا نام ہے وہاں عورت ایک ایسی بنیادی اور دائمی ہستی ہے جس کے بغیر یہی سماج قطعاً نامکمل ہے۔ ان دونوں کا ساتھ اور سایہ جنم جنم کا ہے اور واقعی ایک عورت سماج کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کے ایک ساتھ ہونے اور احساس و احترام کے حوالے سے بڑھنے کی قوت واقعی لازوال بنتی ہے اور انسان و انسانیت کو ترقی نصیب ہوتی ہے۔

یہ بات طے ہے کہ کسی بھی جاندار اور مخلوق سے قوتِ احساس اور طاقت چھین لی جائے یا ان میں قدرتی و معاشرتی لحاظ سے اس چیز کی کمی واقع ہو تو پھر زندگی اور سانس رک جاتی ہے۔ ادب وہ سرمایہ حیات اور دولتِ گفتار ہے جس کی بدولت نزدیکیاں، خوشحالیاں اور روشنیاں مزید بڑھتی ہیں۔ اگر انسانی سوچ سے اور خاص کر دامن انسانیت سے ادب کو الگ کیا جائے تو پھر واقعی ہُو کا عالم پیدا ہوتا ہے۔ اسی ادب سے انسان کو قدر اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ادب ہم کو سکھاتا ہے کہ علم و تعلیم، فراست اور ذہانت، ہوشیاری اور دانائی، عزت و شرافت، کردار و اقرار، سفارشات و حاصلات، ارشادات و ملفوظات، تکریم و تعظیم اور اسی طرح احساسات و جذبات کیا ہیں، ان سے منسلک امور اور مراحل کیا کیا ہیں، ان سے قدروں اور قوموں کی کامرانیاں کس طرح معرض وجود میں آتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ مساوات انسانیت و احترام آدمیت کے تقاضے کیا کیا ہیں۔ کہنے کا حاصل یہ بنتا ہے کہ ادب ایک وسیع لفظ اور انتہائی کشادہ اصطلاح ہے اور اس سے خیر برابر ابھرتا ہے۔

ادب اور عورت اپنی جگہ پر ایک حساس موضوع ہے۔ اگر عورت اور ادب کا رشتہ کمزور ہو، ان دونوں کے مابین فاصلے ہوں، دونوں ہر جگہ پاس و ساتھ نہ ہوں یا ان کی راہیں الگ الگ ہوں تو یاد رہے کہ ہر طرف تشنگی، بے ڈھنگی اور ناتوانی محسوس ہو گی۔ ان دونوں کے سنجوگ سے گھر اور سماج کے تمام حصے جوڑ پاتے ہیں اور ہر سمت آباد و شاد بن جاتا ہے۔

ادب وہ مایہ ہے جو بگاڑ کی تمام صورتوں کو وصال فراہم کرتا ہے۔ عورت وہ سرمایہ ہے جو انسانی زندگی اور معاشرتی حیات کو تکمیل سے ہمکنار کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں کے یکجا ہونے اور قدم سے قدم ملانے اور مساوات و انصاف سے آگے بڑھنے سے وہ گنج ملتا ہے جس کو عرف عام میں حیات جاوداں کہتے ہیں۔

دیکھئے جس طرح جانور اور جاہل زندگی گزارتے ہیں اور برسوں سے خود پرستی اور ذاتی پوجا پاٹ سے صبح و شام کر کے یہاں سے بے نام و بے مرام گزر جاتے ہیں تو ایسے میں وہ لوگ جو ادب کو صحیح معنوں میں اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں اور عورت کو اعلیٰ نظروں اور بہترین قدروں سے نوازتے ہیں تو دوسروں کے لیے مثال اور غیروں کی نظروں میں ان مول ٹھہرتے ہیں۔

دراصل ادب انسان کو ان اندھیروں اور آشوبوں سے باہر نکالتا ہے جہاں انسانی سوچ محدود، رشتے ناتے بے معنی، بات چیت اور گفتگو لاحاصل، علم و فہم کاغذی، عمل و کردار تقریری اور حاصلات و نتائج مادی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہی ادب فکرِ بشر کو وہ قوت عنایت کرتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ موفتِ نفس اور نفسِ مطمئنہ کے حصول کے ساتھ ساتھ تکمیل و تسخیر کائنات کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر چاروں طرف رنگوں، روشنیوں اور خوشیوں کی ان گنت بہاریں اور خوشبوئیں ملتی ہیں، جس سے انفرادیت و اجتماعیت کو امر حالت دستیاب ہوتی ہے۔

ایک طرف ادب کا اتنا بڑا وجود اپنا آپ منواتا ہے اور دوسری طرف عورت وہ جلا ہے جس کے جسم سے اٹھنے والی چنگاریاں و روشنیاں اندھیر نگریوں اور پُر خار دلوں کو محبتوں اور اجالوں کے تحائف دیتی ہے۔ اس عمل سے وہ واقعیدلوں کی دھڑکن اور ذہنوں کی زینت بنتی نظر آتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ادب اور عورت دونوں کا رشتہ فرائض سے بھی ہے اور حقوق سے بھی ہے۔ ان دونوں کے توازن سے وہ ذہنی سطح پیدا ہو گی جہاں کدورت، نفرت، حیوانیت، طوائف الملوکی، بے انصافی، غیر فطری قوانین، کاغذی خیالات، وقتی جوش و جذبہ، عارضی مفادات، اضطراری کامیابیوں اور انا و انانیت کے لیے کوئی مقام اور جگہ نہیں ہو گی۔ اس کے مقابل میں جہاں جہاں بشر کام کرتا ہے یا کسی بھی حیثیت میں کسی بھی جائے پر مصروف عمل ہے تو اس کی سوچ، بصارت، سماعت، زبان، وجدان، احساس اور فعل سے وہ گنج ہائے گراں مایہ دیکھنے کو دستیاب ہو گا۔ جس کو عوام کی بولی اور خواص کی بھاشا میں سرخروئی، ظفریابی، سلامتی، دوستی، خوشحالی، آبادی، بامرادی، فکرِ انسانی، حیاتِ جاودانی، سچائی

اور اخلاقی برتری کہتے ہیں۔ بے شک ادب کے گوشے اور حصے بہت ہیں اور اس طرح ایک عورت کے نقوش و بہروپ بھی کافی ہیں مگر یہاں ان دونوں کی اصلی حیثیت اور دائمی اہمیت کی بات پر زور دیا گیا ہے۔ بظاہر تو ان دونوں کا کام کسی بھی چیز کی حدود کا تعین کرنا اور غور سے دیکھنا ہے مگر ضابطہ حیات کی نشاندہی کرنا، پسندیدہ اطوار کو سامنے لانا، شرم و لاج کی کیفیات کو ظاہر کرنا اور معیاری عادات اور اخلاقی اصولوں کی دریافت وجود کو ممکن بنانا بھی ان دونوں سے وابستہ اسباق ہیں۔ یہ جو عظمت و بزرگی کا پاس رکھنا ہے حفظِ مراتب اور تہذیب و شائستگی کا سوال ہے، الفاظ، معانی اور بیان شناخت کے مراحل ہیں، قاعدہ، تعظیم اور دل پسند تحریروں کے قواعد ہیں، نظم و نثر سے وابستہ تخلیقات ہیں یا خوبصورت عادات و ملفوظات کے گلدستے ہیں، تو کیا یہ ادب نہیں اور یہ کہ کیا ادب کی جسامت اور ریاضت میں ان کا عمل دخل نہیں ہے۔ اس طرح حسنِ اخلاق کی جو صورتیں ہیں، رنگ و نسل اور اقوام کی بندشیں ہیں۔ بنی نوع انسان کو پیام وحدت اور پیغامِ یک جہتی کی جو کرنیں ہیں، زندگی سے ہم آہنگ خارجی اور داخلی شہادتیں ہیں، مسرت بخش اور موثر تخیلی جذبات و احساسات کی لطافتیں ہیں، یہ جو شرافت اور شریفانہ فضائل کی سوغاتیں ہیں، تو ان سب کا ایک بنیادی ناطہ عورت کی ذات نہیں ہے؟ واقعی ان حاصلات اور دونوں کے ساتھ پیوستہ سفارشات کا تعلق بہت مضبوط نظر آتا ہے۔ یہی وہ کرشمات اور فرمودات ہیں جن کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ادب اور عورت کا رشتہ لافانی ہے۔ اگر ایک کا حق ہے تو دوسرا سچ ہے۔ اگر ایک تعلق حقیقت سے ہے تو دوسرے کا رشتہ صداقت سے ہے، ایک جانب اگر فکر و سوچ ہے تو دوسری طرف کاملیت و تکمیلیت ہے، ایک طرف وجدان اور کاشانہفراست ہے تو دوسری جانب فعل و عمل کا سرمایہ ہے، ایک انسان و انسانیت کا مداح نظر آتا ہے تو دوسرا کائنات و تسخیر کائنات کی تصویر دکھاتا ہے۔ بس اس بات سے منہ موڑنا یا اس صراطِ مستقیم سے ہٹ جانا ممکن ہی نہیں اور سر خم تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعی ادب اور عورت کے درمیان تعلق مثالی ہے اور ان دونوں کے رشتے ہی سے وفا اور بقا کا حصول ممکن ہے۔

پریشانی اور حیرانی یہاں جنم لیتی ہے جب اس مہان ہستی عورت کو بے شمار عمومی مسائل اور دیگر مشکلات میں قید دکھایا جاتا ہے۔ یہ عورت جو دوسروں کی خوشیوں اور کامرانیوں کے لیے ہر قسم کی تکالیف اور قربانیاں برداشت کرتی ہے اور کبھی اُف تک نہیں کرتی، وہ روایتی باتوں، رواجی رویوں، گھریلو جھگڑوں، خاندانی لغزشوں، سماجی بدحالیوں، معاشی زیادتیوں، اخلاقی ناانصافیوں، علمی تشنگیوں، نفسیاتی الجھنوں، کرداری منفی سوچوں اور معاشرتی کمزوریوں کی وجہ سے ان گنت عمومی مسائل کی شکار ہے۔ حیرانیاور پریشانی کی بات یہ ہے کہ کسی بھی عملی اور حقیقی سطح پر اس عظیم عورت کا کوئی پرسان حال نہیں ہے البتہ تحریری، کاغذیاور وقتی قدر و منزلت کافی حد تک موجود ہے جو ظاہر ہے کہ دھوکہ اور دغہ بازی ہے۔

ان عمومی مسائل کا تعلق مختلف روایات و رواجات، رجحانات و تحریکات، نسلی تضادات و مفادات، گھریلو اعتقادات و ایقانیات، علاقائی تعلقات و عملیات، صوبائی تصورات و خیالات، ادبی فکریات و ملفوظات، ماحولیاتی اثرات و کیفیات اور بشری حاجات و عادات سے ہوتا ہے جن میں یہ بے چاری عورت بری طرح پھنسی ہوئی ہوتی ہے۔

ان مسائل سے یہ عورت ذہنی، جسمانی، فکری، معاشی، معاشرتی، عملی، تربیتی، اخلاقی اور عملی لحاظ سے بہت کمزور ہوتی ہے۔ عورت سے وابستہ ان مسائل کو خون آشام کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان کے منفی اور بے معنی اثرات سے یہ عورت کسی کام کی نہیں رہتی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان خود ساختہ مسائل کی وجہ سے یہ عورت روز مرتی ہے ایک لحاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جانوروں کے کسی قبیلے سے ہے۔

جب ایک عورت کے لیے لایعنی خاندانی اُصولوں اور سماجی اعمالوں کے ہاتھوں ذلیل ہونے کا رجحان بڑھ چڑھ کر موجود ہو تو پھر وہ صحیح معنوں میں تعلیم و تعلم کی اہمیت اور حصول علم و فہم سے واقعی بہت دور ہو گی۔ وہ اس قدر معصوم ہوتی ہے کہ اس کو یہ پتہ ہی نہیں کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور جس سماج میں وہ رہائش پذیر ہے وہاں اس کی حیثیت کیا ہے، اس عورت کو پہلے ''زنانہ'' کے لقب سے یاد کرنا شروع ہوتا ہے اور گھر والے اس کا ذکر کرنا باعث فخر تسلیم نہیں کرتے دوسری طرف اس کو مخصوص دیواروں اور لوگوں میں ''قید'' کیا جاتا ہے۔ یہ عورت خود ساختہ نسلی و گھریلو قوانین کے ہاتھوں کافی ذلیل ہوتی ہے۔ ساتھ میں وہ ''مرد سنٹر'' کے حوالے سے اور بھی ڈر اور ظلم برداشت کرتی ہے۔ وہ زیادہ تر باہر نہیں رہ سکتی اور نہ بچپن سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوتی ہے۔ جوان ہونے پر اس کو ''چھوٹی'' اور ''لولی'' مان کر خدمت در خدمت پر لگایا جاتا ہے۔ وہ گھر اور سماج کے ہاں تب تک تکریم و تعظیم کے حصول میں فتح یاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ جانوروں کی طرح دن رات اور صبح و شام مسلسل کام و بیگار میں مصروف نہ ہو۔ صحیح علاج معالجے کی سہولیات سے بھی محروم ہوتی ہے۔ وہ جب بیمار ہوتی ہے تو گھر والے ایک دوسرے کو اس کے ساتھ معالج وغیرہ یا خدمت کے لیے ذمہ داری سپرد کرتے ہیں اور خود جانے اور خدمت کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ آخر کار یہ عورت خود اپنے لیے کچھ نہ کچھ کرتی ہے اور یوں وقت پاس کرتی ہے۔ اس عورت کو علم و تعلم کے صحیح مواقع بھی فراہم نہیں ہیں۔ اپنے اور سگے لوگ اکثر یہ کہتے ہیں کہ اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرے گی اور ویسے بھی کل شادی ہو جائے گی تو پرایا گھر ہی اس کا نصیب ہو گا۔ یوں ابتدائی عمر اور نوجوانی میں یہ عورت مختلف مسائل کا شکار ہوتی ہے۔ ایک سچ یہ بھی ہے کہ اگر خاندان والوں میں روایتی دشمنیوں کا سلسلہ ہو تو پھر اس کو ''چڑھاوا'' کر کے اپنی صلح اور اس کی حیات کو ممات کے حوالے کیا جاتا ہے۔ پردے کی نام نہاد باتوں اور برائے نام اصولوں سے الگ زخمی ہوتی ہے اور یوں اس کو ایک طرح سے چار دیواری میں محبوس رکھا جاتا ہے۔

تعلیم و ہنر اور تعلم و تربیت کے سلسلے میں وہ اکثر فراموش کر دی جاتی ہے۔ کسی کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم یا سماج نے کس طرح ایک عورت کو فطری اور بنیادی حق سے محروم کر دیا ہے۔ اس عورت سے بعض علاقوں میں مزدوری کے نام سے بیگار لیا جاتا ہے۔ بے شک وہ بیمار رہے، بری حالت میں گرفتار رہے، موسمی اثرات کی وجہ سے کمزور رہے، ارد گرد سے نشانے پر رہے مگر گھر و گھر والے خوش رہیں اور ان کا شکم بھرتا رہے۔

لباس اور پوشاک کی طرف نظر کریں تو اس لحاظ سے بھی عورت بہت بے کار قواعد کے ہاتھوں رسوا ہو رہی ہے۔ اس بارے باتوں اور مجلسوں کا نہ رکنے والا سلسلہ ہوتا ہے اور یوں عورت ایک حوالے سے ''خالہ اور دایا'' بنی ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچپن میں ''بات'' پکی کی جاتی ہے اور یوں عورت کے احساسات و جذبات سے کھلے عام کھیلا جاتا ہے وٹہ سٹہ میں عورت کو قربانی کا بکرا بنانے کی ایک رسم بھی برسوں سے موجود ہے جس میں ایک عورت کو جانور سمجھ کر دوسروں کے ''اعمال'' سے بگاڑ والی زندگی گزارتی ہے۔ اپنی مرضی تو کیا یہ بے چاری عورت تو ''اُف'' تک نہیں کر سکتی اور یوں گردن سے پکڑ کر ایک ''اصطبل'' کو روانہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ''امتیازات'' کا ایک سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس کو قطعاً وہ مقام و نام حاصل نہیں ہوتا جو ایک مرد اور دوسرے فرد کو حاصل ہوتا ہے۔ بس وہ صرف ''خیالوں'' کی حد تک جا سکتی ہے اور وہاں رہ سکتی ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس کو بات چیت اور اظہار و بیان میں شامل نہیں کیا جاتا۔ وہ سن سکتی ہے مگر خوشی نہیں منا سکتی۔ ایک عورت کو سارا دن گھر میں کام کرنا پڑتا ہے اور گھر والے اس کو ''تابع فرمان'' اور ''خدمت گار'' کہتے ہیں۔ اگر یہ عورت باہر جانا چاہے، اپنے رشتہ داروں کے پاس جانا ہو، پاس پڑوس کسی کام کے حوالے سے جانا ہو یا دیگر عام ضروریات کے لیے گھر سے کچھ اوقات کے لیے رخصت ہونا ہو تو پہلے تو گھر والوں سے اجازت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور سب سے خطرناک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ باہر انسان کے روپ میں جو جانور و جاہل پھرتے ہیں ان سے کیسے محفوظ رہا جائے اور عزت سے مطلوبہ جگہ تک جانا اور پھر شرافت سے واپس آنا کس طرح ممکن بنایا جائے۔ حد تو یہ ہے کہ قرآن خوانی اور سبق دہرائی کے لیے بھی اس عورت کو قدرتی اور پیدائشی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ مروجہ تعلیم اور جدید علوم کا بروقت حصول ایک الگ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ عظیم عورت جہاں اور مسائل کا شکار رہتی ہے وہاں جائیداد اور وراثت میں بھی اس کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔ بس مرد حضرات آپس میں بیٹھ کر یا لڑ کر تقسیم و حصّہ داری کے عمل سے گزرتے ہیں اور خواتین سے نہ رائے لی جاتی ہے اور نہ ان کو اپنے حصے ملتے ہیں۔ رہائشی مسائل الگ سے ہیں۔ عورتوں کو چارپائی، کمرے، پانی، واش روم، کچن، گرمی، سردی، صحیح کپڑے اور سونے جاگنے سے متعلق اور بھی تلخ حقائق موجود ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے بہ ظاہر یہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہوتے ہیں مگر اس قدر یہاں سچائی پائی جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے عورتیں عذاب سے دوچار ہوتی ہیں مگر یہ عورت ہنسی خوشی یہ مسائل دیکھتی اور باتوں

باتوں میں ٹال کر دوسروں کو ''مالامال'' کرتی ہے۔ اگر کوئی عورت دیہات میں ہو تو اس کو واقعی وہاں پالتو جانور سمجھا جاتا ہے۔ وہ گھروں میں ہو تو کام کرتی ہی ہے، کھیتوں زمینوں، دکانوں، کارخانوں، بھٹوں اور عمارتوں میں بھی کام کرتی نظر آتی ہے۔ ایسی عورتیں جھلس جاتی ہیں، شدید بیمار ہو جاتی ہیں، جسمانی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں، صحت و تندرستی کھو جاتی ہیں، اکثر بے آبرو ہو جاتی ہیں، تھکن اور ذہنی پریشانیاں الگ سر اٹھاتی ہیں اور گندی نظروں اور شیطانی فقروں کا ایک اور سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس عورت کے ساتھ برسوں سے انانیت اور بربریت کا سلوک بھی روا رکھا جاتا ہے۔ مختلف حیلے حوالوں اور وسیلے بہانوں سے اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جہاں دیکھو اور تحقیق کرو تو مرد سماج اس عورت کو پے در پے ذلیل کرتا ہے۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک اور فرد تا ایک قوم اس عورت کو مارتا ہی رہتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ عورت واقعی عزت و احترام کی ایک مایہ اور سرمایہ ہوتا ہے مگر کوئی بھی معاشرہ اس خاتون کو صحیح معنوں میں شرم و حیا سے مستفید کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ظاہری طور پر یہی عورت بچی ہے، پیاری ہے، اپنی ہے، دلاری ہے، خوبصورت ہے، خوب سیرت ہے، اچھی ہے، سچی ہے، دوست ہے، شریف ہے وغیرہ وغیرہ مگر یہ سب باتیں اور تقریریں ہیں۔ حقیقت میں اس کو ایک ''گڑ کی بوری'' مانا جاتا ہے کہ ہاتھ ڈال کر میٹھا حاصل کرو اور خود بھی مطمئن رہو اور دوسروں کو بھی چین دو مگر ''بوری'' کونے میں ہو، دور ہو، خراب ہو، اس پر کوئی سایہ اور سائبان نہ ہو، کوئی نگرانی و حفاظت نہ ہو اور کوئی توجہ و نظر نہ ہو، تو کوئی بات نہیں۔ یہی ہمارے ہاں عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے جو واقعی انسان و انسانیت کی سرعام توہین کے مترادف ہے۔

الغرض اور بھی کئی مسائل ہیں جن سے یہ پیاری عورت بری طرح دوچار ہے جن پر آگے جا کر ڈراموں اور کرداروں کے حوالوں سے مزید روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

غربت ایک موذی مرض اور خون آشام کی طرح ہوتا ہے جو خاص کر عورتوں اور خواتین کو زندہ درگور کرتا ہے۔ اسی کے ہاتھوں بچی بچیوں اور لڑکی لڑکیوں کی حیات تنگ اور اجیرن ہوتی ہے۔ غربت سے انسانی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ میں آگ سی لگ جاتی ہے اور اس کی مثال اس طوفان کی سی ہے جو سب کو نیست و نابود کرتا ہے۔ ہمارے گھروں اور علاقوں میں بہتر طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اس عفریت نے کیسے کیسے گھروں اور چادیواروں کو اکھاڑ ڈالا ہے اور کس طرح پیارے دلارے انسانوں کو ہر لحاظ سے کمزور اور حقیر بنا دیا ہے۔ پاکستانی اُردو ڈراموں کے حوالے سے ٹیلی وژن کا کردار ایک حقیقت ہے۔ ان کھیلوں، ڈراموں اور کرداروں میں بڑے بڑے نام وادا کار شامل رہے ہیں جن کی بہتر کارکردگی اور دیگر چیزوں سے جہاں اور حقائق اور صداقتوں کے نقوش واضح ہیں وہاں عورتوں کے سلسلے میں بہت حد تک حقوق اور مسائل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پاکستانی عورت کو کن کن مسائل کا سامنا ہے اور وہ کن کن حقوق سے

ناآشنا ہے۔یہی عورت امتیازی و طبقاتی منفی رویوں کی بھی شکار ہے ۔اگر یہ عورت کمیونٹی ہے،ایک عام قبیلے سے ہے، کوئی قدیم نسل سے ہے، کسی میراثی گھرانے سے ہے،ایک اضافی یا ضمنی گروہ سے ہے، کوئی درمیانی خاندان سے ہے یااور بھی کسی خاص یااشرافیہ نسل سے ہے،تو برابر امتیازات وطبقات کے حوالے عمل ورد عمل کاایک سلسلہ ہوتا ہے اوریوں یہ عورت ایک اور فضول دم وآواز کے ہاتھوں روز روز مرتی ہے۔پاکستانی عورت کے لیے احساس کمتری ایک اور عذاب ہے جس نے اس وجود کو ذہنی،بدنی، عملی اور کرداری لحاظ سے پارہ پارہ کردیا ہے۔یہ احساس کمتری انسان کو جینے نہیں دیتی اور قدم قدم پر یہ مخلوق ہزیمت اور شکست سے دوچار ہوتی ہے۔اگرایک عورت گھر کے اندر ہو یا باہر معاشرہ میں زندگی بسر کرتی ہو مگر جب اس کواحساس کمتری کا علم ہو جاتا ہے تووہ کسی فعل و عمل کے قابل نہیں ہوتی۔اور بس وہ ایک لاش بن جاتی ہے۔پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں بہت سے ایسے کھیل ہیں جوان بنیادی مسائل پر ڈرامائے گئے ہیں۔ان میں ایک ڈرامے کانام ''فہمیدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی'' ہے جس کا تخلیق کار اشفاق احمد ہے۔اس ڈرامے میں ان محرکات ،اسباب،اثرات، عوامل ، کرداروں اور کرداروں کے افعال واعمال پر بھی خوب روشنی ڈالی گئی ہے جن کی وجہ سے غربت ،احساس کمتری اور طبقاتی بنیادوں پر عورتوں سے امتیازی سلوک کا عمل جاری ہے۔یہاں پر زبانی باتوں اور تقریری حوالوں کے ساتھ مختلف لوگوں کے وہ نقوش ظاہر کیے گئے ہیں جو مذکورہ بالا مسائل کو جنم دینے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ان اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جن کی بدولت گھر وگھرانے تباہ ہو جاتے ہیں اور عورتوں کی حیات ختم ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

آگے بانو قدسیہ کے ڈرامے آنکھ مچولی کا ذکر آتا ہے جس میں آئیڈیل کی تلاش،گھرانوں اور کرداروں کی تنگ دستی،رنگ ونسل کے معاملے میں منفی خیالات وفرسودہ روایات،خواتین کے چہروں پر روشنی ورونق نہ ہونا،عورتوں کی جسامت اور انداز میں رنگ ورنگینیوں کی مہرومیت اور شادی کے الٹ پلٹ فیصلے اور ان کے نتائج پر اشاروں کنایوں اور کھل کر بھی بات کی گئی ہے۔مصنفہ نے یہ بتانے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ کس طرح اور کن کن حوالوں سے عورتوں کو کم ترین اور حقیر ترین جان کران کوان دیکھے اور برائے نام اصولوں کے ہاتھوں ذلیل کروانے کا دھندہ جاری ہے۔

اگرایک عورت قدرتی اور فطری طور پر خوبصورت نہیں ہے،وہ دلنشیں اداؤں اور بناوٹی نخروں سے محروم ہے تو اس کا کیا قصور ہے اور جب اسی پاداش میں اس کو جہاں اور مسائل بھگتنے پڑتے ہیں تو واقعی یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔

رنگ ونسل کی تقسیم میں انسان محض عاجز ہے اور یہ مخلوقات کا کام ہر گز نہیں ہے۔یہ ایک آسمانی فیصلہ ہے جس کو من وعن تسلیم کرنا پڑتا ہے۔اس لیے ایک عورت کو اگر اس پر سزا دی جاتی ہے یا قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کو گھر اور

سماج میں حقیر کیا جاتا ہے تو یہ اچھا اقدام اور انصاف پر مبنی برتاؤ ہر گز نہیں اور کم از کم ایک مہذب معاشرے کے لیے یہ سوچ کسی بھی لحاظ سے آسودگی کا باعث نہیں بن سکتی۔

البتہ غربت اور شادی کے فیصلوں میں عورت ایک ایسا کردار ضرور ادا کر سکتی ہے۔ لیکن جہاں عورت پابند روایات ہو جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو، میل سنٹر پرابلم سے سامنا ہو، تعلیم کی کمی ہو، تربیت کا فقدان ہو اور والدین ہی سب کچھ رہے تو پھر عورت کی مثال ایک اپاہج اور معذور فرد جیسا ہوتا ہے۔ جو دیکھتا تو ہے مگر حرکت نہیں کر سکتا ہے اور نہ کچھ بول سکتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس ڈرامے میں بہت گہری نظر سے عورتوں کو مذکورہ بالا مسائل میں قید ظاہر کیا ہے۔

عورت کی آزادی، اولاد کی طرف دھیان نہ ہونا اور خواتین کی رائے و اظہارات پر پابندی جیسے مسائل پر بھی خاصے ڈرامے اور کھیل موجود ہیں۔ اس ضمن میں ''امر بیل'' کی مثال پیش خدمت ہے۔ اس ڈرامے میں بانو قدسیہ نے جن مسائل کو ظہور دیا ہے ان میں یہی چیزیں ہیں۔ ویسے بھی عورت کیا کم ضمنی و بنیادی مسائل کی شکار ہے کہ اوپر سے اولاد کا نہ ہونا یا کم ہونے کی وجہ سے بھی دباؤ کے ہاتھوں مزید کمزور ہو۔ مصنفہ نے ایک نقش یہ بھی آشکارا کیا ہے کہ ہماری عورتوں کے ساتھ جہاں اور زیادتیاں عام ہیں وہاں خواتین کو کسی بھی سطح پر یہ موقع دستیاب نہیں کہ وہ صحیح اور بہتر خطوط پر اپنا مافی الضمیر بیان کریں۔ نیز مرد اس کو پسند ہی نہیں کرتے کہ عورتیں گویائی کریں اور کسی بھی معاملے میں اپنی رائے دیں۔ یہ عورتوں کو نہ سننا اور ان کی رائے کو احترام کی نظروں سے نہ دیکھنے کا جو رجحان عروج پر ہے یہ بھی خواتین کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اوپر سے مزدور عورت اور بیوہ خاتون الگ سے ہزاروں مسائل میں دبی ہوئی ہے۔ مرد کی فوتگی اور کسی مرد کا گھر میں نہ ہونے سے عورت کو لاکھ مسائل کے حل کے لیے در در بھاگنا پڑتا ہے۔ اگر عورت بیوہ ہو، اکیلی ہو اور غربت کی ماری ہوئی بھی ہو تو پھر کیا آسرا رہ جاتا ہے کہ جس کے سہارے وہ زندہ رہے اور بدن کو ڈھانپنے اور پیٹ کا ایندھن بھر سکے۔ ایک المیہ یہ بھی پاس ہو کہ جہاں بیٹی بھی گھر میں ہو اور گھر میں کوئی سہولت و دولت تو کیا کھانے پینے کو کچھ نہ ہو تو پھر اس بیوہ عورت اور اس کی جوان بیٹی کا کیا حال ہو گا۔ یہ مسائل ویسے تو کافی ڈراموں میں ظاہر ہوئے ہیں مگر رعنا شیخ کے قلم سے نکلے ہوئے کھیل ''کچے پکے رنگ'' میں ان مسائل پر خوب گفتگو کی گئی ہے اور واقعی بہترین مناظر، حوادث، پلاٹ اور کردار نگاری اس ڈرامے میں کی گئی ہے۔ ڈرامہ نگار رعنا شیخ یہاں پر ایک ایسی بیوہ خاتون کو دکھایا ہے جو والدین کے سائے سے محروم ہے اور بس اس کی کل کائنات ایک بیٹی ہے۔ یہ دونوں ماں بیٹی ایک چھوٹے سے گھر میں قیام پذیر ہوتی ہیں اور مذکورہ تمام مسائل سے دوچار رہتی ہیں۔ کام، کام اور مزدوری سے یہ خاتون بہت کمزور ہوتی ہے اور اوپر سے ٹھیکیدار اور شہری بیگم کا جھوٹ اور غیر انسانی رویے سے مزید مسائل نے اس تنہا عورت کو بری طرح سے گھیرا ہوتا

ہے کپڑوں کی تیاری اور رنگائی سے یہ خاتون گھر کا خرچہ چلاتی ہے اور جوان بچی کالج میں پڑھتی ہے اور اس طرح بہت سے مسائل سے سامنا کرتی رہتی ہے۔

عمرانہ مقصود اور عامرہ عالم نے مل کر ایک ڈرامہ ''باجی ڈکشت'' کو تخلیق کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عورت بعض اوقات کچھ ساختہ مسائل میں دھنسی ہوتی ہے اور بعض سماجی طور پر اس پر مسلط ہوتے ہیں۔یہ جو احساس کمتری، طبقاتی کشمکش، تعلیم کی کمی اور خاص کر چھوٹی چھوٹی بچیاں جو گھروں میں کام کرتی ہیں ان کے مسائل اور طرح کے ہیں۔اکثر چھوٹے بڑے گھروں اور گھرانوں میں جو طبقاتی اونچ نیچ ہوتی ہے تو اکثر افراد اور رشتہ دار آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔اس سے زندگی کا ناکارہ اور افراد کے درمیان تنازغات جنم لے کر انفرادی حیاتاور اجتماعی زندگی معدوم ہو جاتی ہے۔دوسری طرف یہ چھوٹے چھوٹے بچے اور معصوم معصوم بچیاں مختلف گھروں اور بنگلوں میں کام کرتی ہیں تو وہ ایک اور اندوہ ناک مسئلہ ہے۔اس طرح تلخ حقائق اور سخت قسم کے رویوں سے سامنا ہوتا ہے جن کی وجہ سے واقعی خواتین کی ذاتی اور معاشرتی زندگی وبال بن جاتی ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عملی اور حقیقی طور پر بچوں بچیوں کو ان کے قدرتی، ماحولیاتی، سماجی، اخلاقی، تربیتیاور علمی حقوق دلائیں۔کیا ہو سکتا ہے کہ جس طرح ہماری بچیاں ہیں اور جس طرح وہ بڑی ہوتی ہیں اور جس طرح وہ ناز نخروں اور سہولتوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں تو یہ نظر اور قربانی دوسروں کے لیے بھی ہو، دوسروں کی بچیاں بھی ہماری حقیقی اور سگی اولاد تسلیم ہوں، واقعی صرف کاغذات و زبانوں سے ممکن نہیں ہے۔بتایا گیا ہے کہ اس طرح خواتین اور بچیاں خطرناک مسائل کے دلدل میں برائے نام زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔

معذوری، گھروں میں غیر ضروری مردوں کا داخلہ، بہنوں اور بچیوں کی دیکھ بھال، غریبی، بیوہ عورت اور تعلیم کے نام پر دکھاوے، اس طرح کے مسائل سے اگر ایک کنبہ و گھرانہ دوچار ہو تو پھر کیا ہو گا، کیا اس طرح ایک عورت عزت و شرافت کے ساتھ جی سکے گی، کیا ایک اجنبی مرد اور غیر فرد کے ساتھ ایک کنبے کا کوئی احترام باقی رہ سکے گا، کیا معذوری کی صورت میں بہنوں اور بچیوں کی صحیح نگرانی اور دیکھ بھال ممکن ہے۔کیا سماج کی گندی نظروں اور بے حس و بے غیرت مردوں کے جانوروں والے اشاروں کے ہوتے ہوئے ایک شریف خاندان معاشرے میں سر اُٹھا سکے گا۔کیا ایسے انسانی قوانین اور ان پر عمل ممکن ہے کہ بیوہ عورت کو شرافت و عزت کے ساتھ کس طرح زندگی مہیا ہو، کیا کوئی ایسا آئین ہے جس کی رُو سے معذور گھرانے کو انسان مان کر اعلیٰ مقام سے نوازا جائے۔کیا ایسا دوست حکمران ہے کہ جن کے ہوتے ہوئے بیوی، عورت اور دیگر گھریلو خواتین کو خوشی اور خوشحال زندگی ملے۔نہیں ہر گز نہیں۔اس لیے ڈرامہ نگار نورالھدیٰ شاہ نے ڈرامے ''اب میرا انتظار کر'' میں ایک ایسی بیوہ عورت کو دکھایا ہے جو اس قدر غیر انسانی رویوں اور دوغلی سماجی چالوں سے آئے روز ذلیل ہوتی ہے اور اس کی ایک بیٹی جان دیتی ہے اور دوسری پاگل ہو جاتی ہے۔

واقعی پاکستانی طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے حقوق و فرائض اور خاص کر مسائل کے حوالے سے بڑی تحقیقی کاوش کو سرانجام دیا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت جب بھی اپنے حقوق کی بات کرتی ہے۔ کوئی اہم پیشہ اپناتی ہے اور معاشرتی اور معاشی لحاظ سے وہ جان دار کردار نبھانے نکل پڑتی ہے تو بے شمار نام نہاد تنظیمیں اور انبوہ افراد آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ کیا یہ عورت کا حق نہیں ہے کہ وہ کوئی ملازمت کرے، کوئی خدمت کرے، مقامی یا قومی سطح پر نام و مقام کمائے اپنے آپ اور خاندان کو تحفظ فراہم کرے اور مردوں کے شانہ بشانہ رہ کر کوئی بڑھیا کردار ادا کرے۔ ڈرامہ ''فاؤل پلے'' میں سلیم چشتی نے ایک ایسے کردار عائشہ احسان سے ہمارا تعارف کرایا ہے جو صحافت اور اخبارات سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ صحافی عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے حوالے سے کام کرتی ہے اور بتانا چاہتی ہے کہ کس قدر یہ غیر ذمہ درای سے معمور سماجی فعل اور معاشرتی عمل برسوں سے جاری ہے۔ عورت بے چاری کو کبھی پیدائش کے حوالے سے، کبھی زنانہ نام سے کبھی روایت کے ضمن میں، کبھی لباس اور پردے کی آڑ میں، کبھی تعلم و علم کے نام پر، کبھی خاندان اور نسل کے سلسلے میں، کبھی کام و خدمت کے حوالے سے کبھی ذات و گھرانے کے نام پر امتیازی سلوک اور طرز عمل سے گزارا جاتا ہے۔ کاش اس کو اشرف المخلوقات میں ایک خوبصورت بشر اور خوب سیرت انیس مان کر عزت و احترام سے فیض یاب کیا جاتا اور یوں خاص کر ایک عورت کو ذہنی، بدنی، روحانی، اخلاقی اور عملی لحاظ سے مفلوج نہیں کیا جاتا۔

بس یہ رونے اور چیخنے کا مقام ہے کہ اس قدر عظیم انسان کو کھلے عام معاشرتی حقوق سے دور کیا جاتا ہے اور اس کو اندھیر نگری اور عالم ہُو میں چھوڑا جاتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کو انسان تسلیم کر کے روایتی، رواجی، کاغذی اور تقریری تکریم نہیں بلکہ فطرتی، قدرتی، سماجی، معاشرتی، ادبی، اخلاقیاور خاص کر انسانی حقوق سے عملی طور پر مستفید کیا جائیں اور یوں اس کے ساتھ انانیت اور حیوانیت والا رویہ اور طرز عمل ختم کیا جائے۔ اگر اس بات کو واقعی اپنایا گیا تو پھر ایک عورت اس طرح فضول اور ناکارہ مسائل کی شکار نہیں ہو گی اور نہ سماج کے اندر بگاڑ کی صورتیں بقا حاصل کر سکیں گی۔

بعض جگہوں اور گھروں کے اندر مادیت اور دولت کا ریل پیل زیادہ ہوتا ہے۔ رشتوں اور دوستیوں کو روپے پیسے و وراثت کے ترازو سے تولا جاتا ہے۔ اس دوران لالچ، جھوٹ، بناوٹ اور دکھاوے کا بازار گرم ہوتا ہے۔ ڈرامے ''مقدر کا چقندر'' میں ذکیہ اکبر نے ان مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں جھوٹ در جھوٹ، بناوٹ در بناوٹ، چاپلوسی در چاپلوسی، زبانی جمع خرچ، چرب زبانی اور بہتان در بہتان کو خاصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ گھر اور خاندان کے تمام افراد اپنے

بڑوں کی جائیداد اور وراثت کی باتیں کرتے ہیں اور ایسے میں انسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ عورتوں کو یہاں پر مذکورہ بالا مسائل اور خیالات کے گرداب میں گرفتار دکھایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ہاں اسلامی اصولوں اور انسانی رشتوں کے تقدس پامال نہ ہوتے اور ہم واقعی سچ و حق کے امین، مساوات و انصاف کے نام لیوا، چھوٹوں اور بڑوں کے لیے محبت اور احساس کا گوشہ رکھتے، ایک دوسرے کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور خاص کر کائناتی اور قدرتی قوانین کے ساتھ ملکی اور آئینی قواعد کو ذہنی اور عملی طور پر تسلیم کرتے تو پھر یوں طوائف الملوکی اور اجارہ داری کا وجود نہ ہوتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ گھروں کے اندر اور خاص کر عورتوں کو ان کے جائز حقوق صحیح وقت پر مہیا ہوتے تو اس قدر مسائل در مسائل پیدا نہ ہوتے اور نہ عورت یوں ذلیل و رسوا ہوتی۔ یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ لوگ خواتین کے جذبات و احساسات کو محسوس نہیں کرتے اور صرف اپنا مانتے اور کرتے ہیں۔ عورتوں کے حوالے سے جتنے حقوق نسواں ہیں، یا تو ان کو اہمیت نہیں دیتے اور یا ان کو کسی بھی لحاظ سے مانتے نہیں ہیں۔ جب اس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا ہے تو پھر یہ عورت باہر چلی جاتی ہے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے اپنوں کی بجائے دوسروں پر تکیہ لگاتی ہے یوں ایک ایسا ماحول جنم لیتا ہے جس کے ہونے سے اور بھی خطرناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ ہم لوگ اکثر عورتوں کا ساتھ نہیں دیتے اور ہر جگہ کہتے ہیں کہ خواتین کو ترقی سے ہم کنار کرنا ضروری ہے، عورتوں کو انسانی حقوق ملنے چاہیئں، بچیوں اور لڑکیوں کو صحیح تحفظ ملنا انتہائی اہم ہے وغیرہ وغیرہ، مگر ہم تقریریں اور باتیں کرتے جاتے ہیں اور گھر آکر ''کشمیر فتح کر لیا'' کی سوچ کو ساتھ لے کر پوری طرح سو لیتے ہیں، جس کو واقعی خواب خرگوش سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ کیا یہی اچھا ہوتا کہ ہم اپنی ذات سے شروعات کرتے اور کم از کم اپنے گھر کی عورتوں اور خواتین کا صحیح طور پر خیال رکھتے اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کا پاس اور ساتھ دیتے۔ یوں وہ تنہائی اور خوف سے محفوظ رہ کر بہترین انداز سے اپنے فرائض نبھاتیں اور خوش و خرم زندگی گزارتیں۔

مردوں کی بے وفائی اور دوری بھی ایک گھمبیر مسئلہ ہے۔ اگر عورت کو مرد کے بغیر یا خاتون کو کسی مرد کے علاوہ زندگی ملے تو یقینی طور پر وہ ادھوری اور نامکمل ہوگی۔ اس معاملے میں عورت خاصے مسائل کا شکار ہے اکثر مرد حضرات باتونی اور جھگڑالو ہوتے ہیں اور خواتین کو وفا اور محبت کے نام پر ان گنت مسائل تحفے میں دیئے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ حالات اور حادثات بھی آتے ہیں جن کی وجہ سے مرد کو کچھ مجبوریاں گھیر لیتی ہیں، مگر مشاہدے سے ثابت ہے کہ عورت بے چاری اکثر مردوں کی جفا اور دغا سے تنگ آکر کچھ سے کچھ کر جاتی ہے اور اپنی زندگی کو اس عمل سے لہولہان پاتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرد خواتین کو جذباتی بنالیتا ہے اور اپنا رنگ و روپ دکھا کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے، کیا یہ توہین بشر نہیں ہے، کیا اس کو انسانیت کہنا بجا ہے، کیا ایسا کرنا غیر اخلاقی فعل نہیں ہے، کیا اس عمل کو پسندیدگی

کی نظروں سے دیکھنا درست ہے، واقعی یہ ایک قبیح سوچ اور بد عملی کی مہر ہے جس سے عورت کی باقاعدہ تذلیل کی جاتی ہے۔اس فکر سے نجات اور عورت کو حیوان جاننے کا رجحان اب ختم ہونا ضروری ہے۔ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو اس طرح کی مودت اور پیت ملے کہ وہ ہر دم خوش و خوشحال ہو اور ظاہری و باطنی دونوں لحاظ سے فتح یاب بنے، مگر افسوس ہمارے سماج میں ایسی سوچ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پسند کی شادی یا دوسری شادی ایک عورت کا بنیادی حق ہے جو برسوں ہوئے اس سے چھینا گیا ہے۔ایک عام خاتون سے لے کر اعلیٰ طبقے کی عورت تک، ایک ان پڑھ عورت تا تعلیم یافتہ عورت اور غریب عورت کی سطح سے لے کر اشرافیہ تک کی عورت کا ایک فکر، ایک فراست، ایک رجحان، ایک اُڑان، ایک نظریہ اور ایک عقیدہ ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ زندگی گزارتی ہے۔تو کیا وہ اپنی اصلی زندگی اور حقیقی گھر بلکہ جنت کے لیے اپنی پسند کا اظہار نہیں کر سکتی۔بالکل کر سکتی ہے۔یہ اس کے انسانی اور قانونی حقوق میں شامل ہے۔مگر ہمارے سماج کے نام نہاد ٹھیکیداران اور بناوٹی مہربان اس سوچ کو بُرا سمجھتے ہیں اور یوں اپنی لڑکیوں اور بچیوں کی زبان بند کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ہونا تو یہ چاہیے کہ لڑکیاں اپنی چاہت اور ضرورت کے تحت کھل کر اظہار خیال کریں مگر ایسا ہو، یہ ناممکن لگتا ہے۔

پسند کی شادی یا دوسری شادی سے اکثر خواتین کی زندگی سخت مشکلات کا شکار ہوتی ہے اور وہ ایک طرح سے آویزاں حیات گزارتی ہے۔اس طرح گوشت پوست اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ایک آزاد انسان کو قید کر کے انسانیت کو شرمانے کا کاروبار عروج پر نظر آتا ہے۔اوپر سے خواتین ایک اور قبیح فکر سے تنگ ہیں، اگر کسی عورت کو طلاق ہو جائے یا وہ اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جائے تو پھر مداری لوگ میدان میں نکل کر تماشہ شروع کرتے ہیں۔یہ ظالم لوگ اور جاہل افراد اتنا تو کر نہیں سکتے کہ طلاق یافتہ عورت کو کوئی سہارہ یا سائبان بنا کر دیں، الٹا ہنسی مذاق اور گندی باتوں سے اپنے آپ کو قوم کے ہیرو اور معاشرے کے لیڈر مانتے ہیں جو کہ اصل میں مملکت و کشور کے سرعام دشمن ہوتے ہیں۔اگر کوئی ایسا واقعہ عورت کے ساتھ پیش آئے تو اس کی حمایت میں بولنا چاہیے اور اس کو احترام و تعظیم کے ساتھ زندگی گزارنے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے مثبت مواقع دینے چاہئیں اور یوں وہ سر اُٹھا کر دوسروں کے شانہ بشانہ آگے بڑھے اور زندگی میں کامرانی ہی سے ترقی کرے۔

انور مقصود نے ڈرامہ ''اماں'' میں ضعیف اور بوڑھے والدین، اولاد کی لاپرواہی اور بڑوں کے حوالے سے کوئی ذمہ داری نہ لینے کی بات کی ہے۔یہ کس قدر شرم اور ڈوب کر مر جانے کا مقام ہوتا ہے کہ کمزور والدین اور خاص کر بوڑھی ماں اور عمر رسیدہ خواتین کا کوئی غم گسار اور پُرسان حال نہیں ہوتا، کس قدر تکالیف اور مشکلات برداشت کر کے ماں باپ گھر اور اپنے جگر گوشوں کی خوشی کے لیے دن رات ایک کرتے ہیں اور پھر ایسا مرد کردار نہیں ہوتا جو ان کا صحیح

خیال رکھ سکے۔ اکثر عورتوں اور خواتین کی خدمت اور دیکھ بھال سے اولاد نالاں ہوتی ہیں اور بہت کم وقت نکال کر ان پر نظر کرم ڈالتے ہیں۔ ایک والدہ اور عورت اپنی زندگی کی تمام خوشیاں اور رنگینیاں قربان کر کے اولاد کو بڑا کرتی ہے اور ہر قسم کے دکھ تکلیف اور غم والمیہ سہہ کر ان کو آسانیاں دیتی ہے، مگر یہ مادی اور کاغذی دنیا اور یہاں کے باسی پھر اس عظیم ماں اور اعلیٰ خوبیوں کی مالک عورت کو بھول کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ کاش ہم سب اور موجودہ نسل اس گمراہ سوچ کو ختم کر دیں اور تمام عورتوں اور عام خواتین کو صحیح تکریم سے نوازنے کے ساتھ ان کا صحیح خیال رکھیں اور کبھی بھی انھیں تنہائی کا احساس نہ ہونے دیں۔

روایتی شادی، مشترکہ خاندان اور ایک ہی چار دیواری میں زندگی گزارنا خواتین کے لیے ایک اور عذاب سے کم نہیں ہے۔ روایتوں کے پُجاری لوگ اپنی بیٹیوں اور بچیوں کے جذبات اور احساسات سے سر عام کھیلتے ہیں۔ وہ یہ سوچ رکھتے ہیں کہ یہ طریقہ ہمارے بڑوں کا ہے۔ ہمارا خاندان ایسا ہے اور ویسا ہے اور ہم دوسروں سے امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ سوچ جدید عصری تقاضوں کے خلاف ہے۔ ضروری یہ ہے کہ شادی جیسے بڑے فیصلے میں بچیوں کی آراء کو لازمی لاگو کیا جائے ۔ اگر اس طرح یک طرفہ فیصلے اور روایتی رشتے بنائے گئے تو یہ ایک خانہ پُری ہو گی اور حیات و ممات میں نام کا فرق رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ عورتوں کو مشترکہ خاندان میں رہ کر ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی، تعلیم و تربیت، علاج معالجہ، لباس و بعام اور نکاح کے مرحلے تک عجیب عجیب صورتحال بنتی بگڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں پر عورت کو جینا اور چیخ چیخ کر مرنا پڑتا ہے۔ افراد کے زیادہ ہونے سے زندگی سے وابستہ سہولیات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ یہ میرا ہے، یہ میرا ہے، ایک ایسا نعرہ ہے جس سے مشترکہ خاندانی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ عورتیں اور خواتین اس سسٹم میں اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں اور ان کو ایسے ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ روح تک کانپ جاتی ہے۔

مخلوط تعلیمی نظام الگ سے ایک عجیب چیز ہے۔ تجربات اور مشاہدات سے یہ نتائج ملتے ہیں کہ ایسا نظام اسلامی معاشرے میں فلاح و بہبود کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اصل میں وہ سوچ ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی ہے جس کو احترام آدمیت اور مساوات انسانیت کہتے ہیں۔ خواتین اور لڑکیوں کو جن تکالیف کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور وہ جن مراحل سے گزر کر اسباق و تعلیمات حاصل کرتی ہیں وہ اپنی جگہ پر ایک کرخت صورت اور تلخ حقیقت ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کا پڑھنا اور آگے بڑھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں قدم قدم پر بھیڑیے نما انسان موجود ہوتے ہیں جو اپنی حیوانیت اور انانیت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ حق بات ہے کہ اکثر لڑکیاں اس مشترکہ تعلیم نظام کے تحت زندہ درگور ہوتی ہیں اور وہ ایک طرح سے اپنی زندگیاں ہار جاتی ہیں۔

ایک طرف بڑوں اور مردوں کے فیصلے اور دوسری طرف گھر و گھرانے کے مرد حضرات کے گھناؤنے محرکات کے نتائج ایک خاتون کو بھگتنے سے ایک جاہل سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ خاندان کا کوئی مرد غلط اور بدخوئی کا مرتکب ہو تو اس کو ذمہ دار ٹھہرانے کی جگہ گھر کی کسی خاتون کو قربانی کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی گھر یا سماج جاہلیت اور گمراہی میں بلند سطح پر ہو تو پھر ایسا کرنا اور اس طرح کی سوچ اپنانا ٹھیک ہوتا ہے لیکن جہاں علم و فہم اور تعلم و تعلیم کی بہتات ہو، دانش و بینش اور فراست و ہوشیاری کی حکمرانی ہو اور خاص کر انسان و انسانیت کی بقا کے لیے قانون و آئین موجود ہو اور پھر بھی ناکردہ گناہوں کی سزا ایک خاتون کو دی جائے تو پھر اس گھرانے، خاندان اور ملک پر افسوس ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مشق بشر و بشریت اور عزت انسانیت کے خلاف ہے لہٰذا اس کو بند بلکہ ختم کرنا ضروری ہے اور اپنی عورتوں اور پرائی خواتین کو اس مرد عذابی سوچ سے نجات دینی چاہیے۔

ہمارے ارد گرد جہاں عورتوں کی بربادی کے تماشے جاری ہیں وہاں مردوں کی بے غیرتی و ضمیر فروشی بھی عروج پر ہے۔ اکثر خواتین کو اپنے مرد باہر جانے اور پھرنے کی اجازت دیتے ہیں اور ان کو کمائی اور روزی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ کیا یہ افسوس اور صد افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ایک اصلاحی معاشرے میں مرد اس طرح کی شیطانی، طاغوتی، بے غیرتی اور بے حسی سے معمور سوچ کا بیانگ دھل مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی عورت خود اس دلدل میں دھنسی ہوتی ہے تو ان کو عبرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور جب اپنے مرد خود اپنی عورتوں کو اس عذاب سے دوچار کر دیتے ہیں تو پھر لاچاری اور بے روزگاری کا کہہ کر بے حیائی کا سر بازار اقرار کرتے تھکتے نہیں ہیں۔ واقعی یہ دھندہ اور کاروبار جاری ہے اور عورتوں کو اس لحاظ سے بھی بہت سارے مسائل اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ماڈلنگ اور ماڈرن ازم کے نام پر عورتوں کی بے حیائی اور بے شرمی کی ایک اور سوچ بھی موجود ہے۔ یہ اس قدر شرمناک کام ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی گھر و گھرانہ آسودہ حال اور عزت دار نہیں کہلایا جاسکتا۔ یہ کام دھندہ جدیدیت کے نام پر جاری ہے اور عورتوں کو ننگا کر کے اور بے لباس بنا کر ظاہر کرنے کو ماڈلنگ کا نام دیا جاتا ہے اس گھناؤنے فعل سے واقعی ایک عورت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور جب شباب اور جوانی کی عمر ڈھل جاتی ہے تو پھر کوئی پوچھنے والا اور ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔

خدمت اور ملازمت پیشہ خواتین کو بھی بڑے مسائل برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ گھر سے بروقت نکلنا، بازاروں اور سڑکوں سے صحیح سلامت گزرنا اور دفاتر وغیرہ میں عزت اور شرافت کے ساتھ فرائض منصبی پورا کرنا اور مقررہ اوقات میں واپس گھر پہنچنا ایک دل خراش مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں خود کو محفوظ رکھنا، اپنا کام بروقت

کرنا،اپنی عزت اور وقار کو سنبھالنااور لوگوں کی غلاظت بھری نگاہوں اور طنزیہ باتوں سے بچنا بہت دل گردے کا کام ہے اور یہ بے چاری عورت ان تمام مراحل اور حقائق سے باقاعدہ ایک جوڑ رکھتی ہے۔

اس طرح ملازمت پیشہ خواتین کو بہت کچھ سہنااور دیکھنا پڑتا ہے اور مختلف کمزوریوں اور ضرورتوں کے تحت یہ عورت خاموش رہ کر صبح وشام کرتی رہتی ہے۔

عورت کے ساتھ جاگیر داری نظام اور کم عمری کی شادی سے منسلک مسائل بھی ہیں۔اول کے ہاتھوں تو عورت کو گھر کی لونڈی خیال کیا جاتا ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جاگیر داری نظام میں ایک عورت کو کسی وقت بھی مرد کے حوالے کیا جاتا ہے۔ جہاں اگر عورت حکمران ہے یا محکوم تو لاتعداد چھوٹے بڑے مسائل کے ذریعے ہر وقت ڈر،احساس برتری یا احساس کمتری، تنہائی اور لب بندی اور زبان بندی کی شکار رہتی ہے۔ نیز کم عمری کی شادی سے عورت کی زندگی ملیا میٹ ہو جاتی ہے وہ تو کسی کام کی نہیں رہتی اور ایک جانور کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر روانہ کی جاتی ہے۔ یہ اس قدر ذلیل رسم ہے کہ اس سے عورتوں کے تمام خیالات اور احساسات آہستہ آہستہ دفع ہو جاتے ہیں اور وہ کسی ایک حیوان کی مانند رہ جاتی ہے جو پیٹ پالتی ہے اور بچے پیدا کرتی ہے۔

اکثر ڈرامہ نگاروں نے مشترکہ موضوعات پر قلم اُٹھا کر عورتوں کو درپیش مسائل کی عکاسی کو ممکن بنایا ہے۔ بدصورتی ،وراثت،دولت،بے اولادی،شادی بیاہ،خدمت و ملازمت، میل سنٹر پرابلم اور طلاق جیسے مسائل کو خوب اُجاگر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور مسئلے کو بھی انسانیت سے متصادم جان کر تشت از بام کیا گیا ہے۔ جہیز اور سازوسامان کی کثرت ہو تو عورت محفوظ اور اگر نہ ہو تو خاتون بے چاری غیر محفوظ۔ پتہ نہیں ہم کس طرح جی رہے ہیں اور کس چیز کے پیچھے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔اپنے گھر میں بیٹیوں اور بچیوں کی پروا بھی نہیں کرتے اور دوسرے لوگوں کی عورتوں سے بہت ساری چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت اب شکست خوردہ ہے اور مادیت کو ظفریابی کی سند سمجھا جاتا ہے۔اگر ایک عورت شادی کے نام پر ڈھیر سارا جہیز اور سامان لاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو مختلف حوالوں اور بہانوں سے تنگ کر کے اور کبھی مار مار کر اور آخر کار طلاق دے کر اپنے گھر سے باہر کیا جاتا ہے،یوں ہماری جاہلیت عروج پر جا کر ہم کو فتح یاب اور عورت وانسانیت کو پاتال میں گرا کر ہزیمت دی جاتی ہے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل شکست اور شرمندگی اس مرد اور سماج کے لیے ہے جو مخلوقِ خدا کو یوں سربازار نچاتے ہیں اور بربریت کی انتہا کر دیتے ہیں۔

حاصل کلام یہ بنتا ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں مختلف قلم کاروں اور فن کاروں نے انتہائی احتیاط اور مہارت سے عورتوں کے حوالے سے تمام تر مسائل اور تکالیف کی خوب تصویریں پیش کی

ہیں۔اس کے لیے مختلف محرکات اور مراحل کو انتخاب کر کے سچ و حق پر منحصر صداقتوں اور زمینی سچائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔اداکاروں کی اداکاری اور فن کاروں کی فنکاری کمال کی ہے اور ہر مصنف اور مصنفہ کے ساتھ تمام اداکاروں نے اپنے کردار کا حق ادا کیا ہے۔کمال کی بات یہ ہے کہ وہ خواتین مسائل جو موجود تو تھے مگر یا تو گم ہوئے تھے یا ان کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ان پر کچھ کہنا یا بولنا ناممکن تھا،ان ہی ڈراموں میں ان گھریلو، معاشی، سماجی، علاقائی یا قومی مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا اور پوری دنیا پر واضح کیا گیا کہ حقوق نسواں کے نام پر کون سا کھیل جاری ہے اور زمینی حقائق کیا کیا ہیں۔تقریری اور کاغذی قوانین میں خواتین کے بارے میں کیا کیا بولا اور بنایا جارہا ہے اور حقیقی و عملی دنیا میں عورتوں کا کیا حال ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جس دین کے پیروکار ہیں تو اس کو مد نظر رکھ کر خواتین کو ان کے حقوق بر وقت دلادیں اور جس ریاست اور مملکت کے ہم باسی ہیں تو وہاں کے قانون اور آئین کے مطابق عورتوں کو ان کے تمام بنیادی حقوق فراہم کریں۔انفرادی واجتماعی طور پر یہ عورت جن مسائل کی شکار ہے اور ہماری خواتین ان مسائل کی وجہ سے جس طرح برے حالات کی شکار ہیں تو ان پر غور کیا کریں۔ان کے خاتمے کے لیے رول ماڈل کا کردار ادا کریں اور قدرتی و ملکی اصولوں اور قواعد کو زیر غور لا کر بلا تفریق تمام عورتوں اور خواتین کو ان کے حقوق فراہم کریں اور یوں ان کو چھوٹے چھوٹے تمام مسائل سے چھٹکارہ دلا کر سکون و چین اور عزت و شرافت کی زندگی کے مواقع مہیا کریں۔

ب۔ نتائج:

اس تحقیقی کاوش سے جہاں اور نتائج نے ظہور پایا ہے وہاں یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی ہے کہ کسی بھی کشور میں اگر ایک طرف بہت سے ادارہ ایک عورت کی حیثیت اور اہمیت کے لیے کام کر رہے ہیں تو وہاں پر موجود اور متحرک نشریاتی ادارے بھی اسی ضمن میں خاصے فعال ہوتے ہیں۔

سر زمین پاک میں پاکستانی ٹیلی وژن نیٹ ورک بھی ایک ایسا ہی ٹھوس طرز عمل ہے جس کے مختلف پروگرامز اور منصوبوں کے زریعے عورت کی بنیادی کردار اور توقیر کو خوب اجاگر کیا جاتا ہے۔پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اردو ڈراموں میں بھی بڑھ چڑھ کر ایک عورت سے منسلک متفرق حقوق، عام و خاص فرائض، گھریلو و مقامی مسائل، عوامی و قومی مشکلات، روایاتی و خاندانی کمزوریوں، علمی و تربیتی دشواریوں، شادی بیاہ و نکاح کے اقدامات اور ملازمت وغیرہ کو خوب بیان کیا گیا ہے۔ان ڈراموں میں جزوی ،اشاراتی،اجمالی ، تفصیلی، کرداری، نظریاتی، رومانوی، کلاسیکی، حقیقی،اضطراری، وقتی، دائمی، نفسیاتی، اعمالی، ماحولیاتی، روایاتی، ادبی، سماجی، اخلاقی، تربیتی، فقیری، انسانی، امیری، خاندانی، دوستی، دشمنی، غم گساری، معیاری، دانش وری اور دیگر بہت سی موضوعات، حوالوں اور مواد سے ایک عورت کی سالمیت سے ہم آہنگ تمام حالات اور واقعات کو دکھایا گیا ہے۔بتایا گیا ہے کہ عورت محض ایک جسم و بدن کا نام ہر گز نہیں

ہے بلکہ یہ ایک جیتی جاگتی مخلوق اور ایک اعلیٰ انسانی منشور و دانائی سے آراستہ ایک کامل نظام ہے جس کے مرہون منت کائنات بھر میں زندگی رواں دواں ہے اور ہر طرف رنگوں، خوشبوؤں، خوشحالیوں اور کامرانیوں کی پوری دنیا آباد ہے۔

بے شک پاکستان ٹیلی وژن نیٹ ورک کو جہاں اور اعزازات حاصل ہے وہاں اس کو یہ امتیاز بھی فراہم شدہ ہے کہ اس کے دیگر پروگراموں اور خاص کر اردو کے طویل ڈراموں میں عورتوں کے بنیادی حقوق کی عکاسی کے حوالے سے کافی کام ہوا ہے۔اس سلسلے میں مختلف کرداروں، رشتہ داروں، خیالوں اور منظروں سے خوب کام لیا گیا ہے اور عوام و عوامی نمائندوں، حکومت و حکومتی ہستیوں، گھر و گھریلو سربراہوں، انتظام و انتظامی لوگوں اور قانون و قانونی مشیروں کو کھلے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایک عورت کیا ہے، وہ کس طرح زندگی گزار رہی ہے اور ہماری انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ واقعی یہ زاویہ نگاہ ایک عالمگیر فکر سے تعبیر انسانی آواز کے مترادف ہے کہ اس طرح ایک عورت کو بنیادی حقوق میّسر ہوں گے اور اس کی حیات سے بہت حد تک محرومی و مایوسی ختم ہو جائے گی۔

ان ڈراموں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عام ان پڑھ گنوار عورت سے لے کر پڑھی لکھی سمجھ دار عورت تک، ایک غریب گھرانے کی عورت تک وغیرہ کی زندگی اور گزر بسر کو بہترین ہدایت کاری و حکمت عملی سے ظاہر کیا گیا ہے۔اس عورت کو جس طرح عام عمومی مسائل نے گھیر رکھا ہے اور چھوٹے چھوٹے جزوی دشواریوں نے جس طرح ان کی سانسوں کو محدود کر رکھا ہے ان کی بھی اچھی طرح رونمائی کی گئی ہے۔ان طویل اردو ڈراموں میں یہ بھی ناظرین کے سامنا آشکارہ کیا گیا ہے کہ ایک گھریلو، مقامی اور قومی عورت کو کن کن معاشی مسائل نے قید کر رکھا ہے اور وہ کس طرح ان معاشی مشکلات سے دربدر اور گھر گھر کی ٹھوکریں کھانے اور سختیاں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔

الغرض یہ حق ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن کے طویل اردو ڈراموں میں عورتوں اور مختلف طبقوں کی خواتین کو جن عمومی، بنیادی، گھریلو اور معاشی مسائل نے بد حال کر دیا ہے اور مختلف مشکلات و دشواریوں نے جس طرح عورتوں کی حیات کو غم انبوہ سے سلجوگ عطا کیا ہے اُن کو انتہائی آسان اور جامع تحریروں سے عام و خاص لوگوں کے سامنے ظاہر کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ مقامی اصلاحی اداروں، قومی، قومی فلاحی تنظیموں، بین الاقوامی قانونی مشیروں، حقوق نسواں کے علمبرداروں، انسانی حقوق کے ادیبوں اور دانش و بینش کے مفکروں کو بھی اس طرح راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ وہ تحریری و تقریری محنت کے ساتھ عملی و قانونی پیش رفت کو ممکن بنائیں اور یوں دنیا کے ہر گوشے میں ہر طبقے کی عورت کو احترام آدمیت و مساوات انسانیت کے پیش نظر صحیح مرتبہ و مقام سے خوگر کیا جائے۔

بعض لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر سماج کو جزوی نظام سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی بنیادی حیثیت اور کرداری اہمیت سے روگردانی کر کے اجمالی اور اضطراری خیال کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتے ہے کہ سماج ایک مکمل

قاعدے اور اکمل قانون کا نام ہے جس کے ہوتے ہوئے ہر فرد کو زندگی گزارنے، انفرادیت و اجتماعیت کو فروغ دینے، جزوی خیالات اور کلی ملفوظات کو ذہن نشین کرتے ہوئے آگے بڑھنے، انتظام ربط و رابطہ کا استوار کرنے، اعمال و افعال کو مقررہ اوقات میں سرانجام دینے، فرائض و حقوق کو جاننے اور سمجھنے، چھوٹے بڑے اور بڑھیا بوڑھے کو صحیح تکریم سے نوازنے، شخصی و مجموعی ذمہ داریوں کو مثبت خطوط پر ڈالنے، ایک دوسرے اور اپنے رائے سے بھائی بندی اور رشتہ داری نبھانے، فطری، پیدائشی، علمی، نسلیاور اخلاقی قدروں سے آشنا ہونے اور ان کو عام کرنے، گھریلوں، مقامی اور قومی فرائض سے مستفید ہونے اور اپنا اپنا کردار ادا کرنے، مختلف روایتوں اور رواجوں سے جوڑ اور سنجوگ بنانے اور انسان و انسانیت سے وفا اور بقا کے لیے بڑھ چڑھ کر عملی کام کرنے کے ابدی مواقع میّسر آتے ہیں۔اس لیے انسانی زندگی کو حیاتِ جاوداں عطا کرنے میں جہاں اور نظاموں، اداروں اور اصولوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہاں ایک دائمی حیثیت سماج کا بھی ہے جس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

معرفت اور فراست سے معمور سماج میں مرکزی کردار بے شک ایک عورت کا ہوتا ہے۔اب ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک عورت کا رتبہ و مرتبہ قبول عام کا سند رکھتا ہو اور ایک چار دیواری سے لے کر بین الاقوامی سطح تک اس عورت کی باقاعدہ ایک نظام تکریم واضح ہو۔جب زبانی و تحریری اعتبار سے ایک سماج کے اندر عورت کی پاکیزگی اور خوشحالی کا نمونہ اور ہدیہ خداوندی خیال کیا جاتا ہے تو پھر لازم ہے کہ اس عورت کو عملی و قانونی طور پر بھی وقار اور عزت کا تحفظ حاصل ہو۔قدرتی و فطری لحاظ سے ایک عورت کو پیدائشی حقوق باقاعدہ حاصل ہے مگر بعض نام نہاد شخصی و خاندانی قاعدوں نے اس عورت کو دیوار سے لگایا ہے اور اس عظیم ہستی کو اور تو بہت دور، زمینی اور بنیادی عظمت و احترام عنایت کرنے کے حق میں نہیں ہے۔اس لیے اس مرکزی کردار کو انسان و انسانیت کی علم بردار تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ انصاف و مساوات سے سلوک ادا رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس آفاقی وجود و خلق کو بے شک دوسرے محرکات اور اقدامات سے بھی سرفرازی دستیاب ہو رہی ہے اور ہو سکتی ہے مگر ایک چیز سرمایہ ادب بھی ہے جس کے مرہون منت ایک عورت کے چار سو ان گنت روایات و مشکلات کو ظہور دینا اور ان پر قابو پانا بہت حد تک آسان ہو جاتا ہے۔دراصل ادب کسی بھی فرد کو ان تمام رجحانات، نظریات، عقائد، نتائج، حاصلات اور سفارشات سے فیض یاب کرتا ہے۔جن سے وہ معرفتِ نفس، علم خودی، تعلم تعمیر اور شرقِ انسانیت سے بہرہ ور ہو کر رول ماڈل ثابت ہو سکتا ہے اور سماج میں مثبت تبدیلی لانے اور دوسروں کے دلوں میں گھر کرنے میں صحیح ظفریابی حاصل کر سکتا ہے۔یوں ادب کا مطالعہ کرنا، فطین خیالات سے استفادہ کرنا، اعلیٰ کارکردگی کا حامل ہونا ہر شخص کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے، ادب اور عورت کا رشتہ ایسا ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہوتا ہے

اوران کے پاس اور ساتھ ہونے سے بے حسی، دوری، بے مروتی، اجارہ داری، طوائف الملوکی اور انانیت دم توڑتی ہے اور ربط و سنجوگ، خوشی و خوشحالی، کامرانی و فتح مندی اور انفرادی و اجتماعی سرشاری و سرخروئی ہی دستیاب ہوتی ہے۔اس عمل سے عورت بہت حد تک غم والم، نفرت و کدورت، غارت گری و بربادی اور عجیب و غریب تنہائی و فراری پن سے نجات حاصل کرتی ہے۔

عصر ماضی سے لے کر دور جدید تک ایک مرد، عورت کے مقابلے میں مطلق العنان نظر آتا ہے۔ غلطیاں و کوتاہیاں چاہے کہیں سے بھی ہو اور کسی سے بھی سرزد ہوں، مگر خطاکار و گناہ گار عورت ہی کو ٹھرایا جاتا ہے۔ ہر فرد و رہنما اپنا اُلو سیدھا کرنے، اپنا کام نکالنے، گھر تا سیاست میں نام پیدا کرنے اور اپنی بادشاہت کو شہ دینے کے لیے بہت حد تک عورت کا استعمال کرتا ہے۔ان نام نہاد مردوں اور بناوٹی مکروہ چہروں والے منفی کرداروں کو صرف آج کی فکر ہوتی ہے اور وہ گمراہ کن ہتھکنڈوں اور خود پرستانہ عقیدوں سے صرف عورتوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج کے جدید ترین زمانے میں بھی یہی کھیل جاری ہے اور کوئی بھی سماجی کارکن، اصلاحی ادارہ، تعلیمی منصوبہ، فلاحی لوگ یا کوئی عام و خاص طبقہ پہل کرنے کو عملی طور پر تیار نہیں ہے کہ عورت کو کامل شان و شوکت مہیا ہو سکے۔

تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ بے شک چند گھروں تا مختلف اداروں میں عورتوں کی اچھی خاصی تعداد متفرق اُمور سر انجام دے رہے ہیں مگر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں بے شمار شیطانی نظروں، غیر انسانی ہتھکنڈوں، بے معنی باتوں، مکروہ شخصی ہاتھوں اور لالچی اشاروں وغیرہ سے یہی عورتیں سخت نالاں ہوتی ہیں اور بہت مشکل اور حکمت عملی سے اپنے نام و دامن کو محفوظ بناتی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح قدرتی و پیدائشی طور پر عورت آزاد پیدا ہوئی ہے اور اُس کے حقوق و فرائض صاف لفظوں اور تحریروں میں واضح کیا گیا ہے، تو اسی طرح ہر سماج کے اندر ایک عورت کو قانونی و آئینی لحاظ سے تحفظ فراہم کیا جائے اور جس طرح ہر ذی روح کو بے شمار عام سہولیات اور ان گنت خاص انعامات سے نوازا جاتا ہے تو اسی سماج اور ارد گرد میں موجود ایک عورت کو بھی خاطر خواہ اعزازات اور ٹھوس انسانی معیارات سے مستفید کیا جائے تا کہ ہر جگہ سے افراتفری، نامرادی، پسپائی، تنہائی اور خاص کر امتیازات غیر انسانی رویے ملیا میٹ ہو۔ ہر مقام پر مرد و عورت ایک جسم کی مانند آگے بڑھے، سماج میں فرق و تفریق کے منفی عمل کا قلع قمع ممکن ہو۔ انفرادی و شیطانی سوچ کو شکست ہو اور ہر زمینی گوشہ اور انسانی ذہن احترام آدمیت، مساواتِ انسانیت کے جوہر سے صحیح معنوں میں فیض یاب ہو۔

ج۔ سفارشات:

موضوع ''پاکستان ٹیلی وژن کے طویل دورانیے کے اُردو ڈراموں میں عورتوں کے سماجی مسائل کی عکاسی''پر جس قدر تحقیقی کام کی کوشش کی گئی ہے، تو اس کو ذہن نشین کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

- پہلی بات یہ کہ عورت اور سماجی مسائل کے موضوع کو اسکول، کالج اور جامعات کی سطح پر نصاب کا حصہ بنایا جائے۔
- عورت اور سماجی مسائل کے حوالے سے علاقائی سطح سے لے کر ملکی سطح تک ایک سروے کا انتظام کیا جائے تاکہ حقائق ظاہر ہوں اور بروقت حل کے لیے ٹھوس اقدامات اٹھائے جائیں۔
- ملکی و قومی اخبار و رسائل میں عورت کو درپیش مسائل کے بارے میں خصوصی گوشے مختص کیے جائیں تاکہ عوام اور اشرافیہ صحیح معنوں میں اس موضوع سے آگاہ ہو جائیں اور عملی اقدامات کے لیے لائحہ عمل استوار ہو۔
- تصنیفی اور تحقیقی سطح پر عورت اور سماجی مسائل کے بارے میں سچ و حق کے نقوش واضح کیے جائیں تاکہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ کرداروں کی توجہ حاصل ہو اور اس سلسلے میں آگے کارِ جہان زور پکڑ سکے۔
- گورنمنٹ، غیر حکومتی، سیاسی اور مذہبی تنظیمیں فوری طور پر اس موضوع کے ضمن میں مختلف انٹرویو، سیمینارز، ورکشاپس اور پروگرامز کا انعقاد یقینی بنائیں اور ایک عورت کو اپنے جائز حقوق دلانے اور بے جا مسائل سے نجات دلانے میں اپنا اپنا کردار ادا کریں۔
- صحافتی برادری اس بارے میں خصوصی شماروں کی اشاعت ممکن بنائیں تاکہ عام لوگ اس حوالے سے سوچ سکیں اور اس کے حل کے لیے مناسب تجاویز کو پیش کر سکیں۔
- جامعات کے ہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر اس قدر بڑے اور بنیادی موضوع پر مزید تحقیقی کام کی اجازت دیں۔ یاد رہے کہ مذکورہ موضوع پر مزید تحقیقی کام کی گنجائش واقعی ممکن ہے۔

کتابیات

(الف)۔ بنیادی ماخذ:۔

انور مقصود، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما ''امّاں''، www.youtube.com، ۱۸ جولائی، ۲۰۱۸ء، 9:00pm

انور مقصود، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما ''دور جنوں''، www.youtube.com، ۱۶ جون، ۲۰۲۰ء، 1:00pm

انور مقصود، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما '' ایک تھی صفیہ''، www.youtube.com، ۱۴ اکتوبر، ۲۰۲۰ء، 8:00pm

انور مقصود، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما '' ہالف پلیٹ''، www.youtube.com، ۱۶ فروری، ۲۰۲۰ء، 10:00pm

اشفاق احمد، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، سائیں اور سائیکا ٹرسٹ، www.youtube.com، ۱۶ اکتوبر، ۲۰۱۹ء، 10:00pm

امجد اسلام امجد، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، بازدید، www.youtube.com، ۱۸ اپریل، ۲۰۱۸ء، 7:00pm

اصغر ندیم سید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، گل پھینکے ہیں، www.youtube.com، ۲۴ اکتوبر ۲۰۲۰ء، 7:00pm

اصغر ندیم سید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، ملکہ عالم، www.youtube.com، ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۰ء، 9:00pm

بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، امر بیل، www.youtube.com، ۲ جون، ۲۰۱۸ء، 3:00pm

بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، کلو، www.youtube.com، ۱۲ اکتوبر، ۲۰۱۹ء، 2:45pm

بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما '' آنکھ مچھولی''، www.youtube.com، ۱۵ جنوری، ۲۰۱۹ء، 9:00pm

بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما '' سرخ بتی''، www.youtube.com، ۱۸ اپریل، ۲۰۱۹ء، 9:00pm

بانو قدسیہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما '' چٹان پر گھونسلہ''، www.youtube.com، ۱۸ اکتوبر، ۲۰۱۷ء، 2:35pm

بشریٰ انصاری، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، آسمانی جوڑا، www.youtube.com، ۸ جولائی، ۲۰۲۰ء، 4:30pm

بشریٰ انصاری، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، انوکھا لاڈلا، www.youtube.com، ۸ نومبر، ۲۰۲۰ء، 4:30pm

حسینہ معین، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، دھندلے راستے، www.youtube.com، ۱۸ اکتوبر، ۲۰۱۷ء، 5:40pm

حسینہ معین، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، ساگر کا آنسو، www.youtube.com، ۱۲ اپریل، ۲۰۲۰ء، 11:30am

خدیجہ مستور، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، خرمن، www.youtube.com، ۱۲ اگست، ۲۰۱۹ء، 10:00pm

رعنا شیخ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، کچے پکے رنگ، www.youtube.com، ۸ جولائی، ۲۰۲۰ء، 4:30pm

ذکیہ اکبر، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، مقدر کا چقندر، www.youtube.com، ۳۰ اکتوبر، ۲۰۲۰ء، 4:35pm

سلیم چشتی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، فاؤل پلے، www.youtube.com، ۱۴ مئی، ۲۰۲۰ء، 9:30pm

شاہد کاظمی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، بازگشت، www.youtube.com، ۱۴ مئی، ۲۰۲۰ء، 9:30pm

ظفر معراج، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، کچا گھڑا، www.youtube.com، ۱۴ جولائی، ۲۰۱۹ء، 9:00pm

عذرا بابر پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، شام سے پہلے، www.youtube.com، ۳۰ ستمبر، ۲۰۱۷ء، 4:00pm

عمران اسلم، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، روزی، www.youtube.com، ۲۰ مارچ، ۲۰۱۷ء، 1:44pm

مستنصر حسین تارڑ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، خواب کم خواب www.youtube.com، ۱۶ جون، ۲۰۲۰ء، 10:00pm

مستنصر حسین تارڑ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، آلاؤ، www.youtube.com،، ۲ جون، ۲۰۱۸ء، 3:00pm

منو بھائی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، دروازہ، www.youtube.com،، ۳۰ ستمبر، ۲۰۱۷ء، 3:00pm

منو بھائی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، میری سادگی دیکھ، www.youtube.com،، ۳۰ ستمبر، ۲۰۱۷ء، 2:00pm

مرزا اطہر بیگ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما کیٹ واک، www.youtube.com، ۲۰ نومبر، ۲۰۲۰ء، 4:30pm

مختیار احمد، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، حقدار، www.youtube.com، ۲ اپریل، ۲۰۲۰ء، 9:00pm

محمد احمد، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، پیلا جوڑا، www.youtube.com،، ۱۸ اپریل ۲۰۱۹ء، 2:24pm

نصرت مفتی، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، باجی ڈکشت، www.youtube.com،،،، ۳۰ ستمبر، ۲۰۱۷ء، 3:00pm

نورالھدیٰ شاہ، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، پنجرے کے پرندے، www.youtube.com، ۱۴ مئی، ۲۰۲۰ء، 9:30pm

یونس جاوید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، کانچ کا پل، www.youtube.com، ۲۰ اگست،، ۲۰۱۷ء، 3:00pm

یونس جاوید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، دھوپ دیوار، www.youtube.com، ۲۰، ۲۰۱۷ء، 5:00pm

یونس جاوید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، سٹیٹس، www.youtube.com،، ۱۶ فروری، ۲۰۲۰ء، 10:00pm

یونس جاوید، پی ٹی وی طویل دورانیے کا ڈراما، تکمیل، www.youtube.com،، ۱۶ نومبر،، ۲۰۱۹ء، 10:00pm

(ب)۔ ثانوی ماخذ:

آغا ناصر، آغا ناصر کے ڈرامے، القادر پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۸۸ء

آفاق احمد، ٹی وی ڈرامے، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

اسلم قریشی، ڈاکٹر، برصغیر کا ڈرامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۲ء

اسلم قریشی، ڈاکٹر، اُردو ڈرامے میں نئے رجحانات، مجلس ترقی ادب، اُردو، ۱۹۸۶ء

اسلم قریشی، ڈاکٹر، برصغیر کا تاریخی ڈرامہ، تاریخ، افکار اور انتقاد، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

اسلم قریشی، ڈاکٹر، ڈرامے کا تاریخی اور تنقیدی پس منظر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء

اشفاق احمد، دیباچہ، رفیع میر کے آٹھ ڈرامے، آکسفورڈ یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۰۵ء

احمد بختیار اشرف، ڈاکٹر، اُردو سٹیج ڈرامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۶۷ء

انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پنجابی ڈرامہ، ادارہ ثقافت، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱

احمد سہیل، جدید تھیٹر، ادارہ ثقافت، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء

احمد خان، سر، سید، خطبات سر سید، (حصّہ دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور،

امجد اسلام امجد، اپنے لوگ، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

افتخار شیر وانی، عورتوں کی محکومیت، فیروز سنز لاہور، بار اوّل، ۱۹۹۳ء،

ادریس آزاد، عورت، ابلیس اور خدا، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲

بانو قدسیہ فٹ پاتھ کی گھاس، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

بانو قدسیہ، حوّا کے نام، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء،

جعفر احمد سیّد، پاکستان میں قومی استبداد کی تاریخی بنیادیں، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴

جان سٹورٹ مل، عورتوں کی محکومیت، (مترجم) افتخار شیر وانی، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۹

حسن اختر، ڈاکٹر، ملک، اُردو ڈرامہ کی مختصر تاریخ، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء

خالدہ حسین، بے سر کی عورت، (مشمولہ) خاموشی کی آواز، مدیران فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر کراچی، ۲۰۰۳ء

خلیق انجم، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اُردو تھیٹر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

خالد علوی، ڈاکٹر، عورت کی معاشرتی حیثیت ایک جائزہ، ویمن انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ہیومینیٹیز اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
رسول حمزہ وقوف، میرا داغستان، لاہور، آواز فاؤنڈیشن، برائے تعلیم،
رشید احمد گوریچہ، اُردو ڈرامے کی تاریخ واجد علی سے مرزا ادیب تک، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۲ء
رشید ملک، مضمون، ''انڈالوجی''۔ ''آریا اور آریائیت'' فنون لاہور، اپریل۔جون، ۱۹۹۱ء، شمارہ ۳۲،
رشیدہ پٹیل، پاکستانی عورت کی سماجی و قانونی حیثیت، کل پاکستان انجمن، خواتین، (اپوا) کراچی۔ ۱۹۸۱ء،
زاہد محمود، ڈاکٹر، گھریلو تشدد۔ وجوہات، اثرات اور انسداد، نگارشات لاہور، ۲۰۰۶ء،
زاہدہ حنا، عورت زندگی اور زندان، دی سمیع سنز پرنٹرز، کراچی، ۲۰۰۴ء
ساجد علی، مقدمہ، اسلام جنسی تفریق اور اسلام، لیلیٰ احمد، مشعل لاہور، ۱۹۹۵ء
سلمان بھٹی، محمد، پاکستان ٹیلی وژن ڈراموں میں سماجی حقیقتیں، س۔ن
سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، طبع ستائیس، ۱۹۸۵ء،
سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء،
صفدر میر، مشمولہ، کانچ کا پُل از یونس جاوید، یونیورسل بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۷ء
ظہور الدین، جدید اُردو ڈرامہ، نئی دہلی، ادارہ فکر جدید، ۱۹۸۷ء
عبدالرحمٰن خان، ایم، عورت نسائیت کے آئینہ میں، شیخ اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۷۴ء
عبدالعلیم ٹامی، ڈاکٹر، اُردو تھیٹر، جلد اول، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۶۲ء
غلام اکبر ملک، عورت کا مقدمہ (اسلام کی عدالت میں)، لاہور، جنگ، پبلشرز، ۱۹۹۱ء،
فریدہ وجدی آفندی، مسلمان عورت، (مترجم) ابوالکلام آزاد، لاہور، داتا پبلشرز، طبع اوّل، ۱۹۸۷ء
فردوس حیدر، تاحال، دی ریسرچ فورم کراچی، ۲۰۰۷ء،
کشور ناہید، عورت خواب و خاک کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن
کشور ناہید، (مرتب) عورت زبان خلق سے زبان حال تک، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
گوپی چند نارنگ، اُردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
لیلیٰ احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، (مترجم) خلیل احمد، شغل، ۱۹۹۵ء،
مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاوس، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۶ء،
منیر احمد، پاکستان ٹیلی وژن کے پچیس سال، اسلام آباد، میڈیا ہوم، ۱۹۹۰

ممتاز شیریں، معیار، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۲۳ء
محمد حسین رضوی، ڈاکٹر، ڈرامہ پر ایک دقیقی نظر، پیش رو پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۴ء
مولانا سید جلال الدین انصر عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، لاہور پبلی کیشنز، طبع ہفتم، ۱۹۸۳ء
مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، (حصّہ ا) کراچی، ادارۃ المعارف، ۱۹۸۸ء
مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶،
مہر عبدالحق، ڈاکٹر، ہندو ضمیات، بیکن بکس ملتان، اشاعت اوّل، ۱۹۹۳ء،
نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء
نسرین پرویز، ڈاکٹر، پاکستان کا ٹیلی وژن ڈرامہ اور سماجی تبدیلیاں، لائنز کمیونیکیشنز، کراچی، بار اوّل، ۱۹۹۹ء
نسیم انجم بھٹی، چند سوال، (مشمولہ) ادب کی نسائی تشکیل، س۔ن
وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۷،
وقار عظیم، سیّد، اُردو ڈرامہ، فن اور منزلیں، مرتب، سیّد معین الرحمٰن، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
وقار عظیم، سیّد، فنِ افسانہ نگاری، اُردو مرکز، لاہور ۱۹۶۱ء
وقار عظیم، سیّد، اُردو ڈرامہ، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۹۲ء
وقار عظیم، سیّد، اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
وقار عظیم، سیّد، اُردو ڈرامہ تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
یونس جاوید، کانچ کا پُل، لاہور یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء

(ج) لغات:

۱۔ جمیل جالبی مؤلف قومی انگریزی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

۲۔ فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، س۔ن

۳۔ نورالحسن، مولوی، مؤلف نور اللغات، جلد دوم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

(د) غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے:

۱۔ احمد بخش، ملک، یونس جاوید اور اصغر ندیم سیّد کے اُردو ٹی وی ڈراموں کا تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اُردو، (ملتان بہاءالدین زکریا یونیورسٹی لائبریری، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء)

۲۔ محمد طاہر، ٹیلی وژن کے اُردو ڈرامے، مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء

۳۔ خالدہ خان، انور مقصود فن اور شخصیت، مقالہ برائے ایم اے اُردو (مملوکہ کراچی یونیورسٹی لائبریری، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء)

۴۔ نائلہ جاوید، بانو قدسیہ کی ڈرامہ نگاری، مقالہ برائے ایم اے اُردو، (مملوکہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پنجاپ یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء)

(ح) سکرپٹس:

۱۔ انور مقصود، تلاش، کراچی، مملوکہ، سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی،، ۱۹۹۶ء

۲۔ انور مقصود، ہاف پلیٹ (کراچی، مملوکہ، سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی، کراچی مرکز، ۱۹۹۳ء)

۳۔ عمران اسلم، روزی (کراچی، مملوکہ سکرپٹ سیکشن، پی ٹی وی کراچی مرکز، ۱۹۹۲ء

(ط) رپورٹس:

۱۔ ریڈرز رپورٹ، بازگشت (پی ٹی وی سکرپٹ سیکشن، لاہور مرکز، ۱۹۹۶ء)

۲۔ ریڈرز رپورٹ، کیٹ واک، (پی ٹی وی سکرپٹ سیکشن، لاہور مرکز، ۱۹۹۸ء)